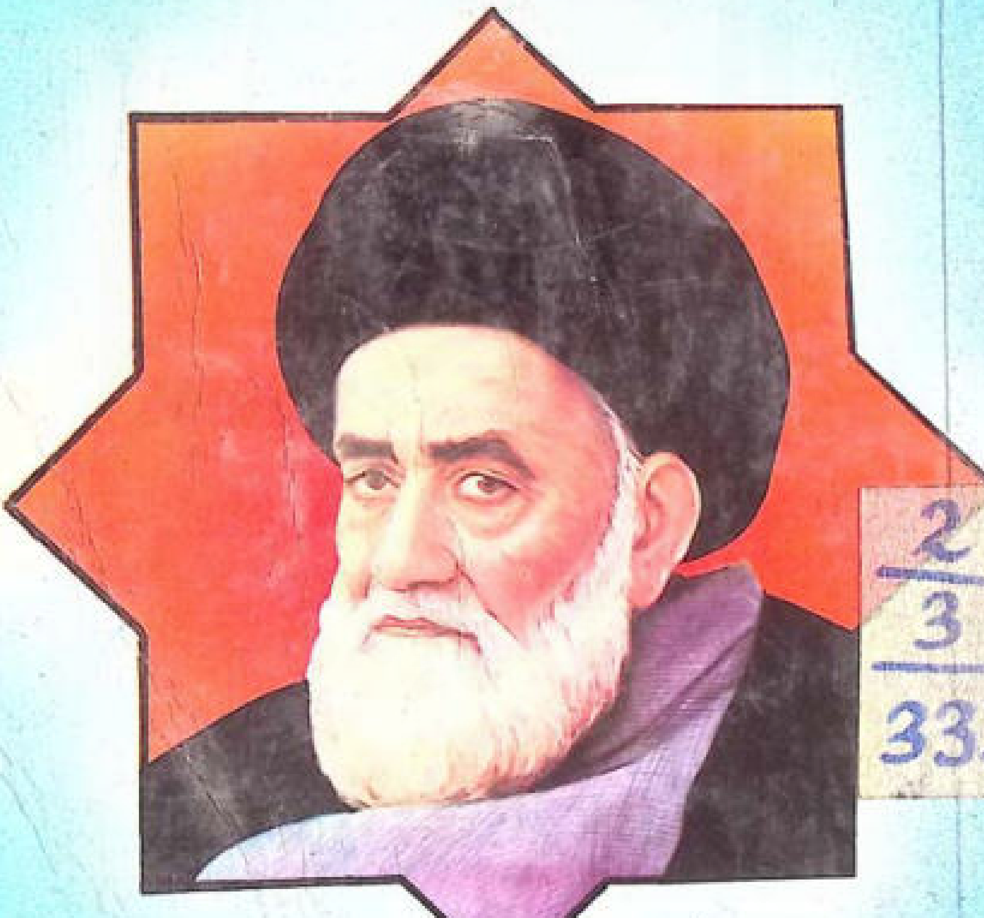
عظمتِ حسینؑ

مقالاتِ سیّد العلماء

علّامہ سیّد علی نقی النقوی



عظمتِ حسینؑ

مقالاتِ سیّد العلماء

علّامہ سیّد علی نقی النقوی

مرتبہ:

محمّد وصی خان

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام باڑہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰

فون ۲۴۳۱۵۷۷



قال نبی الکریمؐ
حسین منی علیہ السلام
و
انا من الحسین علیہ السلام
ایم اے
ڈیرہ غازیخان

نقنؔ صاحب قبلہ



آیت اللہ سرکار سید العلما سید علی نقی النقوی مجتہد العصر

فہرست مضامین

بیان تسکین زینبؑ حصہ اول و دوم سلسلہ وار مجالس کا بے مثال مجموعہ ایک نایاب تحفہ ہے۔ (ناشر)

اِنتساب عقیدت!

دل کی تمام گہرائیوں، دماغ کی تمام وسعتوں، رُوح کی تمام بالیدگیوں اور عقیدت و شوق کی تمام ایمانی کیفیتوں کے ساتھ یہ ہدیۂ ولا اور نذرانۂ عقیدت امام آخر صاحب العصر و زمان وارث رسُولؐ کی خدمت بابرکت میں پیش کرتا ہوں اور انھیں جنابؑ کے نام نامی و اسم گرامی سے معنون کر کے مستدعی ہوں کہ اس ہدیہ حقیر فقیر عاصی پُر معاصی کو شرف قبولیت بخشا جائے تاکہ قبولِ عام ہو اور مجھ گنہگار کی آخرت کا توشہ ہو کر مغفرت کے کام آئے۔ آخر میں اپنے مولا کی بارگاہ سے اپنے والد بزرگوار جناب محمد عسکری خاں مرحوم کی مغفرت کے لئے دست بہ دعا ہوں۔ (محمد وصی خاں)

نام کتاب ——— عظمت حسینؑ یعنی مقالات سید العلماءؒ
ناشر ——— رحمت اللہ بک ایجنسی بمبئی بازار کراچی
قیمت کتاب ——— روپئے ● تعداد طباعت ——— ۱۱۰۰ کتاب
مرتبہ محمد وصی خانؔ
سنہ طباعت ——— ستمبر ۱۹۸۰ء ● طباعت ——— سندھ آفسٹ پریس
کتابت :- سید محمد یوسف رضوی

کتاب ملنے کا پتہ

(۱) محفل حیدری ناظم آباد نمبر ۴ کراچی
(۲) احمد بکڈپو رضویہ سوسائٹی ″
(۳) محفوظ بک ڈپو امام بارگاہ مارٹن روڈ ″

آیت اللہ صدر المجتہدین سرکار سید العلماء
سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے حالاتِ زندگی!

سرکار صدر العلماء علامہ سید ذکی الاجتہادی ارشتی عادل فیضی روحانی کے قلم سے!

ولادت - ۲۶ رجب سنہ ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء

نسب - علی نقی ابن ممتاز العلما مولانا سید ابو الحسن ابن حجۃ الاسلام مولانا سید محمد ابراہیم فردوس مکان، ابن ممتاز العلماء مولانا سید محمد تقی جنت مآب ابن سید العلماء مولانا سید حسین علیین مکاں ابن غفران مآب، مولانا سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی۔

ساڑھے تین سال کے تھے سفر عراق میں اپنے والد کے ہمراہ ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں زیر قبہ حضرت امیر المومنین بسم اللہ ہوئی - اور اس کے بعد ہندوستان واپس آئے تو لکھنؤ اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں جسکی تفصیل یہ ہے -

سند الافاضل - صدر الافاضل	جامعۂ سلطانیہ
فاضل - ممتاز الافاضل	ناظمیہ کالج
فاضل ادب	لکھنؤ یونیورسٹی
عالم	الہ آباد یونیورسٹی

دوبارہ سفر عراق سنہ ۱۹۲۷ء (سنہ ۱۳۴۵ھ)

اس دور کے جیّد علماء سے استفادہ حاصل کیا - اور درس خارج کے سلسلے میں سرکار آقا میرزا حسین نائینی - سرکار آقا سید ابو الحسن اصفہانی اور سرکار آقا ضیاء عراقی - اور درس سطحی کے لئے آقا میرزا ابو الحسن مشکینی اور آقا سید ابو القاسم قبلہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔

سنہ ۱۹۳۲ء (سنہ ۱۳۵۰ھ) تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہی سے جاری

تھا عراق سے واپسی پر مواعظ حسنہ سے اہل ہندوستان کے قلوب کو حرارت ایمانی سے گرماتے رہے۔

۱۳۵۱ھ میں امامیہ مشن لکھنؤ کی بنیاد ڈالی۔

۱۹۳۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور ۱۹۵۹ء تک اپنے علم و ادب کی روشنی سے طالبان علم و ادب کے دل و دماغ کو منور کرتے رہے۔ نامور شاگردوں میں مولانا لبشیر الملت صاحب، مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب کامونپوری، جناب حیات اللہ انصاری (مدیر قومی آواز لکھنؤ) بہت مشہور ہیں۔

۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (شعبۂ دینیات شیعہ) سے وابستہ ہوئے۔ اور ۱۹۷۲ء تک اپنی خدمات سے علی گڑھ یونیورسٹی کو سرفراز فرماتے رہے۔

۱۳۵۹ھ میں آپ نے ادارہ سیزدہ سالہ یادگار حسینی لکھنؤ کی بنیاد رکھی۔

اب علامہ موصوف نے علیگڑھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے اور اپنے علم سے شمع علم کے پروانوں کی خدمت میں منہمک ہیں۔

آپ کی تصانیف بے شمار ہیں۔ آپنے اپنی تحقیق اور زور قلم سے تعلیمات اہلبیت کی تشہیر بے مثال طور پر فرمائی ہے۔ اور آپکی بے پناہ مقبولیت بلاشبہ لازوال محبت اہلبیت کا نتیجہ ہے۔ پاکستان میں ان کے شاگردوں میں سب سے اہم شخصیت مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ ہیں۔

سرکار سیّد العلماء کراچی میں

تقریباً ۱۴ سال کے بعد آیت اللہ سرکار سیّد العلماء علامہ سید علی نقی صاحب مدظلہ العالی عرف نقن صاحب قبلہ دوبارہ پاکستان تشریف لائے۔ سنہ ۱۴۰۱ھ کا پہلا عشرہ بزد محفل خراسان علی متقی جعفری کے گھر میں پڑھا۔ اس کے بعد عشرۂ ثانی مسجد و امام بارگاہ آل عبا فیڈرل بی ایریا میں پڑھا۔ اور جب شہدائے کربلا کے ماتم داروں اور اہلبیتِ اطہار کے شیدائیوں کی طرف سے استدعا کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر کراچی کی ہر مشہور امام بارگاہ اور تقریباً ہر شیعہ مسجد میں انتہائی یادگار مجلسیں پڑھیں۔

علامہ موصوف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پابندی کے ساتھ ان کی مجلسوں میں شریک ہونے والا بھی ان کی تقریر سے سیر نہیں ہوتا بلکہ خود کو تشنۂ تقریر ہی محسوس کرتا ہے یہی اسلوب بیان اور فصاحت و بلاغت تقریر کی کامیابی ہے اور یہ وہ دولت ہے جس سے علامہ موصوف کو قدرت نے مالا مال کر دیا ہے۔

علامہ موصوف ان چند بلند شخصیتوں میں اس وقت سرِ فہرست ہیں جن کے بیانِ دل افروز سے کچھ حصۂ تقریر دل و دماغ میں بیٹھ جاتا ہے اور سننے والا معلومات کا خزانہ دامن میں بھر کر اٹھتا ہے۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی تعلیمات پر کاربند رہنے کا عہد و پیمان نئے انداز سے تجدید کی منزل طے کرتا ہے۔ ایمان کی پژمردگی تازگی سے بدل جاتی ہے۔ اور بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ نقن صاحب قبلہ آج کی دنیا میں یقیناً "عالمِ باعمل" کی صف میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

علامہ نقن صاحب کی مجلسوں میں سُنّی عقیدے کے لوگ بڑی کثرت سے شریک ہوتے اور بڑی عقیدت سے مجلس کے اختتام تک پوری توجہ سے تقریر کا ایک ایک لفظ سنتے اور اپنی کشادہ دلی کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے کہتے

کہ عالم ہو تو ایسا۔ اِکہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کو اپنا اسلامی فریضہ سمجھے ۔ اور اپنی تنگ نظری کی خاطر اپنے سخت الفاظوں سے دو بھائیوں کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع بنانے سے گریز کرے۔

میں نے علامہ نقی صاحب قبلہ کی مجلس کے اختتام پہ ایک صاف گو سُنّی دوست کو یہ بھی کہتے ہوئے سُنا کہ ــ "یہ شیعہ عالم بلا مبالغہ ہمارے نزدیک شیعہ سنی اتحاد کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے"۔ کراچی میں سکونت پذیر علماء کو اگر اتحاد بین المسلمین سے محبت ہے تو انھیں انتہائی صفائی قلب کے ساتھ آیت اللہ سرکار علامہ سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے اسلوب بیان کو اپنا کر وقت کی سب سے اہم ضرورت "شیعہ سُنّی اتحاد" کو زیادہ سے زیادہ استحکام بخشنا چاہیئے ــ اور یہ ان کا اسلامی فریضہ ہے۔

علامہ موصوف نے دوران قیام، کراچی کے ایک صاف ستھرے علاقے گلشن اقبال میں ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد ناظم آباد فردوس کالونی کے عقب حسن کالونی میں امام بارگاہ اُم البنینؑ کی رسم تنصیب "سنگ تعمیر" معرفت جناب آغا جواد حسین صاحب قبلہ بتاریخ ۲۷ صفر ۱۴۰۰ھ ادا فرمایا مذکورہ امام بارگاہ اُم البنینؑ کے بانی جناب سید علی حسین نقوی ہیں انھیں اس تقریب میں سید العلماء کو قریب سے نہ صرف دیکھنے بلکہ گفتگو بھی کرنے کا موقع ملا۔ مجھے بھی اس موقع پر دیگر مواقع سے کچھ زیادہ گفتگو کے لئے وقت ملا تو میں نے سید العلما سے عرض کیا کہ آپ کے اہم تبلیغی مضامین سے ہمارا عقیدہ اور ہمارا قومی وقار وابستہ ہے جو پاکستان کے رسالوں اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں میں نے سب کو جمع کیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تمام مضامین

کو یکجا کرکے کتابی شکل میں شایع کردوں کیونکہ ان مضامین کی زیادہ سے زیادہ تشہیر سے قومی امنگوں میں قابل قدر حد تک اضافہ ہوگا۔ اور واقعات کربلا، نیز امام حسینؑ علیہ السلام اور ان کی عظیم قربانی کے اثرات کی سچی داستان کے مطالعہ سے نوجوانوں کے دلوں میں دینی خدمات انجام دینے کی ایسی تڑپ پیدا ہوگی جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس وقت بہت ضروری ہے تو انکا چہرہ دفور مسرت سے تمتما اٹھا۔ فرمایا تم نے خوب بہتر طور پر حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اور میری طرف سے پوری پوری اجازت ہے۔

اور — اب — یہ کتاب جو آیت اللہ سرکار سید العلماء السید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے انتہائی اہم مقالات پر مشتمل ہے بغرض افادہ مومنین و ذاکرین پیش خدمت ہے۔

● کاش! علامہ سید العلماء کے مقالات پر مشتمل کتاب "عظمت حسین"، کے مطالعہ سے قومی حمیت وغیرت کی مردہ رگوں میں جوش عمل کا جنون ایکبار پھر پیدا ہو جائے۔ اور ہم شہدائے کربلا کے پیغام حیات پہ مرمٹنے کو اپنا مقصود زندگی تصور کرلیں۔ آمین!

جناب سید عنور حسین نقوی نے سرکار سید العلماء کو امام بارگاہ ام البنینؑ کی رسم تنصیب سنگ کے اختتام پر ایک عبا اور عمامہ بطور نذرانہ تشکر پیش کیا جسے علامہ نے خندہ پیشانی سے قبول فرماتے ہوئے اپنی دعاؤں سے نوازا۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں آیت اللہ سرکار سید العلماء کی تقاریر بصیرت افروز سے بار بار مستفید ہونے کے لئے علامہ موصوف کو زیادہ سے زیادہ طویل زندگی عطا فرمائے — آمین!

محمد وصی خاں
صدر مرکزی تنظیم ع۔ا (رجسٹرڈ) کراچی



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

پیغام بنام محمد وصی خاں

صدر مرکزی تنظیم عزا رجسٹرڈ کراچی

بلعالی خدمت، والا مرتبت، کیواں رفعت، برجیس حشمت، کوکب تابندہ بخت فصاحت۔ ماہ درخشندہ جبین بلاغت، نیر اعظم سپہر خطابت تاجدار ذی وقار اقلیم طلاقت، سلطان المتکلمین، صدر المجتہدین العمادی والاعمادی سرکار سید العلماء سید علی نقی صانہ اللہ البادی الہادی نے مقالات سید العلماء کی اشاعت کے سلسلے میں مرتب مقالات جناب محمد وصی خاں کو بذریعہ خط علیگڑھ سے ایک پیغام ارسال فرمایا ہے۔

مجتہد العصر سرکار علامہ نقن صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے لکھا ہے کہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

۱۶ر شعبان ۱۴۰۰ھ

سلام مسنون!

آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا ہے وہ موزوں و مناسب ہی ہوگا اور اس سلسلے میں آپ نے خدمت دین و ملت کی نیت سے جو کوشش فرمائی ہے وہ قابل قدر ہے۔ خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے لئے اصل چیز عادل حکیم کا انتخاب ہے اگر کوئی ایک جملہ کسی ایک مضمون کا بھی اس کے معیار رضا پر پورا اترے تو وہ میرے لئے ذخیرۂ آخرت بن سکتا ہے۔

واللہ ولی التوفیق
علی نقی النقوی

● اصلی تحریر متذکرہ بالا کا عکس صفحہ ۱۳ پر ملاحظہ فرمائیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۶ر شعبان ۱۴۱۰ھ

مکرمی جناب محمد موصی خاں صاحب صدر مرکزی تنظیم عزا

سلام مسنون۔ آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا ہے

وہ موزوں و مناسب ہی ہوگا اور اس سلسلہ میں آپ نے

خدمت دین و ملت کی حیثیت سے جو کوشش فرمائی ہے،

وہ قابل قدر ہے،

خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے

پھر اصل چیز عامل حکم کا انتخاب ہے۔ اگر

کوئی ایک جملہ کسی ایک مضمون کا بھی اس کے معیار

رسالہ پر پورا اترے تو وہ پڑھنے والے ذخیرۂ آخرت ہو سکتا ہے

واللہ ولی التوفیق

علی نقی النقوی

نوٹ: دو سطریں جو آپ نے آخر میں لکھی ہیں۔

[illegible]

وہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے آپ ہی کے قلم کی لکھی ہیں۔



سیدالعلماء عالمِ شباب میں



کتاب کے بارے میں

زیرِ نظر کتاب "عظمتِ حسین ؑ" حجت الاسلام، سید العلماء علامہ سید علی نقی عرف نقن صاحب قبلہ النقوی دام ظلہ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے آپ کی شخصیت اعلیٰ صفات محتاجِ تعارف نہیں۔ دینِ حقّہ اور عقیدۂ اہلبیت اطہار ؑ کے سلسلے میں آپ کی دینی و تبلیغی نگارشاتِ بے مثال امامیہ مشن لکھنؤ اور لاہور کے ذریعہ نشر و اشاعت کی منزلیں طے کر کے منظرِ عام پر آتی ہیں اور شمعِ رسالت کے پروانوں اور تعلیماتِ امامت پر مر مٹنے والوں سے جی کھول کر خراجِ تحسین و آفرین حاصل کرتی ہیں۔ ہم نے انتہائی کاوش اور عرق ریزی سے ان بکھرے ہوئے جواہر ریزوں کو جو بلا مبالغہ اہلِ علم کے لئے بیش قیمت ہیں زیرِ نظر کتاب "عظمتِ حسین" میں یکجا کر دیا ہے تاکہ مومنین اور ذاکرینِ اہلبیت اطہار استفادہ حاصل کریں اور میں اپنی بے بضاعتی و کم مائیگی کے باوجود کسی حد تک اجرِ رسالت کی ادائیگی کے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔

● اس کتاب میں شامل مضامین میں علامہ موصوف نے "اسلامِ حقیقی" اور "سچے اسلام" کی تبلیغ کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بہت سے اہم حقائق پر سے دروغ گوئی اور مبالغہ آمیزی کی مکروہ چادروں کو کھینچ کر ان واقعات اور عوامل کی نشاندہی انتہائی واضح اور مختصر انداز میں فرمائی ہے جس سے صاف طور پر ثابت ہے کہ اسلام کی صحیح شکل اور اس کے سچے عقیدے پر گامزن رہنے کے لئے ضروری و لازم ہے کہ تعلیماتِ آلِ محمدؐ یعنی اہلبیت اطہار کے عقائد کی بھرپور پیروی ہی "مومن" کا مقصودِ زندگی ہونا چاہیئے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہم سب کو "سچے اسلام" کو پہچاننے اور

حقیقی اسلامی اصولوں کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

● زیر نظر کتاب سرکار علی نقی قبلہ کی مخصوص طرز نگارش کا ایک ایسا آبدار آئینہ ہے جس میں دشمنان اہلبیتؑ — اور یزیدیت کے پرستاروں کے (کفر و الحاد کی گندگی و غلاظت میں لت پت) کردار کا مکروہ چہرہ — اور آل محمدؐ کی حق پرستی کی سچی تصویر انتہائی نمایاں طور پر آپ کے مشاہدے میں اس انداز سے آئیگی کہ آپ بیساختہ پکار اٹھیں گے ؎

شاہ ہست حسینؑ ، بادشاہ ہست حسینؑ
دیں ہست حسینؑ ۔ دیں پناہ ہست حسینؑ
سر داد نہ داد ، دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لاالٰہ ہست حسینؑ

● حجت الاسلام حضرت علامہ سرکار السید علی نقی النقوی مدظلہ العالی کی بلاغت۔ دل میں چبھ جانے والی عام فہم مثالیں۔ روزمرہ کی زبان کا لطف، اردو زبان کا لوچ اور چاشنی کا تذکرہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ سورج کو چراغ دکھانا کیونکہ ہم اس دور میں موصوف نقن صاحب کو ایک عظیم سرپرست اردو کہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا کیونکہ لکھنؤ اگر گہوارہ اردو ہے تو ابن گہوارہ اردو کی عظمت و وقار کو بحارت کے موجودہ اردو دشمن دور میں اس حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہے کہ — اس کے لئے باعث صد افتخار علامہ موصوف کی ہی شخصیت ہے جو ان کے ہی علم دینی ” نے عظمت اہلبیت اطہار“ کی روشنی سے دشمنان اہلبیتؑ کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی ہے۔ بلاشبہ سرکار علی نقی مدظلہ العالی کی ذات گرامی ہماری قوم کے لئے سرمایہ صد افتخار ہے مرجع تقلید ہے میری دعا ہے بہ واسطہ محمدؐ و آل محمدؐ کہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رہے۔ آمین!

خادم اہلبیتؑ۔ محمد وصی خاں۔ صدر انجمن ناصر العزا رجسٹرڈ
صدر مرکزی تنظیم ۱۰۶ رجسٹرڈ

باسمہ سبحانہ

تقدیم!

اُستادِ محترم محققِ عصر عالی مرتبت پروفیسر علی حسنین شیفتہ ایم اے تاج الافاضل

سید الشہداء امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہِ حق میں عظیم انسانی قربانی، "وفدیناہ بذبحٍ عظیم" کی عملی و واقعی تفسیر ہے آپ کی شہادتِ عظمیٰ کو جس حیثیت سے بھی دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک بے مثال ثابت ہوتی ہے۔ اللہ کی راہ میں پیش کی جانے والی قربانیوں کو عقلی اعتبار سے چار معیاروں پر پرکھا جا سکتا ہے۔ پہلا معیار یہ کہ جس نے قربانی دی وہ خود کتنا بلند و باعظمت بندۂ پروردگار تھا۔ دوسرا معیار یہ کہ جس مقصد کے لئے قربانی دی وہ کتنا عظیم تھا۔ تیسرا معیار یہ کہ قربانی کی راہ میں کتنے مصائب اور کتنی مظلومیت سے گزرنا پڑا۔ اور چوتھا معیار یہ کہ جس مقصد کے لئے قربانی دی گئی اُس میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی۔

پس سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ کو اگر پہلے معیار سے دیکھنا چاہیں تو معلوم ہوگا کہ آپ اپنے جدّ و پدر اور مادر و برادر کے بعد اسلامی نقطۂ نظر سے ساری کائنات کے افضل ترین بندۂ پروردگار تھے۔ کیونکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ بات متفقہ طور پر تسلیم شدہ ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جملہ مخلوقاتِ خدا میں افضل ترین مخلوق ہیں۔ اور آدم و بنی آدم کو جو کچھ شرف حاصل ہوا وہ آنحضرتؐ ہی کے طفیل اور اُن ہی کے واسطے سے ملا۔ اس لئے کہ قرآن مجید کی تصریح

کے مطابق جناب رسالت مآب ہی رحمۃ العالمین بھی ہیں اور جملہ عالمین کو عذاب الٰہی سے ڈرانے والے بھی ہیں اس طرح اللہ نے جملہ عالمین پر آپؐ کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے اور جملہ عالمین پر آپؐ کو تصرف و اقتدار عطا فرمایا ہے جب آنحضرتؐ کی یہ شان معلوم ہو گئی تو قرآن مجید کی ایک دوسری آیت محکم یعنی آیت مباہلہ کی تلاوت کیجئے تو امام حسین علیہ السلام کے اُس عظیم الشان مقام کا علم حاصل ہوگا جو اللہ نے اُن کے جد و پدر اور مادر و برادر کے علاوہ عالمین میں کسی کو بھی عطا نہیں فرمایا واضح رہے کہ آیت مباہلہ یعنی فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ " اُن آیات محکمہ میں سے ہے جس کی تفسیر و تاویل میں جملہ مسلمانوں کی تسلیم شدہ کتب حدیث و تفسیر وغیرہ کے اعتبار سے ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آیت کریمہ کا اُردو ترجمہ یہ ہے کہ "پس اے رسولؐ اب اگر آپ سے کوئی عیسٰیؑ کے بارے میں کج بحثی کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس اُن کے بارے میں علم آ چکا ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو، اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو، پھر ہم اور تم آپس میں مباہلہ کریں۔ اور اللہ کی لعنت کاذبین کے گروہ پہ قرار دیں"۔ یہ آیت محکمہ نجرانی عیسائیوں کے وفد کو دعوتِ مباہلہ دینے کی غرض سے نازل ہوئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو دعوتِ مباہلہ دے کر دوسرے روز صبح اپنے بیت الشرف سے یوں برآمد ہوئے تھے کہ لفظ اَبْنَاءَنَا کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو اپنے ساتھ لئے ہوئے تھے۔ لفظ "نِسَاءَنَا" کی تفسیر

کے لئے حضرت فاطمۂ زہرا علیہا السّلام کو بھی ساتھ لے لیا تھا جو سر تا بقدم چادر میں ملبوس آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں اور لفظ "اَنفُسَنا" کی تعبیر میں حضرت علی مرتضٰی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو اپنے اس مختصر قافلے میں شامل کر لیا تھا جو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کے پیچھے چل رہے تھے۔ غالباً اس لئے کہ خاتونِ خانوادۂ نبوّت کو نبوّت و امامت کی حفاظت میں لے چلیں اور غالباً اس لئے بھی کہ آیتِ کریمہ میں الفاظ کی جو ترتیب تھی وہ عملی تفسیر میں بھی قائم رہے۔

محدّثین و مفسّرین اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اس موقع پر مذکورہ ہستیوں کے سوا کسی اور کو اپنے ساتھ مباہلہ کرنے کے لئے نہیں لے گئے۔ اور ان مبارک و برگزیدہ ہستیوں کو دیکھ کر عیسائیوں کے وفد نے اپنی شکست قبول کر لی اور مباہلہ نہیں کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عیسائی وفد کے ساتھ صرف مرد تھے نہ اُن کی عورتیں اُن کے ہمراہ تھیں نہ اُن کے بچّے۔ اور یہ حقیقت ہر ایک کو معلوم تھی۔ لیکن اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنی جانوں (یعنی ایسے لوگ جو تمھاری جان کے برابر ہوں) سب کو ہمراہ لے کر مباہلے کے لئے نکلو۔ ظاہر ہے کہ اس حکم سے اللہ کا بس یہی مقصد تھا کہ فرزندانِ نبوّت و رسالتؐ، خاتونِ خانوادۂ نبوّت و رسالت اور نفسِ رسول کا ہمیشہ کے لئے تعارف ہو جائے اور اپنے پرائے سب ہی یہ دیکھ لیں کہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام فرزندانِ نبوت و رسالت ہیں، جناب صدیقۂ طاہرہ فاطمۂ زہرا سلام اللہ علیہا خانوادۂ نبوت و رسالت کی خاتون ہیں اور امیر المومنین حضرت علی مرتضٰی صلوٰۃ اللہ وسلامہٗ علیہ نفسِ رسولؐ ہیں۔

کتاب و سُنّت رسول کے اس متفقہ فیصلے کے مطابق امام حسینؑ

علیہ السلام فرزند رسول ہیں یعنی اس رسول العالمین کے فرزند ہیں جو تمام عالمین کا سید و سردار ہے لہٰذا وہ اپنے جد و پدر اور مادر و برادر کے بعد تمام عالمین سے افضل و برتر اور اپنے دور امامت میں تمام عالمین کے حاکم و مولیٰ تھے۔ پس اُن کی شہادت اُن کی شخصیت کے اعتبار سے یقیناً پورے عالمین میں سب سے بڑی شہادت عظمیٰ ہے۔

خصوصاً اس لئے کہ رسول اللہ نے اُن کے خون کو اپنا خون فرمایا تھا اور اُن کو اپنی ذاتِ مطہرہ کا جزو قرار دیا تھا۔ برادرانِ اہل سنت کے عظیم الشان محدث جناب شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی مشہور کتاب "سر الشہادتین" میں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی شہادتوں کو درحقیقت جناب رسالت مآب کی شہادت قرار دیتے ہوئے ذہائل جناب رسالت مآب کا تکملہ تسلیم کیا ہے۔

جہاں تک دوسرے معیار یعنی مقصد شہادت کی عظمت کا تعلق ہے تو سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ کا مقصد اُس صحیح و حقیقی دین اسلام کو باقی و زندہ رکھنا تھا جس کی تبلیغ و تعلیم میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی زندگیاں صرف ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر پورے عالمین میں کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا۔ یزید ابن معاویہ دین اسلام کو غیر مسلم کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمان بن کر مسخ و تباہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو حکومت کا سربراہ ہی تصور نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اپنے کو غلط طور پر اللہ کے اس دین برحق کا سربراہ ظاہر کر رہا تھا جسے امام حسینؑ کے جد امجد رسول اللہؐ نے تکمیل کی حد تک پہنچایا تھا۔ یزید اُس حکومت الٰہیہ کا دعویدار تھا جو صرف اللہ کی طرف سے اُن کے مقرر کئے ہوئے نمائندوں یعنی نبی و امام منصوص من اللہ ہی کو ملتی ہے۔ اس طرح یزید اپنے بے باکانہ طرز عمل سے دین اسلام کے

بنیادی اصولوں کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لئے اُس نے وارث رسول فرزند نبوت و رسالت حضرت امام حسین علیہ السلام سے اپنی بیعت کا مطالبہ کیا تھا۔ ایسے موقع پر اگر امام حسین علیہ السلام خاموش رہ جاتے یا بفرض محال اُس کی بیعت کر لیتے تو دین اسلام کی حقیقتیں انسانیت کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور سارے انبیاء و مرسلین کی محنتوں پر پانی پھر جاتا۔ لہٰذا امام حسین علیہ السلام نے اس شان مظلومی سے انکار بیعت کیا اور سخت ترین مصائب کو برداشت کر کے اس طرح اپنی اور اپنے سارے اصحاب واولاد کی شہادت کو پیش کر دیا کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کو ادنیٰ سے تدبر و تفکر کے بعد معلوم ہو جائے کہ صحیح و حقیقی دین اسلام میں حکومت الٰہیہ کا کیا تصور ہے اور یہ کہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے نمائندوں یعنی منصوص من اللہ اماموں نے کبھی بھی کسی کی بیعت نہیں کی یعنی ہرگز کسی کو اپنا ہادی و امام نہیں تسلیم کیا کیونکہ اللہ نے جس کو خود ہادی و امام بنایا ہو وہ اپنے دور میں کسی دوسرے کو ہادی و امام تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے سامنے جو عظیم الشان مقصد تھا اُس سے بڑھ کر کوئی اور مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک تیسرے معیار یعنی کثرت مصائب و شدت مظلومیت کا تعلق ہے تو وہ تاریخ اسلام اور تاریخ انسانیت پر نظر رکھنے والوں کے لئے روز روشن کی طرح واضح ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں کیا کیا مصیبتیں نہیں اُٹھائیں۔ عالم غربت میں اپنے پورے گھرانے کے ساتھ دریا کے کنارے ہوتے ہوئے بھی تین دن کی بھوک پیاس میں عاشورہ محرم کی صبح سے لے کر وقت عصر تک بچے بوڑھے اور کڑیل جوانوں کا شہید ہونا دیکھتے رہے۔ ایک ایک کی لاش میدان سے لاتے رہے

یہاں تک کہ شش ماہے بچے علی اصغرؑ کی شہادت بھی اپنے ہاتھوں پر دیکھی اور آخر کار شمر ملعون کے خنجر سے سجدۂ الٰہی میں گردن کٹا کر شہادت عظمیٰ کی منزل پر فائز ہو گئے۔ لیکن آلِ رسول پر مصائب و مظالم کا سلسلہ جاری رہا، شہادت کے بعد جسمِ اطہر گھوڑوں کے سموں سے پامال ہوا اور سرِ اقدس کو نیزے پر چڑھایا گیا۔ بے مقنع و چادر سیدانیوں کے ہمراہ کوفہ و شام کے بازاروں میں پھرایا گیا اور ابن زیاد و یزید کے درباروں میں پیش کیا گیا۔

پس معلوم ہوا کہ اس معیار سے بھی امام حسین علیہ السلام پورے عالمین میں سید الشہداء ہیں اور آپ کی شہادت، شہادت عظمیٰ ہے۔

اس کے بعد جہاں تک چوتھے معیار یعنی مقصدِ شہادت میں کامیابی کا تعلق ہے تو جس طرح امام حسین علیہ السلام کو اپنے مقصد یعنی صحیح و حقیقی دین اسلام کی بقا میں کامیابی حاصل ہوئی اسی طرح راہِ خدا کے کسی اور شہید کو نہ آپ سے پہلے کامیابی حاصل ہوئی نہ آپ کے بعد کسی کے لئے ممکن ہے۔ یہ سید الشہداء علیہ السلام کی ان کے مقصد میں کامیابی ہی کا نتیجہ ہے کہ آج نوعِ بشر کے لئے صحیح و حقیقی دین اسلام کو سمجھنے کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام اپنے اصحاب و اقارب کے ساتھ شہید ہو گئے لیکن ان کے نانا کی سچی تعلیم کو زندہ رہنے کا موقع مل گیا امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور آل رسولؐ کی اسیری و مظلومی کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت کی اسلامی دنیا ایک شدید صدمے کے ساتھ جہالت و غفلت کی گہری نیند سے چونک اٹھی اور اس وقت سے لے کر آج تک اور قیامت تک لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر فرزند رسول نے اتنی عظیم الشان قربانی کس مقصد کے لئے پیش فرمائی۔ اور اسی تجسس

سے حقیقی اسلام تک پہنچنے کی راہیں کھلتی ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ بیک وقت وجود خدا کی بھی دلیل ہے اور یوم قیامت کی کھلی علامت ہے۔ آپ کی شہادت آپ کے نانا، اُن کے دین اور اُن پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید سب کی تصدیق و تائید کے لئے کافی ہے۔ دیکھئے ایک آزاد خیال شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کیسی خوبصورتی کے ساتھ اس حقیقت کو بیان فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ؎

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگ کائنات
اک ذی شعور ذہن ہے اک کارساز ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف

اور برصغیر ہند کے مشہور و معروف صوفی بزرگ جناب خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے امام حسین علیہ السلام کے مقصد کی کامیابی کو یوں بیان فرمایا ہے ؎

شاہ است حسینؑ، بادشاہ است حسینؑ
دیں است حسینؑ، دیں پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دست یزیدؔ لعین
حقّا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

معلوم ہوا کہ اس معیار سے بھی امام حسین علیہ السلام سید الشہداء ہیں، آپ کی شہادت، شہادت عظمیٰ ہے اور وہی التفسیر ذبح عظیم ہیں۔ زیر نظر کتاب جناب سید العلماء علامہ سید علی نقی لکھنوی مدظلہ العالی

کے اُن مضامین پر مشتمل ہے جو امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ پر آپ نے مختلف اوقات میں تحریر فرمائے۔ فاضل مولف جناب محمد رضی خاں صاحب نے ان متفرق مضامین کو جس خوبصورتی کے ساتھ سلسلہ وار جمع فرما دیا ہے وہ آپ کے علم اور حسن ذوق کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس طرح جناب محمد رضی خاں صاحب نے ایک طرف تو حضرت سید الشہداء روحی لہ الفدا کی بارگاہ میں اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور دوسری طرف جناب سید العلماء مدظلہٗ کے لئے بھی اپنی بے اندازہ محبت کا ثبوت دیا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اہل علم اُن کی محنتوں کی داد دیں گے۔ اور بارگاہ نبوت و امامت میں اُن کی یہ کوشش سعی مشکور قرار پائے گی۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علیٰ محمد و آلہ الطاہرین:۔

دستخط

علامہ علی حسنین شیفتہ

۲۹ر اگست سنہ ۱۹۸۰ء

کراچی



کربلا کا تاریخی واقعہ

واقعۂ کربلا کی وہ تاریخی حیثیت جو سطحی نظروں سے دیکھنے میں چند سطور کے اندر ختم ہو جاتی ہے اور زیادہ اختصار سے کام لیا جائے تو شاید چند جملے اس عظیم حادثہ کو بتلانے کے لئے کافی ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ اسلامی تاریخ نے اس واقعہ کو نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

کربلا کا واقعہ رزم و بزم سوز و گداز کے تاثرات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی کمالات کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں اور نفسانی امتیازات کے جو بھی اسرار ممکن ہیں ان سب کا خزینہ دار ہے۔ علم تہذیب الاخلاق کا بڑے سے بڑا ماہر اور قانونی تمدن و معاشرت کا کامل ترین عالم ان واقعات سے اسی طرح سبق حاصل کر سکتا ہے جس طرح حقائق لاہوت کا بڑا محقق اور فلسفہ شریعت و احکام کا فقیہ متبحر۔

حسینؑ اور ان کے انصار نے روز عاشورہ صبح سے عصر تک کی قلیل مدت میں وہ کام کیا ہے جس کی نظیر عالم میں نہ ان سے قبل ممکن ہوئی اور نہ ان کے بعد ہو سکتی ہے کہنے کو تو وہ صرف اپنے جسموں کو مخالف فوج کی خون آشام تلواروں کی نذر کر کے اپنی جانیں نثار کر رہے تھے لیکن حقیقتاً انھوں نے عالم انسانیت کو مسخر کر لیا اور دنیا کے علم و عمل دونوں پر قیامت تک کے لئے سکہ قائم کر گئے انھوں نے اس دن زندگی کے ہر شعبہ کی تکمیل کی اور کمال انسانیت کا کوئی باب ایسا نہیں تھا جس کا نمونہ پیش نہ کیا ہو۔

علم الاخلاق کی جامع ترین کتابوں کا مطالعہ کر جاؤ، علم النفس کے حقائق و اسرار کسی مسلم استاد سے تعلیم حاصل کر و، اجتماعی و معاشرتی آداب اور انسانی فضائل کی مشق پورے معیار ترقی پہنچا دو اور

معرفت الٰہیہ و حقائق اسرار توحید کا پورے طور پر احاطہ کر لو اس کے بعد ذاکر بلا کی اس چند گھنٹے کی مختصر مدت کا ایک محققانہ نظر سے جائزہ ملے لو تم کو وہاں وہ سب مل جائے گا جو ان تمام کمالات کا ما حصل اور نتیجہ کہا جا سکتا ہے تم دیکھو گے جو کچھ سُنا تھا وہ لفظیں تھیں اور ان کے معنی یہ ہیں ۔ سید الشہداء اور ان کے جانباز سپاہیوں کا ہر طرز عمل اور اس دن ایک اسرار و رموز کا خزانہ تھا کہ جس میں اخلاقی تمدن و معاشرتی اجتماعی نفسانی خصوصیات و کمالات کے نامعلوم کتنے پہلو مضمر تھے۔ ان کے کسی ایک فعل کو سامنے رکھ کر مشکل سے مشکل مسائل علم النفس کے حل کئے جا سکتے اور بلند ترین انسانی کمالات حاصل کئے جا سکتے ہیں ۔ ثبات قدم، استقلال، خودداری، صدق و امانت، صفائی و اخلاص، صبر و ضبط، حق پرستی و حق پروری، عدل و انصاف، رحم و مروت، جذبہ مذہب پابندی شریعت، سخت ترین وقت پر عبد و معبود کے مخصوص روابط کی نگہداشت توکل و تحمل، نوع بشر کی خیر خواہی، مساوات و ہمدردی عفو و کرم سخاوت و شجاعت اپنے مقدس اور سچے نصب العین کی آخر وقت تک حمایت اتمام حجت، مواعظ و نصیحت، تبلیغ و دعوت، نفس کشی عالی حوصلگی، بلند ہمتی اگر صرف چند خوش نما لفظوں کا نام نہیں بلکہ ہر ایک ان میں سے فلسفہ اخلاق یا علم النفس، حقائق الٰہیہ یا اسرار شریعت کا ایک مستقل اور مفصل مبسوط باب ہے تو یقیناً کربلا کے واقعات مختصر نہیں بلکہ بہت طوفانی ہیں اور اگر ان کے نتائج و اسباب پر غائر نظر ڈالی جائے تو وہ یقیناً چند صفحوں میں لکھنے کے نہیں بلکہ دفتر کے دفتر اور کتابوں کی کتابیں ان کے لئے لازم ہیں ۔

وہ وقت کہ جب ہاشم اور امیہ میں عبد مناف کے انتقال کے بعد تنازع ہوئی اور فیصلہ ہاشم کے حق میں امیہ کے خلاف ہوا اسی زمانہ سے عداوت و فساد کی آگ تھی جو امیہ کے دل میں مجبوری و لاچاری کے پردے میں سُلگ رہی تھی اور رہی وہ بڑا نتا اولاد تک پہونچی دشمنی اور

عداوت کی آگ مشتعل ہوتے ہوئے کسی ایک فریق کی ظاہری ترقی اور رفعت وبلندی دوسرے فریق کے لئے گرتی ہوئی بجلی کا کام دیا کرتی ہے حسد وہ شئے ہے کہ جس کے باعث دو یکجہت و یک دل دوستوں میں اختلاف پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ چہ جائیکہ عداوت پہلے سے موجود ہو اور اس وقت کوئی ایک فریق کسی بلند مرتبہ تک پہونچا ہوا دکھائی دے تو اس وقت عداوت کے شعلوں کا سینے میں بھڑک کر رہ جانا نکلنا اور اس کے تاریک و تار دھوئیں سے آنکھوں کے سامنے عالم کا سیاہ ہو جانا کوئی بعید نہیں بنی اُمیہ کے لئے ہاشمی خاندان کی وہ عزت و وجاہت جو ملک عرب میں پائی جاتی تھی آتش حسد کے مشتعل کرنے کے لئے کیا کم تھی کہ خالق حکیم نے اپنی خدائی کے مختار کل اور دنیا و آخرت کے عظیم فرمانروا سرکار کائنات نبی آخرالزماں کی ولادت کے لئے ہاشمی خاندان کو منتخب کیا۔

رسالت کی تحریک کی روزافزوں ترقی اور اس کے آخری نتیجہ کو بنی اُمیہ کے بزرگ خاندان ابوسفیان کی نظریں پہلے ہی روز سے تاڑ گئی تھیں اسی وجہ سے اس نے اپنی راحت و آرام سے ہاتھ دھو کر پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کے مقابلہ کی ضرورت سمجھی اور تمام قبائل عرب میں دورہ کر کے ان سب کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا اور ان کی ہمدردی کو اپنے لئے حاصل کر لیا۔ لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ اسلامی ترقی کسی ظاہری ساز و سامان یا خارجی طاقت اور قوت کا نام نہیں ہے بلکہ روحانی قوت کا نتیجہ ہے، اسلامی ترقی کا زور روکنے کے لئے اس کی تمام فوجی طاقتیں اپنے ساز و سامان سمیت ایسی ثابت ہو رہی تھیں کہ جیسے سیلاب کے زور کو ہتھیلی سے روکا جائے یا آفتاب کے طلوع ہوتے وقت نقطۂ مشرق کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا جائے کہ چند ہی منٹ میں آفتاب کی روشنی بڑھ کر اس پردہ کے چاروں طرف محیط ہو جائے گی۔

بدر و اُحد و احزاب پھر صلح حدیبیہ اور اس کے بعد کے واقعات ہر مرتبہ جان توڑ کوشش اور نتیجہ میں ناکامی سب کے آخر میں مجبور

سر تسلیم خم کرنے کی ضرورت پڑنا اور دل کی تمام تلاطم خیز عداوتوں کے باوجود اپنے تمام سرمایہ حیات، عزت و آبرو کو دشمن رسالت مآبؐ کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا یہ واقعات ایسے نہ تھے جو دل کی آگ کو خاموش ہو جانے دیں۔ یہ تمام تابڑ توڑ واقعات اس آگ کے لئے چھینٹوں کا کام دے رہے تھے لیکن پانی کے چھینٹے نہیں بلکہ مٹی کے تیل کے چھینٹے، رسالت مآبؐ کی وفات کے بعد اس میں پوری ترقی ہونا ناگزیر تھی، خلافت کے دوسرے دور میں اسی جماعت کا برسر حکومت آنا ایک بار پھر تاریخ کے اوراق منقلب ہونا تھا اس تخت پر بنی ہاشم کی سربرآوردہ تاریخی ہستی امیرالمومنین کا آجانا اور صفین کا میدان ظاہری معاہدہ اور اس کی خلاف ورزی علی ابن ابی طالب کی اولاد سے جو ہمیشہ اس کے مبلغ تھے باطل کوشش حکومت و سلطنت کو ہمیشہ خطرہ کا احساس ہونا اور ان تمام کا نتیجہ وہ تھا جو کربلا میں بنی امیہ کے ہاتھوں خاندان رسالت کے ظاہری خاتمہ تک منتہی ہوا لیکن کیا معلوم تھا کہ جس کو وہ خاتمہ سمجھ رہے ہیں وہ اس خاندان کے حقیقی فروغ کا پہلا دن ہے۔



حرمِ رسولؐ سے سفر
اور
حرمِ خدا میں پناہ

ولید سے گفتگو کے بعد (جس میں اس نے بیعتِ یزید کا مطالبہ کیا تھا) امامؑ نے مدینہ کو ترک کرنا ہی اپنے لئے ضروری سمجھا یہ خیال کرنا کہ آپ مدینہ ہی میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ تاریخ کے مسلسل واقعات سے بے خبری یا ان کے نتائج سے غفلت کا مظاہرہ ہوگا۔

وفات رسولؐ خدا ہی کے بعد سے مدینہ پر کچھ ایسے اثرات چھائے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر یہ توقعات غلط ثابت ہوتی ہیں۔

آخر یہ مدینہ ہی تو تھا جہاں وفات رسول خدا کے بعد ہی حضرت فاطمہ زہراؑ پر مصائب کی یورش تھی مگر اہل مدینہ کی طرف سے ان کے ساتھ ہمدردی کا کوئی مظاہرہ کہیں تاریخ میں نظر نہیں آتا۔

پھر وہ مدینہ ہی تھا جہاں حضرت علیؑ نے گوناگوں دلشکن حالات کا پچیس برس تک مقابلہ کیا مگر اہل مدینہ نے ان کے ساتھ کسی بھی محبت و غمخواری کا ثبوت نہیں دیا۔

اس کے بعد اسی مدینہ میں وہ موقع آنکھوں کے سامنے آیا کہ حضرت امام حسنؑ کے جنازہ کو روضۂ رسولؐ پر لے جانے میں مزاحمت کی گئی مگر مدینہ کے لوگوں نے ذرہ بھر بھی اس پر احتجاج نہیں کیا کیا یہ واقعہ ایسا اہم

نہ تھا۔ مدینہ کے جسم میں اگر روح ہوتی تو اس میں حرکت پیدا ہوتی اور کسی قسم کے احساس کا مظاہرہ کیا جاتا

یہ تو کربلا کے بعد کے سلسلے کے کچھ نمونے ہیں اور خود ۶۱ھ میں حیرت انگیز مگر ناقابل انکار صورت سے اہل مدینہ کی خاندان رسولؐ کے بارے میں بے حسی کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ جب شہید ہو گئے اور آپ کے دردناک مصائب و مظالم کا بتفصیل اہل مدینہ کو حال معلوم ہو گیا تب بھی اہل مدینہ نے خون حسینؑ کے انتقام کے لئے کسی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا اور باوجودیکہ عراق میں تلاطم ہو رہا تھا۔ لیکن حجاز اس بارے میں بالکل خاموش تھا۔

وہ تو امام حسینؑ کی قربانی کا طبعی اثر تھا کہ یزید کی بد اعمالیوں پر نگاہیں متوجہ ہو گئیں اور پھر دوسرے سال یزید کے افعال و اعمال کے تفصیلی حالات معلوم ہونے کے بعد انھوں نے اعلان مخالفت کر دیا جس کے نتیجہ میں واقعۂ حرہ ظہور پذیر ہوا جس کی اجمالی تفصیل اپنے محل پر بعد کو آئے گی مگر خود قتل حسینؑ کا جرم ان کو اتنا اہم معلوم نہ ہوا کہ وہ اس کی بنا پر یزید کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

پھر اس کے بعد واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں سادات بنی فاطمہؑ پر بنی امیہ کے آخری دم تک اور پھر بنی عباس کے دور حکومت میں کیسے کیسے ہولناک مظالم ہوتے رہے مگر اہل مدینہ نے کبھی ان کی کوئی امداد نہیں کی۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السّلام سے لے کر امام علی نقی علیہ السّلام تک تمام وہ مقدس ہستیاں جو اپنے وقت میں خاندان رسولؐ کی شمع و چراغ اور تعلیمات اسلام کی محافظ تھیں اپنے ابتدائی دور حیات میں اسی مدینہ میں مقیم تھیں پھر نہیں کسی کو زہر دیا گیا کسی کو مقید کر کے جلاوطن کیا گیا۔ کسی کو بجبر مدینہ سے بلایا گیا مگر کیا کبھی اہل مدینہ نے انکی حفاظت کی کوشش تو درکنار اس پر اف بھی کی؟ کبھی نہیں!

یکن ان ماقبل اور بعد کے واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد پھر یہ تصور صحیح ہو گا کہ امام حسینؑ مدینہ میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں جان لڑا دیتے ہرگز نہیں۔!

عام طور سے اہل حجاز کے متعلق دانشمندانِ عرب کی رائے یہی تھی کہ وہ مشکلات میں ثابت قدم بہت کم رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ جب معاویہ نے ابن الکوا سے مختلف عرب ممالک کے متعلق رائے دریافت کی اور اس میں اہل حجاز کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا "فتنہ انگیزی میں سب سے آگے مگر اس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور مہمات کے سر کرنے میں ناکارہ"۔ ؎

اس صورت میں حالات اور بعد کے واقعات بتلاتے ہیں کہ اگر امام حسینؑ عاقبت اندیشی کر کے مدینہ رسولؐ کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتل حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملائم طرز عمل کی اطلاع یزید کو دیتا اور اس وقت یزید کا عتاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا تو خود ولید ہی کو پھر عمر سعد کی طرح باوجود اپنے ضمیر کی مخالفت کے مال و جاہ دنیا کی طمع اور سطوت حکومت کے خوف سے حسینؑ کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیر کی طرح اس کو معزول کر کے مروان بن الحکم یا اسی کے مثل کسی دوسرے سفاک اور سخت ترین دشمن اہلبیتؑ کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا جاتا اور فرزند رسولؐ کے خون سے مدینہ رسولؐ کی زمین کو گل رنگ بنا دیا جاتا۔

یہ خطرہ بالکل یقینی تھا اور اس نے فعلی حیثیت اختیار کر لی تھی اس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ

"خلیفۃ المسلمین یزید کی خدمت میں ولید بن عتبہ کی جانب سے

؎ کتاب البلدان ص۱۲۵

گزارش ہے کہ حسینؑ بن علیؑ آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں اب آپ کی جو رائے ہو" اس کے جواب میں یزید نے لکھا! "اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا تمام ان تمام افراد کی جنہوں نے میری بیعت کرلی ہے اور جنہوں نے نہیں کی ہے مکمل فہرست جلد بھیجو لیکن اس جواب کے ساتھ حسینؑ بن علیؑ کا سر موجود رہو" اس حکم کی گرمی کے مقابلہ میں ولید کہاں ٹھہر سکتا تھا؟ وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت حسینؑ مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لئے ولید تعمیل حکم سے مجبور رہا مگر اس کے بعد بھی ولید معتوب ہونے سے نہیں بچا اور ماہ رمضان میں اسے معزول کرکے عمرو بن سعید ہی کو جو ابھی تک حاکم مکہ تھا مدینہ کا بھی حاکم مقرر کر دیا گیا۔[1]

پھر اگر حضرت امام حسینؑ مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا آپ کی شہادت اسی نمایاں حیثیت کے ساتھ ہوتی جس طرح کربلا کے ہوئی؟ سیاست حکومت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے یا تو امام حسنؑ کی شہادت کی طرح کوئی "جعدہ بنت اشعث" فراہم کی جاتی یا حضرت علیؑ کی طرح کوئی "ابن ملجم" کی طرح کا خارجی جس کے بعد بھی حکومت دمشق کا دامن اس الزام سے بری ہی ثابت کیا جاتا اس صورت میں حسینؑ واقعی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے جاتے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب پھر بھی پڑی رہتی۔

حضرت امام حسینؑ اس کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ تدبر کا اقتضا تھا کہ مدینہ میں قیام اسی وقت کیا جاتا جب مدینہ میں قیام ممکن ہوا اور جب بیعت نہیں کرنا تھی تو اپنے اصول، اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اسی افق پر لے جاکر پیش کرنا چاہیئے تھا کہ جس پر آپ کربلا کے میدان میں انہیں لے جاسکے بیشک یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا وہ کربلا کی منزل کا پہلا مرحلہ یا آخرت کے سفر کا پہلا قدم تھا اس لئے یہ رات حضرت امام حسینؑ نے پوری جاگ کر بسر کی۔ اور اسے اپنے نانا (حضرت رسول خدا) ماں (حضرت فاطمہ زہراؑ) اور بھائی (حسن مجتبیٰؑ) کے مقدس مزارات سے رخصت ہونے میں صرف کیا۔

---

[1] طبری ج ۱ص ۱۹ ص ۱۲۶۔

کی رات ختم ہوئی تھی آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے مدینہ کی صبح آج بے نور تھی اس لئے کہ حقیقی آفتاب اس آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسولؐ کی قبر بے چراغ تھی اس لئے کہ رسولؐ کا نورِ دیدہ آج صحرائے غربت میں گامزن تھا۔ یہ ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ اتوار کی رات تھی جب امام حسینؑ مدینہ سے روانہ ہوئے[۲]

اس وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی[۳]

فخرج منها خائفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین[۴]

اس آیت میں موسیٰؑ کا ذکر ہے اس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و تشدد سے بیزار ہو کر مصر سے باہر نکلے ہیں۔ روانگی کے بعد امام حسینؑ شاہراہ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حالانکہ ابن زبیر اس کے پہلے شاہراہ عام کو چھوڑ کر غیر معروف راستوں سے مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ یہی مشورہ آپ کو بھی دیا گیا مگر آپ اپنی مدینہ سے روانگی کو فرار کی حیثیت دینے کو تیار نہ تھے آپ نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہیں میں تو اسی راستے سے جاؤں گا۔ پھر خدا کو جو منظور ہو[۵]۔

آپ نے اپنے دادا ابوطالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا جن میں آپ کی دو بہنیں حضرت زینبؑ اور ام کلثومؑ بھی تھیں۔ اس کے علاوہ سب بھائی بھتیجے اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے۔ سوا محمد بن الحنفیہ کے[۶]۔ جو کسی مجبوری یا مصلحت سے مدینہ میں چھوڑ دیئے گئے اور ام ہانی بنت ابوطالب پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جا سکی تھیں بس ان کے علاوہ اولاد ابوطالب میں سے کوئی بھی حسینؑ کے ساتھ سے جدا نہیں ہوا۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسینؑ کے ساتھ بنی ہاشم میں سے سوا اولاد ابوطالب کے کسی اور سلسلہ کا ایک شخص بھی میدان کربلا میں نظر نہیں آتا۔

---

[۲] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۰ صفحہ ۲۱۵ ارشاد صفحہ ۲۰۱ [۳] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۱ [۴] قرآن مجید سورہ قصص آیۃ ۲۱ [۵] طبری ج ۶ صفحہ ۱۹۱ [۶] الاخبار الطوال صفحہ ۲۳۰، طبری ج ۶ صفحہ ۱۶۰۔

اس طرز عمل سے بھی کہ آپ نے صرف اپنے گھر والوں کو ساتھ لیا صاف نمایاں تھا کہ آپ جنگ کے ارادے سے روانہ نہیں ہو رہے ہیں مدینہ سے باہر نکلنے کے بعد امام حسینؑ نے مکہ معظمہ کی طرف رخ کیا۔ اس لئے کہ مکہ میں عرب کی قدیم روایات نیز اسلام کے مخصوص تعلیمات کی بنا پر کسی جاندار تک کا قتل بلکہ گھاس تک کا اکھاڑنا جائز نہیں لہ

امام حسینؑ نے یہاں پہنچکر اپنے کو ظاہری طور سے ایک محفوظ آغوش کی پناہ میں ڈال دیا اور یہاں رہ کر آپ خاموشی کی زندگی گزارنے لگے نہ امور سلطنت سے غرض اور نہ مہمات ملکی سے کوئی تعلق آپ نے مکہ پہنچ کر بھی نہ کہیں خطوط و رسائل روانہ کئے اور نہ مختلف اطراف و جوانب سے لوگوں کو اپنی نصرت کی طرف دعوت دی یہ بھی آپ کے مقصد کے تعین کے لئے آپ کے کردار کا ایک اہم جز ہے آپ کا مکہ میں ورود شب جمعہ ۳ شعبان سنہ۶۰ھ کو ہوا ٢ہ

اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی ٣ہ ولما توجہ تلقاء مدین قال عسی ربی ان یھدینی سواء السبیل ٤ہ یہ بھی حضرت موسیٰ کے واقعہ سے متعلق ہے جب انھوں نے مدین میں پناہ لی تھی۔

آپ نے مکہ میں پہنچ کر شعب علیؑ میں قیام کیا۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے دو ایک دن پہلے پہنچ چکے تھے ان کے مکہ میں اچانک پہنچنے کے ساتھ لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے اور انھیں ایک مرکزیت سی حاصل ہو گئی تھی لیکن حضرت امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے ساتھ ہی لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ حضرت امام حسینؑ کے گرد و پیش رہنے لگے اس بات سے عبداللہ بن زبیر کو گونہ ناگواری پیدا ہوئی۔ اور انھیں اندازہ ہو گیا کہ حسین کی موجودگی میں ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ مصلحت وقت کی بنا پر وہ کبھی صبح و شام دونوں وقت امام حسینؑ کے پاس آنے جانے لگے ۵ہ

لہ صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۲۱۶ صحیح مسلم ج ۱ صفحہ ۴۳۸ و صفحہ ۴۳۹ ٢ہ طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۵ و ارشاد صفحہ ۲۰۱ ٣ہ طبری ج ۶ صفحہ ۲۱۶، ٤ہ قرآن مجید سورۃ قصص آیۃ ۲۲ ۵ہ الاخبار الطوال صفحہ ۲۲۹

جب معاویہ کی وفات ہوئی ہے تو مدینہ میں ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کی حکومت تھی اور مکہ میں یحییٰ بن حکیم بن صفوان بن امیہ اور کوفہ میں نعمان بن بشیر انصاری اور بصرہ میں عبیداللہ بن زیاد گورنر تھا۔ [1]

معلوم ہوتا ہے کہ حکومت دمشق کو یحییٰ پر اطمینان نہ تھا چنانچہ امام حسینؑ کے مکہ میں پہنچنے کے بعد یحییٰ بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید بن عاص بن امیہ کو گورنر مقرر کیا گیا [2] پھر جب ولید کے طرز عمل کی اطلاع اور سابق مروان کی طرف سے رپورٹ یزید کو پہنچی تو ولید کے بجائے اسی عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے بعد میں یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومت دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسینؑ کے معاملہ میں یزید کا طرز عمل انتہائی متشددانہ اور جارحانہ تھا کہ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے آدمی نہ ملتے تھے۔ اور خود اس کے گورنر اس کے احکام کی تعمیل اس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ صورت حال سے ظاہر ہے کہ عمال حکومت میں سے جو بھی حسینؑ کے ساتھ ذرا مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً ہٹا دیا جاتا تھا۔ تلاش تھی ایسے لوگوں کی جو اہلبیت رسولؐ کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں اس کے بعد بھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ جو کچھ بھی تشدد ہوا اس کی ذمہ داری یزید پر نہیں بلکہ عمال حکومت پر تھی۔ ؟

اس وقت امام حسینؑ کا مکہ معظمہ میں قیام، ایک پناہ گزین کی حیثیت سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے بھائی محمد بن الحنفیہ نے دیا تھا جسے آپ نے پسند کیا تھا۔ مکہ میں حالات کے ناسازگار ہونے کی صورت میں کیا ہو گا۔ ؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ

[1] [2] الاخبار الطوال صفحہ ۲۳

کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جائیے گا ریگستانی صحراؤں اور پہاڑوں کے دامن میں اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل ہوتے رہیے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری نتیجہ سامنے آئے اور اس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجئے۔

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیش نظر نہیں تھا سوا ایک پرامن زندگی کے "جیو اور جینے دو" ہی کے لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں آپ نے نہ تو اپنی موافقت میں کوئی عسکری طاقت فراہم کی اور نہ جمہور کو یزید کے خلاف مشتعل کیا۔ تقریر یا تحریر کسی حیثیت سے کبھی ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جا سکتی۔ (از شہید انسانیت)
(بحوالہ پیام عمل اگست ۱۹۷۳ء)



علامہ ذکی الاجتہادی الرشتی نے سید العلماء کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا جس میں مولانا شمس باقر صاحب، مولانا علی سرکار نقوی صاحب صدر آل پاکستان ذاکرین ایسوسی ایشن اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔

شہادتِ حسینؑ کے اسباب

آپ کو معلوم ہے کہ حسینؑ حضرت محمد مصطفےٰؐ کے نواسے تھے اور حضرت محمدؐ اس انقلاب کے مرکز تھے جس کا نام ہے "اسلام"!

"اسلام" سے پہلے عرب کی معاش اور معاشرتی دُنیا جس قدر تاریک تھی اس کا آپ تاریخ میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مساواتِ انسانی کوئی چیز نہ تھی اور غلبہ طاقت اور اقتدار سب کچھ تھا اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ تھی کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ فریقِ مخالف کے سینکڑوں آدمی مار ڈالے جاتے تھے تب سمجھا جاتا تھا کہ خون کا اس کے بدلہ ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہو جاتا تھا تو اس کا خون معاف تھا۔

یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کی سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اڑا رہی تھی ان سب کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیّت کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا۔ ماوراء المادہ کا تخیل باقی نہ رہا تھا اس لئے مادی امتیاز ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا۔

"اسلام" جو ایک عظیم انقلاب کا حامل بن کر آیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اس کا اصلی سبب دُور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیّت کے احاطے سے آگے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افرادِ انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے اور پھر اس نے سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات کو مٹا کر نیا امتیاز قائم کیا کہ جو شخص فرائضِ انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔ (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس اصول کے ماتحت غلبۂ طاقت

اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہیں
اس نے کہا کہ ہر انسان دوسرے کے برابر ہے جب تک کہ انسانیت کے
اوصاف میں اپنے تئیں اُس سے بہتر نہ ثابت کرے۔

اس سے معاشی معاشرتی اور تمدنی حالات میں بڑی تبدیلیاں
ہوگئیں اسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیابی
حاصل کی بہت سے بلند خاندانوں کے افراد کی شادی کی گئی ان خاندانوں
میں جو قدیم زمانہ سے پست سمجھے جاتے تھے ایک بلند مرتبہ شخص کے قاتل
کے بدلے یہ امر ناممکن ہوگیا کہ سوائے اس کے کوئی دوسرا شخص قتل کیا جائے
بہت سی غیر اقوام اور پردیسی انسانوں کو جو اس کے پہلے جانوروں
کے برابر سمجھے جاتے تھے ان کے انسانی اوصاف کی بدولت وہ عزت حاصل
ہوئی جو بڑے بڑے خاندانی عربوں کو نہ تھی اور اکثر مہم میں عرب قوم کو
سرداری قبول کرنا پڑی ان لوگوں کی جنھیں وہ نسلی حیثیت سے اپنے
برابر نہ سمجھتے تھے یا غلبہ اور اقتدار کے لحاظ سے جنھیں وہ کمزور خیال
کرتے تھے۔

ہر انقلاب کے بالکل متوازی ایک اور انقلاب شروع ہوجاتا ہے
جو انقلاب سے پیدا ہونے والے امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور رجعت
پسندی یا قدامت پرستی کے امتیازات کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

اسلام کو اس حیثیت سے اُن تمام قبائل کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس
کے پہلے اپنے تئیں غلبہ و اقتدار کا حقدار سمجھتے تھے خواہ نسلی تفوق کی بنا
پر، خواہ مال و دولت کی بنا پر اور خواہ اپنے قوم و قبیلہ کی بنا پر۔

حضرت محمد مصطفےٰ کو اس سلسلے میں کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر،
اُحد اور احزاب بہت مشہور لڑائیاں ہیں۔

ان میں بنی اُمیّہ کا سردار ابوسفیان بہت آگے آگے تھا اور وہ مخالف
جماعت کا سرگروہ تھا۔

ان مقابلوں میں اگرچہ کامیابی اسلام کو ہوئی مگر یہ کامیابی مخالف کے دلمیں

ایک جذبہ انتقام پیدا کر دیتی تھی اور اس لئے ظاہری قوتوں کے توازن میں اسلام اگرچہ سب سے وزنی طاقت بن گیا مگر اس کے خلاف مخالف کا جذبہ باطنی طور پر سنگین تر ہو گیا یہاں تک کہ ایک وہ وقت آیا جب فریق مخالف کی شکست نے مختتم طور پر ہتھیار ڈال لینے پر مجبور کر دیا اور مخالف جماعت کے لوگ یہاں تک کہ خود ابوسفیان اور اس کے خاندان والے اسلام لے آئے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوموں کے کچھ نفسیات ہوتے ہیں اسلام سے شکست خوردہ جماعت یعنی بنی اُمیہ اور ان کے ہواخواہ جب اسلام لے آئے تو ان کی نفسیاتی حیثیت یہ تھی کہ وہ برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچا دیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے مقصد کو تبدیل کر کے اُن امتیازات کو مٹا دیں جو اسلام نے قائم کیے ہیں۔ اور اس کے پردہ ہی میں سہی، ان امتیازات کو قائم کر دیں جو اسلام سے پہلے عرب میں قائم تھے۔

پیغمبرؐ اسلام کی زندگی میں اُن کے اس مقصد کی تکمیل مُشکل تھی مگر پیغمبرؐ کے بعد ان کو اپنے مقاصد کی کامیابی کی کافی توقع تھی۔

پیغمبرؐ اسلام کے بعد اسلامی انقلاب کے محافظ پیغمبرؐ کے وارث دار ان کے گھرانے والے لوگ تھے جنھیں وہ برابر اپنے کاموں میں شریک رکھتے تھے اور جنھیں انھوں نے اپنے مقاصد سے پورے طور پر مطلع کر دیا تھا اور ان کی عملی تربیت اس طرح کر دی تھی کہ وہ اپنے اقوال و افعال سے اُن مقاصد کے ترجمان اور محافظ بن سکیں۔

ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علم برداروں میں کشمکش لازمی تھی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دفعہ آزمائش کے وقت آل رسولؐ کے ساتھی کم نکلے۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا اس کے وجوہ اقتصادی بھی ہیں۔ اور سیاسی بھی۔ نفسیاتی بھی اور نسلی بھی۔!

آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس نے امتیاز صرف فرائض انسانی کی بناء پر قرار دیا تھا

مال اور دولت کی اس طرح تقسیم کہ جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اس کے محافظین ابھی اس کے قریب جا سکتے تھے اس لئے آل رسولؐ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کر کے دولت مند بنیں اور خصوصیت سے ان لوگوں کو زر و جواہر سے مالا مال کریں جن سے ان کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی امید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ سے اُن کے بھائی عقیل تک برگشتہ ہو گئے۔ اس بنا پر کہ وہ چاہتے تھے کہ اُن کو تمام مسلمانوں سے زیادہ کچھ دیا جائے اور حضرت علیؑ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے پھر جب خاص اپنے بھائی کا یہ عالم تھا تو دوسروں کا کیا ذکر۔!

اس کے برخلاف دوسری جماعت کے لوگوں کو اس کی پرواہ نہ تھی وہ اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لئے خزانہ کا منہ کھول دیتے تھے اور جس کو اپنے مطلب کا سمجھتے تھے اس کو مالا مال کر دیتے تھے اس کے علاوہ اسلام نے ان تمام مقتدر اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کر دیا تھا جو اس کے پہلے برسر اقتدار تھیں اور بالکل ایک الگ معیار قائم کیا تھا وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ سب ہی تھیں اسلئے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کو مٹانے میں ان میں سے ہر ایک کے اقتدار کا قیام منحصر تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ سابق کی شکستوں کا ان سب ہی دل پر اثر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا اور پھر اتفاق کی بات یہ ہے کہ رسولؐ کے مسلک کے محافظ تمام ایک خاص خاندان (بنو ہاشم) کے لوگ تھے جن سے اکثر عرب خاندانوں کو پہلے سے حسد اور عناد تھا اس لئے وہ نسلی تعصبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور چونکہ عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد اُن جذبات کی بنا پر جو ابھی بیان ہوئے جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افراد اہل قبیلہ اُن ہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا

نہ ان کی کوئی رائے خصوصاً جب کہ جہالت بھی اُن میں اس حد تک تھی کہ جو اُن ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔

بنو امیہ کا اقتدار مسلمانوں میں بحیثیت ایک صوبہ دار حاکم کے شروع ہوا انھوں نے اپنے دورِ حکومت کی ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش ملوکانہ شان و شوکت کی حامل رکھی مسلمانوں کے اقتدارِ اعلیٰ کی جانب سے اس پر اشتباہ ہوا تو ایک چالاک اور شاطر سیاست داں کی طرح یہ کہکر تسکین کر دی گئی کہ چونکہ شام کی سرحد قیصرِ روم کے ملک سے ملی ہوئی ہے اس لئے یہاں اسلام کی عظمت قائم رکھنے کے لئے اس طرح کے جاہ و جبروت کی ضرورت ہے اس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فتح پانے لگا اور اسلام کی مقررہ حدود کے بجائے دوسرے حدود و امتیازات قائم ہو گئے۔

حضرت علیؑ کی خلافت کا مختصر دور تمام تر اسی اُموی اقتدار کے مقابلہ میں صرف ہوا جس میں حضرت علیؑ کو بہت محدود کامیابی حاصل ہو سکی۔

حضرت علیؑ کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ اس اقتدار میں اور اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ حضرت امام حسنؑ کو صلح پر مجبور ہونا پڑا اور اس طرح اپنے مخالف طاقت کے جارحانہ اعمال کو شرائطِ صلح کے ذریعہ سے محدود بنانے کی کوشش کی مگر حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور شرائطِ صلح کی خلاف ورزی کی جانے لگی اور سیاسی اقتدار کی جرأت و بیباکی اس حد پر پہنچی کہ حجر بن عدی اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو جو بڑے عابد و زاہد متقی اور پارسا تھے تہِ تیغ کر دیا گیا اور عمرو بن الحمق الخزاعی کا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بڑا درجہ رکھتے تھے سر قلم کر کے نیزے پر بلند کیا گیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کا نظریہ روحانیت و للہیت فنا ہونے لگا اور مسلمانوں میں بھی طاقت حق ہے کا عملی طور پر کلمہ پڑھا جانے لگا حق پرستی ختم ہوئی آزادیٔ ضمیر رخصت ہوئی ایمان اور اعتقاد روپیہ اور سنہرے سکوں پر بیچا

جانے لگا اور مادی اقتدار کے طاغوت کی پرستش ہونے لگی۔

یہ حالات پھر بھی برداشت کئے جانے کے قابل تھے اگر معاویہؓ کی جانب سے اس شرط کی مخالفت نہ ہوتی کہ ان کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

امام حسنؑ نے بڑی عاقبت اندیشی اور انجام بینی سے یہ شرط قرار دی تھی مگر اموی سیاست اپنے مقاصد کے لحاظ سے نامکمل رہتی اگر اس شرط پر عمل کر لیا جاتا اس لئے معاویہؓ نے اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد بنایا اور صرف نامزد ہی نہیں کیا بلکہ تمام عالم اسلام سے بڑی کوشش کے ساتھ یزید کی بیعت حاصل کی گئی۔

یزید کے افعال و اعمال اگر وہ نہ بھی ہوتے جو عام طور سے ہر شخص کو معلوم تھے تب بھی اس کو ولیعہد بنانا شرائط صلح نامہ کے خلاف ہونے کی بنا پر ناجائز تھا مگر مسلمانوں میں اقتدار و طاقت سے مرعوبیت اس درجہ بڑھ گئی کہ کسی کو اس پر توجہ نہ ہوئی اور توجہ ہوئی بھی تو اظہار کی جرأت نہ تھی۔

آل رسولؐ میں اس وقت بزرگ ہستی حضرت امام حسینؑ کی تھی۔ آپ بنو امیہ کے طرز عمل کو شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ وہ کس طرح اسلام کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے اور کس طرح دنیا کو رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی طرف لے جا رہا ہے۔ پھر بھی وہ اس کے متوقع تھے کہ شاید یہ صورت حال معاویہؓ کی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم ہو جائے مگر یہ اس انقلابی سیاست کی آخری چال تھی کہ شاہان خود مختار کی طرح اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے کو بغیر اس کے اوصاف کا لحاظ کئے ہوئے نامزد کر دیا آپ نے اس کو شدت سے محسوس کیا اور اندازہ کیا کہ آپ پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔

معاویہؓ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ متعلق الزمان حسینؑ ہیں اس لئے انھوں نے آپ کو ملانے کی پوری کوشش کی مگر نتیجے

میں ناکام ہونا پڑا۔ یہ بنی امیہؓ کے اقتدار کو بڑی کاری ضرب تھی جسے معاویہؓ کی قوت و فراست سمجھ چکی تھی۔ اسے حسینؑ بن علیؑ کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہیئے کہ آپ نے اپنے عمل کے سکوت کو توڑنے میں انتہائی تدبر سے کام لیا جس کے لئے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام یا بغاوت و شورش کا الزام عاید کیا جائے۔

معاویہؓ بڑے جہاندیدہ انسان تھے وہ حسینؑ کے اس سکوت کو اپنے اقتدار کی شکست کا مترادف سمجھ کر بے چین تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اگر ہم سختی کریں گے تو وہ اس شکست کی انتہائی تکمیل ہو گی اس لئے حسینؑ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں۔ اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہؓ کا مطلب تھا کہ ہم تشدد سے کام بظاہر نہ لیں اور حسینؑ کی خاموشی بھی قائم نہ رہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ کربلا کی جنگ یہیں سے شروع ہوتی ہے مگر ایک صبر آزما اور روحانی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی اگر معاویہؓ کا رشتہ عمر قطع نہ ہوتا اور نوعمر ناتجربہ کار، غرور سلطنت سے بدمست یزید تخت سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

حسینؑ کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی معاویہؓ کو بھی اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو مگر معاویہؓ کو بظاہر تشدد کے نتیجے کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا۔ یزید نے حسینؑ کی خاموشی کو طاقت و اقتدار سے توڑنا چاہا اور بجبر آپ سے بیعت لینے کی خواہش کی۔

ولید بن عتبہ جو مدینہ میں اس کا گورنر تھا اسے وفات معاویہؓ کی اطلاع کے ساتھ ہی یہ پیغام بھیجا کہ جلد سے جلد حسینؑ بن علیؑ سے میری بیعت لو اگر بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بھیجدو۔ یہ تھا وہ پہلا اقدام تشدد کا جو یزید کی طرف سے اٹھایا گیا اور اگر ولید اس حکم کی پوری تعمیل کرنا چاہتا تو مدینہ ہی کربلا بن جاتا۔ امام کے سامنے اس مطالبہ کا اس طرح پیش ہونا گویا حسینی تدبر کی پہلی فتح اور اموی سیاست

کی ابتدائی شکست تھی اس نے سمجھا تھا کہ حسینؑ کی بیعت سے علیحدگی ایک وقتی بات ہے جو اس دھمکی سے فوراً قبول بیعت میں تبدیل ہو جائے گی اور یہ حسینؑ نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ سوچ سمجھ کر اس کے تمام آخری نتائج کا اندازہ کر لینے کے بعد اختیار کیا تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی مقاصد حدود وامتیازات میں کس طرح تبدیلی ہو گئی ہے مگر اس پر ابھی تک ظاہری اسلام کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس لئے عام اشخاص اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ حسینؑ چاہتے تھے کہ فریق مخالف کو تشدد کے آخری درجہ پر پہنچا کر اس کے غیر انسانی جذبات کو اس طرح نمایاں ہونے کا موقع دیں کہ عوام کو اس کا قرار واقعی احساس پیدا ہو جائے۔ اور آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں۔

امام حسینؑ کے لئے اپنے مقصد کے حصول کا سوائے اس کے کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ اپنی جان بچا لیتے مگر جان کو بہرحال بچانا ہوتا تو وہ شروع ہی سے بیعت سے انکار نہ کرتے جان کا بچانا انہیں مدنظر تھا اسی حد تک کہ ان کے اصول اور مقصد کا بھی تحفظ ہو لیکن اگر مقصد کا تحفظ جان کے دینے پر موقوف ہو تو پھر اُن کے نزدیک جان کا دے دینا آسان امر تھا۔ مقصد کے لئے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک فریق مخالف سے مل کر شرائط صلح کے ذریعہ دوسرے جنگ کر کے فتح و غلبہ حاصل کرے یہ دونوں طریقے امام کے لئے ناممکن تھے صلح کی منزل خود امام حسنؑ طے کر چکے تھے اور شرائط صلح کی مخالفت ہی اب وہ صورت حال تھی جو امام حسینؑ کے سامنے تھی حالانکہ معاویہؓ اپنے کردار کے ذریعہ سے بہ نسبت یزید کے کہیں اونچا درجہ رکھتے تھے۔ پھر جب معاویہؓ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام ہوئی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنی؟ جب کہ یزید کے افعال وہ تھے جو کھلم کھلا اسلامی اصول و قوانین کے ساتھ جنگ رکھتے تھے۔ یہاں اسلام کے ظاہری رسوم نماز روزہ وغیرہ کا بھی پتہ نہ تھا اور نکاح وازدواج کے اصول و قوانین کی بھی مراعات نہ تھی اور اسلام کے منہیات

مثلاً شراب وغیرہ کا ظاہر بظاہر ارتکاب تھا اور اس کے ساتھ اسلامی خلافت کا دعویٰ تھا۔ موجودہ حالات میں اگر حسینؑ بھی جو کہ اسلامی تمدن کے محافظ تھے یزید کی بیعت کر لیتے اور مصلحت سے کام لیتے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کا تمدن و تہذیب اور اصول معاشرت مستقل طور سے یہی دستور سمجھا جاتا کہ جس طرف بنی امیہ کی سیاست لئے جا رہی تھی اور جس کا یزید اپنے وقت میں بہترین نمونہ تھا۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ حسینؑ کے واقعہ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوتے رہے جن کا یزید ارتکاب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن و اصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے تھے وہ بالکل انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا کوئی ذہنی اثر افراد جامعہ پر نہیں پڑتا۔ یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے کہ اسی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے اسلام کے حقیقی اقدار کا کربلا میں نہ مٹنے والا نمونہ پیش کر دیا۔ اور اس کی آئینی اہمیت کو انتہا درجہ واضح کر دیا ہے۔ اب اگر اسلام کے دامن پر دھبہ لگانے کے لئے سلاطین بنی امیہ و بنی عباس کی مثال پیش کی جائے تو فوراً اسلام کی جانب سے صفائی پیش کرنے کے لئے حسینؑ کا اقدام تاریخ کے صفحات پر سامنے آ جاتا ہے۔

یزید اور امام حسینؑ کے مقاصد بالکل مختلف اور متضاد تھے وہ جاہلیت کے مادی دور کے پلٹانے کا علمبردار حسینؑ روحانیت اور انسانیت کو قائم کرنے کے ذمہ دار۔ وہ طاقت و اقتدار کا سکہ چلانے کا در پے اور حسینؑ حق و راستی کا علم بلند کرنے پر آمادہ۔ وہ اسلامی حدود و امتیازات کو مٹانے پر تلا ہوا اور حسینؑ اسلامی امتیازات کو باقی رکھنے پر کمربستہ!

پھر بھلا بتلائیے کہ امام حسینؑ اور یزید میں صلح کیونکر ہو سکتی تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ آپ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے اور فتح و غلبہ حاصل کر کے یزید کو شکست دیتے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ طاقت کے مقابلے میں آلِ رسولؐ کے ساتھی بہت کم نکلتے تھے۔ اس طرح کا تجربہ پورے طور پر حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے وقت میں ہو چکا تھا۔

پھر دنیا کی ذہنیت اتنی ماؤف ہو چکی تھی کہ اگر آپ فوج و لشکر جمع کر کے جنگ بھی کرتے تو جو اس کی واقعی حیثیت تھی اس کے سمجھنے والے بہت کم اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ یہ حکومت و سلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے۔ اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا اس لئے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور حسینؑ کا پلہ سبک ہوتا اس بنا پر کہ وہ ایک باغی کی حیثیت رکھتے تھے اگر اس صورت میں آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی جو بظاہر ناممکن تھی تو اس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا اثر دیرپا نہیں رہتا۔

اور بنی امیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اب بھی اسی طرح پڑا رہتا جیسے اس کے پہلے تھا اور کچھ لوگ حسینؑ کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطائے اجتہادی کا سارٹیفکٹ دے دیتے جیسا کہ اس کے پہلے صفین کی جنگ میں ہوا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو ان سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک ان سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اس وقت تک ان امتیازات و حدود کی مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی جنھیں بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

معلوم ہوا کہ صلح بھی ناممکن اور جنگ بھی!

پھر اب تیسرا راستہ کون سا تھا؟ وہی جسے حسینؑ نے اختیار کیا اور اگر حسینؑ اختیار نہ کرتے تو اس کا تصور بھی ہمارے لئے دشوار ہوتا۔

آپ نے اقتدار کا مقابلہ بےبسی سے، کثرت کا مقابلہ وحدت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کیا اور یہی وہ طریقہ جنگ تھا جس کا

مشاہدہ اس کے پہلے دُنیا نے نہیں کیا تھا۔ آپ کی نظر میں فتح و شکست کا مفہوم بالکل جُدا گانہ تھا فتح کے معنی یہ نہ تھے کہ آپ دشمن کی فوجوں کو پامال کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیں اور شکست کے یہ معنی نہ تھے کہ آپ کے ساتھ والے سب ختم ہو جائیں اور آپ بھی قتل ہو جائیں۔

آپ کے نزدیک فتح کے یہ معنی تھے کہ کہاں تک آپ اپنے اصول کی حمایت میں مصائب کا زیادہ مقابلہ کرتے ہیں اور کہاں تک آپ کا دشمن اپنے مقاصد کے تحفظ میں زیادہ تشدد سے کام لیتا ہے دشمن کے تشدد کا ہر قدم ایک مورچہ تھا جسے حسینؑ فتح کرتے تھے اور اس کا انتہائی متشددانہ اقدام حسینؑ کی اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک مکمل فتح تھی۔

اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسینؑ نے اپنے ساتھ بڑا سامان کیا تھا طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو فوج و لشکر کی تعداد میں اضافہ کرتے انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ تعداد کو تو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ مختصر بنایا۔

مگر انھوں نے اپنے ساتھ ایسے عابد و زاہد، متقی اور پارسا لوگوں کو لیا جن کی نیکی اور پاک دامنی زہد اور تقویٰ کا سارے ملک میں کلمہ پڑھا جاتا تھا۔

انھوں نے ایسے جوان اپنے ساتھ لئے جن کے شباب اور حسن و جمال کا نظیر نہ تھا۔ اور کچھ ایسے بچے بھی ساتھ لئے جن کے ہاتھوں میں تلوار اٹھانے کی طاقت نہ تھی بلکہ گہوارے میں لیٹے ہوئے شیرخوار بچہ تک کو اپنے ساتھ لیا اور پردہ نشین عورتوں کو جو رسول اللہؐ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور جن میں رسولؐ کی حقیقی نواسیاں بھی موجود تھیں اپنے ساتھ لیا۔

تم اس ساز و سامان سے سمجھ سکتے ہو کہ حسینؑ کا مقصد کیا تھا اور وہ کس طرح اپنے مخالف سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ یاد رکھو کہ حسینؑ کے ساتھ یہ وہ مشینیں گنیں تھیں جن کو حسینؑ بنی امیہ کے قصر استبداد

کے تباہ کرنے کا انتہائی طاقتور ذریعہ سمجھتے تھے اور بیشک ان کا خیال صحیح تھا۔ امام حسینؑ کے لئے بہترین اور مفید ترین یہی راستہ تھا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہ تھا۔



صدر آل پاکستان ذاکرین ایسوسی ایشن جناب مولانا علی سرکار نقوی امروہوی نے اپنے دولت کدہ پر سرکار سید العلماء سید علی نقی صاحب کے اعزاز میں استقبالیہ دیا جس میں مفتیٔ اعظم پاکستان جناب سید محسن نقوی۔ مولانا سراج الحسن اجتہادی، مولانا علی کرار نقوی نمایاں نظر آ رہے ہیں۔



مقصدِ حسین علیہ السلام

پھولوں کی سیج پر آرام کی نیند سونا آسان ہے مگر کانٹوں پر بستر لگائے رکھنا مشکل۔ خوشی کو ہر ایک کی طبیعت ڈھونڈتی ہے مگر غم کے ساتھ نباہ بہت دشوار ہاتھ میں لگی ہوئی پھانس تو جب تک نکل نہ لے چین نہیں آتا پھر دل میں چبھے ہوئے کانٹے کو سینہ سے لگائے رکھنا کہاں ممکن ہے اسی لئے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کربلا کا واقعہ بس ایک درد بھری کہانی نہیں تھا بلکہ اس میں انسانی زندگی کے جو اہم عنصر تھے جب ہی انسانوں کی دنیا میں اس کا چرچا ہوا، رہا اور پھیلتا رہا۔

اس وقت جبکہ ہم حسینؑ کے مقصد کو سمجھنے اور سمجھانے کھڑے ہوئے ہیں دنیا کے بہت سے حصوں میں حسینؑ کا غم منایا جارہا ہے اور ۶۱ھ میں کربلا کی سرزمین پر جو قربانی دی گئی ہے اس کو آج تیرہ سو انتالیس برس ہوچکے ہیں اور اب ایک برس کے بعد ۱۴۰۰ھ کا محرم آئیگا اس لمبی مدت میں زمانے نے کتنی کروٹیں لیں۔ آندھیاں چلیں اور نکل گئیں سیلاب آئے اور گزر گئے مگر حسینؑ کی یاد تازہ اور زندہ رہی اور آج بھی زندہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کے نام اور ان کے کام نے نوع انسانی کے دل میں گھر کرلیا ہے۔ لب پر حسینؑ کا نام، ہر دل میں حسینؑ کی یاد اور دماغ کو حسینی مقصد کی تلاش ہے۔ شخصی اور ذاتی مقصد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی کو کیا پڑی تھی کہ زندگی اس کی یاد میں صرف کرے کسی مصیبت کے ستائے کو دیکھ کر نگاہ مڑجانا یا دل میں ہمدردی سے کسک پیدا ہونا بالکل ایک وقتی چیز ہے مگر اسے کوئی مستقل حیثیت نہیں مل سکتی۔ حسینؑ کا مقصد نوع انسانی سے وابستہ تھا اور اجتماعی حیثیت رکھتا تھا

اس لئے انسانیت نے اپنا دل چیر کر اس کی یاد کو محفوظ کر لیا۔

اب آپ چاہتے ہوں گے کہ میں اس مقصد کو کھلے لفظوں میں بیان کر دوں اچھا سُنئے! مگر آپ کو میرے ساتھ تھوڑی دور تک چلنا پڑیگا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہوگا کہ حضرت محمد مصطفےٰؐ نے تمدن اور معاشرت اور آئین زندگی میں ایک انقلاب کا پیغام پہنچایا جس کا نام تھا اسلام! اسلام نے زندگی کے ہر حصّے میں بہت اہم تبدیلیاں کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نوع انسانی کو برادری اور برابری کا سبق پڑھایا وہ حدود، امتیازات جو انسانوں میں قائم ہو گئے تھے جن سے خدا کی مخلوق اونچے اور نیچے کے دو درجوں میں تقسیم ہو گئی تھی ان تمام امتیازات پر اسلام نے قلم پھیر دیا۔ اور تمام آدمیوں کو ایک اکیلے خدا کی پرستش کی دعوت دی۔

کون نہیں جانتا کہ دنیا میں "طاقت حق ہے" کا کلمہ ہمیشہ پڑھا گیا اور رائج ہے کہ آج جبکہ دُنیا تمدن اور تہذیب میں بڑے اونچے درجے پر بتلائی جاتی ہے آج بھی طاقت ہی کا بول بالا ہو رہا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نوع انسانی کے پرخچے اُڑ رہے ہیں اور انسانیت کے دامن کی دھجیاں ہوا میں تتر بتر دکھائی دیتی ہیں۔

عرب میں عصبیت یعنی قوم ونسل کے امتیاز کا خیال بڑا غالب تھا وہ اپنے سامنے غیر عرب کو انتہائی ذلیل سمجھتے تھے اور خود آپس میں قانونی احکام اور فوجداری کے قوانین و تعزیرات تک میں بڑے اور چھوٹے کا فرق قائم کر لیا تھا۔ بڑے آدمیوں کی جانیں بہت مہنگی سمجھی جاتی تھیں اور چھوٹے آدمیوں کی سستی جانیں تول میں ان کے برابر نہیں سمجھی جاتی تھیں ان میں مال و دولت، قوم و قبیلے کی کثرت۔ خاندانی جاہ و حشمت وہ چیزیں تھیں جو عزت کا معیار سمجھی گئی تھیں اور جو لوگ ان چیزوں سے محروم تھے ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔

یہ طاقت کی پوجا ہزاروں طرح کے اجتماعی گناہوں کی جڑ تھی اور

بہت سی خرابیوں کے سوتے اسی ایک سرچشمہ سے پھوٹ رہے تھے۔

حضرت محمد مصطفےٰؐ نے آکر پہلی ہی دفعہ ان حسب و نسب اور امتیازات کو ختم کیا اور بڑائی کا ایک نیا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ آدمی سب ایک ہیں۔ فرق ہے تو انسانی فرائض کے ادا کرنے کے ساتھ، جو ان فرائض کو سب سے زیادہ ادا کرتا ہے وہی سب سے بڑا آدمی ہے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی اس سے تمام ان لوگوں کے اقتدار کو کاری ضرب لگی۔ جو عزت و اقتدار کے بٹوارے میں پہلے کافی حصہ رکھتے تھے انھوں نے ڈٹ کر اسلام کا مقابلہ کیا اور پیغمبرؐ کو ان کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں اس سلسلے میں بدر، اُحد اور خندق کی لڑائیاں مشہور ہیں اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان لڑائیوں میں رسولؐ کے مقابلے میں قبیلہ بنی اُمیہ کا لیڈر ابو سفیان آگے آگے تھا۔ پیغمبرؐ کو فتح ہوئی اور یہ لوگ ناکام ہوئے آخر میں ان کو ہتھیار ڈال دینا پڑے اور حضرت محمد مصطفےٰؐ کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔ پیغمبرؐ کے زمانے میں کسی کو یہ موقع نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اسلام کے اصول میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ آپ اپنے مشن کے بڑی سختی کے ساتھ خود پابند بھی تھے اور دوسروں کو پابند بناتے بھی تھے اس وقت جب عرب کے تمام قبیلوں کی طرف سے روپیہ پیسہ کھنچ کر آپ کے پاس آتا تھا اور ہزاروں آدمی آپ کا حکم ماننا اپنے لئے فخر سمجھتے تھے اس وقت بھی آپ نے فقیروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، پھٹے پرانے کپڑے پہننا اور ملنے والوں سے برابری کا برتاؤ کرنا نہیں چھوڑا آپ نے اپنی مسجد کا مؤذن ایک حبشی کو بنایا تھا جسے عرب لوگ بہت ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر رسولؐ نے اس کو بڑی عزت دے رکھی تھی۔ آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن کی شادی ایک آزاد کئے ہوئے غلام کے ساتھ کر دی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آپؐ نے اسی غلام کے لڑکے کو بڑے اونچے خاندان والے عربوں کا سردار بنا دیا اس پر لوگ بہت جز بز ہوئے۔ مگر آپؐ نے ایک نہ سنی اور اپنی بات پر قائم رہے۔ جن لوگوں کی آپ بڑی تعریف کرتے تھے اور انتہائی عزت کرتے تھے

بہت سے ان میں سے غریب کمزور اور پردیسی لوگ تھے۔ سلمان فارسیؓ جو ایران کے رہنے والے تھے رسولؐ کے ساتھ اتنی خصوصیت رکھتے تھے جو کسی دوسرے کو مشکل سے حاصل تھی یہ سب اس لئے تھا کہ ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو اور انسانیت سونے چاندی کے گنگا جمنی طوق اور زنجیروں کی قید سے آزاد ہو۔

افسوس کہ پیغمبرؐ کی زندگی نے زیادہ ساتھ نہ دیا اور آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ کا مشن اس حیثیت سے مکمل ہو گیا تھا۔ آپ نے اس کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور کچھ لوگ عملی طور سے اس کے پابند ہو گئے مگر آپ کو معلوم ہے کہ جمہور کی ذہنیت کی تبدیلی اور اس تبدیلی کے راسخ ہونے کے لئے بہت بڑی مدت درکار تھی۔ رسولؐ کے بعد ابھی تھوڑے دن گزرے تھے کہ بنی امیہ کے اقتدار کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہ شروع شروع میں ایک صوبہ کے گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ رفتہ اس کے اثر اور نفوذ میں ترقی ہوتی گئی۔

شام میں اس خاندان کا اقتدار بالواسطہ اس جماعت کا اقتدار تھا جو ہمیشہ پیغمبر اسلامؐ سے لڑتی رہتی تھی اور آخر میں بے بسی سے سر اطاعت جھکانے پر مجبور ہوئی تھی۔

اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس جماعت کے منصوبے اپنے برسر اقتدار آنے کے بعد کیا ہونے چاہئیں؟ معمولی دل و دماغ بھی کہے گا کہ ان ہی امتیازات کو واپس لانا جنھیں پیغمبرؐ اسلام نے مٹا دیا تھا اور جن کا اثر اس جماعت کے اقتدار پر بہت گہرا پڑا تھا، مگر چونکہ اس جماعت کا اقتدار اب اسلام کے سائے میں اسلام کی نمائندگی میں حاصل ہوا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ یہ اس پردے ہی میں اپنے منصوبوں کی تکمیل کریں اور یہ اس سے زیادہ خطرناک تھا کہ یہ کھل کر ایک دشمن کی حیثیت سے اپنے مقاصد کا اعلان کر دیتے۔

سمجھنے والوں نے سمجھا کہ اسلام کی سادگی اور اسلام کی مساوات کے

بجائے ملوکیت اور جہانبانی کی شان پیدا ہو رہی ہے اور سرمایہ داری کی بنیاد پڑ رہی ہے۔۔ اس پر احتجاج بھی ہوا اور احتجاج کا نتیجہ تھا ابوذر غفاری رضؓ کا جلاوطن کیا جانا۔ ربذہ کے جنگل میں بھیجا جانا اور رسولؐ کے اس صحابی کا اکیلے دم توڑنا اور دُنیا سے گزر جانا یہ ابتدا ہے اس جنگ کی جس کی تکمیل کربلا میں ہوئی۔

زمانے نے ایک کروٹ ایسی بدلی کہ شہنشاہی حضرت علیؑ کو حاصل ہوئی آپ کو سیاسی اقتدار حاصل ہوتا اس سادگی اور مساوات کے اصُول کے نئے سرے سے علمداری ہو جاتا تھی جو رسولؐ اسلام نے قائم کیا تھا اسی لئے مخالف جماعت نے بغاوت کی اور تابڑ توڑ کی شورشوں اور لڑائیوں میں آپ کو ایسا الجھایا گیا کہ آپ ان مقاصد کو پورا نہ کرسکے جو آپ کے سامنے تھے آخر مسجد میں علیؑ کا سر تلوار سے دو ٹکڑے ہو گیا اور اسلامی مساوات کا وہ مشنری دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آپ کے بیٹے حضرت حسنؑ کو زمانہ وہ ملا جب شام کی حکومت کو بڑی قوت حاصل ہو چکی تھی، آپ نے جنگ کے ذریعہ سے کامیابی کی کوئی صورت نہ پائی تو صلح کر کے مخالفت کی جارحانہ کارروائیوں کو اصُول کے شکنجہ میں قید کیا اور آپ نے دور اندیشی سے کام لے کر یہ بڑی شرط رکھی کہ شام کے حاکم کو اپنے بعد کسی کے جانشین بنانے کا حق نہ ہوگا بلکہ اس کے بعد حکومت بنی ہاشم کی طرف واپس آئے گی۔ یہ ایسی شرط تھی جس نے مستقبل کو کسی حد تک محفوظ کر دیا تھا۔ مگر سیاست کی دُنیا میں سچائی اور وعدے کی پابندی تو کوئی چیز ہے نہیں۔ وہ وعدے کئے جاتے ہیں توڑنے کے لئے اور معاہدے لکھے جاتے ہیں ردّی کی ٹوکری میں پھینکنے کے لئے۔ وہی ہوا جو اس طرح کی سیاست کا تقاضا تھا شرطیں کہاں کی اور کیسا معاہدہ۔ حضرت امام حسنؑ کی زندگی آخری مقاصد میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔ آپ کو پراسرار طریقہ پر زہر سے شہید کر دیا گیا یہ بھی ایک قربانی تھی جو اسلامی تمدن کی قربان گاہ پر نذر ہو گئی۔

اب ان لوگوں میں جو اسلامی تمدن کے محافظ ہو سکتے تھے صرف حسینؑ ذات باقی تھی۔ ظاہری طور پر اب آپ کو قدم آگے بڑھانے کا کوئی موقع نہ تھا وہ پورا جتھا جس کو ساتھ لے کر شام کی طاقت سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا امام حسنؑ کی صلح کے بعد بکھر چکا تھا اور اب اس کے اکٹھا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سیاست حاضرہ کی غیر اسلامی چال دیکھ کر دم گھٹتا تھا مگر آپ منتظر تھے کہ معاویہؓ اپنے بعد کے لئے کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس مدت میں حق کے پجاری بالکل چپ رہے نہیں اس سخت اندھیری رات اور اس کے سناٹے میں کبھی کبھی ادھر ادھر سے چیخ کی آواز سنائی دے جاتی تھی مگر وہ آواز اسی طرح دبا دی جاتی تھی جس طرح آپ سنتے ہیں کہ ہٹلر اپنے ملک میں ہر مخالف کی آواز کو دبا دیتا تھا۔ عمرو بن الحمق الخزاعی اور حجر بن عدی اور ان کے دس گیارہ ساتھیوں کا انجام تاریخ میں آپ کے سامنے ہے۔ یاد رکھئے کہ ان لوگوں کو حاکم شام سے کوئی خاندانی عداوت نہ تھی وہ صرف اصول کا اختلاف تھا جس نے کائینات کی اس وسیع فضا میں ان کے لئے جگہ باقی نہ رکھی۔

حضرت امام حسین علیہ السّلام نے ان واقعات پر احتجاج ضرور کیا مگر پھر بھی آپ دیکھ رہے تھے کہ آخری شرط کا کیا انجام ہوتا ہے۔

لیجئے آ گیا وہ وقت کہ امیر معاویہؓ نے اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کو جانشین بنا دیا یہ اس مفاد کی آخری پامالی تھی جسے معاہدہ کے شرائط میں محفوظ کیا گیا تھا۔

یزید کے افعال بھی ایسے تھے جو اسلام کے احکام سے کھلم کھلا بغاوت کے مترادف تھے۔ امام حسینؑ نے اس کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔

معاویہؓ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ متعلق ہستی حسینؑ کی ہے اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ آپ کو ملا لیا جائے مگر یہ کوشش ناکامیاب ہوئی۔ امام حسینؑ نے صاف کہہ دیا کہ میں اس کارروائی سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ امیر معاویہؓ نے آپ کے ساتھ اس

اکاام پر زیادہ سختی نہیں کی مگر معاویہ رضی کا انتقال ہوگیا اور یزید تخت حکومت پر بیٹھا تو اس کے سامنے سب سے پہلے یہی مسئلہ تھا کہ حسینؓ سے بیعت لو۔ نہیں تو انھیں قتل کردو۔ یہ پہلا ہی تشدد کا قدم تھا جو حسینؓ کے خلاف اٹھایا۔ حسینؓ اس کے لئے بالکل تیار تھے انھوں نے کہا کہ میری جان جائے مجھے گوارا ہے مگر میں اس سلطنت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کروں گا۔

وقت وہ تھا جب احساسات بالکل مر چکے تھے فضائیں کامل سناٹا تھا جن لوگوں سے مخالفت کا اندیشہ ہوسکتا تھا ان میں کچھ کا گلا گھونٹا جا چکا تھا اور کچھ کے ضمیر خرید کر ان کی زبانوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ سنہری تلوار کی جھنکار اور روپیہ، اشرفی کی کھنک نے بڑے بڑوں کے دل ڈانواں ڈول کر دیئے تھے اس وقت حسینؓ اس آخری اقدام کے لئے تیار ہو رہے تھے جو بنی امیہ کے استبداد کے قصر کو زمین پر گرا دے۔

امام حسینؓ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے انھوں نے جنگ کا ایک نیا طریقہ نکالا جو ان سے پہلے دنیا نے نہیں دیکھا تھا۔ وہی ان کے مقصد کے لئے زیادہ مفید اور کارگر بھی تھا وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں ان میں ذہنی جمود پیدا ہو گیا ہے ان کے احساسات پر غشی چھا گئی ہے ان میں یہ شعور باقی نہیں رہا کہ بنی امیہ کے افعال و اعمال اسلامی طریقہ کے خلاف ہیں۔

بڑا سبب اس کا اسلام کے نام کی وہ نقاب ہے جو ان کے چہروں پر پڑی ہوئی ہے حسینؓ چاہتے تھے کہ ایک ایسا شدید چھینٹا دیں کہ ان کے احساسات پھر یری لے کر ہوش میں آجائیں اور چہرے کی یہ نقاب ہٹ جائے اور اس کے اصلی خط و خال سامنے آجائیں اور دنیا دیکھ لے کہ اس ملوکانہ سیاست کے انتہائی قدم کہاں تک جا سکتے ہیں انھوں نے اس کے لئے فوج اور لشکر جمع نہیں کیا انھوں نے وہ عابد و زاہد اور متقی لوگ ڈھونڈے جن میں کا ہر شخص اپنے اخلاق و اوصاف کی بلندی سے سچے اسلام کا نمائندہ تھا اور ملک میں جس کے زہد اور پارسائی کا ہر شخص

کو اقتراف تھا۔ انھوں نے رسولؐ کے خاندان کے جوان اور بچے، یہاں تک کہ دودھ پیتا بچہ تک اپنے ساتھ لے لیا اور رسولؐ کے گھرانہ کی معزز عورتیں جن میں خاص رسول اللہ کی حقیقی نواسیاں موجود تھیں اپنے ہمراہ لیں۔ حسینؑ نے اپنے دشمن کی فطرت کو خوب پہچان لیا تھا وہ اس کے تشدد کے امکانات میں کافی اضافہ کر رہے تھے دنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ نے جو سامان اپنے ساتھ لیا تھا وہ سب حسینی مقصد کی تکمیل میں صرف ہوا۔

بوڑھے قتل ہو گئے۔ جوان قتل ہو گئے۔ بچے قتل ہو گئے۔ دشمن کے تشدد کا آخری تیر باقی تھا۔ حسینؑ نے اس کے لئے بھی نشانہ ڈھونڈھ لیا تھا۔ ربابؑ کی گود سے چھ مہینہ کا بچہ لے لیا سب سے آخر میں اپنی گردن کو بھی پیش کر دیا۔ شاہزادیوں کو قید ہونے کے لئے اپنے بعد چھوڑا۔ یہ سب ہوا اور سمجھ بوجھ کر ہوا۔ حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یزیدیت اور اسلام دو الگ چیزیں ہو گئیں۔ حسینؑ کا مقصد بھی بس یہی تھا وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن پر جو اموی شہنشاہیت کا رنگ چڑھ رہا ہے جس سے اس کے حدود امتیازات مٹتے جاتے ہیں یہ رنگ اتر جائے دنیا یہ سمجھ لے کہ اسلامی تمدن وہ نہیں ہے جو دمشق کے دارالامارہ میں نظر آتا ہے۔ جہاں شراب کے جام چل رہے ہیں اور مہوشوں کا جھرمٹ لگا ہوا ہے جہاں تمام رعایا سے لے کر دولت سمیٹی جاتی ہے اور وہ خلیفہ کی رنگ رلیوں پر صرف ہوتی ہے جہاں طرب و نشاط کے نقارخانہ میں غریبوں کی صدا سنی نہیں جاتی اور جہاں انصاف کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے۔ حسینؑ نے دکھلایا کہ اسلام کا تمدن وہ ہے جسے کربلا کے میدان میں پیش کر دیا گیا جہاں ایک حبشی غلام بھی زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتا ہے اور امام کو آواز دیتا ہے تو امام اس کے سرہانے جاتے ہیں اور سر اٹھا کر گود میں رکھتے ہیں۔ غلام کی روح آقا کی گود میں جسم سے مفارقت کرتی ہے۔

یزیدی طاقتیں دُنیا میں بہت پیدا ہو سکتی ہیں اور ہر قوم میں پیدا ہوتی ہیں مگر حسینی مشن جو کربلا کی زمین پر پایۂ تکمیل کو پہنچا وہ ہر زمانہ میں یزیدیت کی شکست کے لئے کافی ہے۔ اس شرط سے کہ حسینؑ کے کارنامے کو دُنیا یاد رکھے۔ اور اس سے سبق حاصل کرے۔



عزائے مظلوم

دسویں محرم سنہ ۶۱ھ میں زمین کربلا پر کونسا عظیم واقعہ ہو گیا جس پر اب تک چشم عالم خونریز ہے؟ نینوا کی گرم زمین پر کس مظلوم کا خون بہایا گیا جس کا آج تک ماتم ہے۔ مسلمان جانتے ہیں کہ وہ رسولؐ کا نواسہ فاطمہ زہراؑ کی گود کا پالا، امیرالمومنینؑ کا جگر گوشہ تھا جس کا خون بو میدانِ اسلام کے ہاتھوں تین دن کی بھوک پیاس میں حصہ تیر و نیزہ و شمشیر ہو گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ عالم کی خاموشی کائنات نے اس کا کتنا اثر لیا؟ تاریخیں بتلائیں گی۔ اور مسلمۃ الثبوت علمائے اہلسنّت کے اقوال اس کی تصریح کریں گے ابن حجر مشہور عالم اہلسنّت شرح قصیدہ حزنیہ میں لکھتے ہیں کہ روز قتل حسینؑ جو علامات ظاہر ہوئیں اُن میں سے یہ تھا کہ آسمان نے اشک خونیں برسائے اور ظروف خون سے مملو ہو گئے آفتاب کو گہن لگنے سے آسمان اتنی شدت سے تاریک ہوا کہ ستارے دکھائی دینے لگے اور سیاہی اتنی بڑھی کہ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ قیامت آ گئی اور تارے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے اور جو پتھر اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے سے خون اُبلتا دکھائی دیتا تھا اور دنیا میں تین دن تاریکی رہی پھر سُرخی ظاہر ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ چھ مہینے تک دُنیا سُرخ رہی اور اس کے بعد کبھی بالکل اثر سرخی کا زائل نہ ہوا۔

یہ شیعی روایت نہیں ہے ممکن ہے آج کل کے تعلیم یافتہ افراد اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیں بہر حال یہ ماننا پڑے گا کہ ایک غیر معمولی اہمیت اس مصیبت کی ثابت ہوئی تھی ورنہ اس قسم کی روایات اس حلقے میں بیان نہ کی جاتیں جیسے امام حسینؑ اور ان کی شہادت کے متعلق کسی بات کے بڑھا کر کہنے یا اپنے دل سے بنانے کی ضرورت نہ تھی اب یہ

سوال کرنے کا عام مسلمانوں سے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جس مصیبت پر جمادات و غیر ذوی العقول نے حکم خدا سے خون کے آنسو بہائے اس پر ذی شعور انسان کیوں نہیں گریاں ہوتے رسولؐ کے سچے کلمہ گو یوں کہ رسولؐ کے محبوب نواسے کے قتل سے کیونکر صدمہ نہ ہوگا۔

کہہ دینا آسان ہے کہ ہم زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے۔ مگر کائنات عالم نے اس فلسفے کا درس نہیں حاصل کیا تھا۔

یہ وہ مفہوم تھا جس کے غم میں سرور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قبل وقوع واقعہ شہادت روئے۔ اس کو غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے غنیۃ الطالبین میں تحریر فرمایا ہے۔ حضرت ام سلمہ کی زبانی!

"حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ رسالتمآبؐ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ ناگاہ امام حسینؑ داخل ہوئے۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کو دیکھا اس صورت سے کہ حسینؑ سینہ رسولؐ پر کھیل رہے ہیں اور رسالتمآبؐ کے ہاتھوں میں کچھ مٹی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ جب حسینؑ چلے گئے تو میں نے رسالتمآبؐ سے دریافت کیا کہ آپ کے رونے کا کیا سبب تھا؟ حضرتؐ نے فرمایا اس وقت جب حسینؑ کو دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا تو جبرئیلؑ آئے اور مجھے وہ مٹی دی جس پر حسینؑ قتل کیا جائے گا پس میں رونے لگا۔

علامہ حجر مکی نے صواعق محرقہ میں اس طرح کی روایت حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی زبانی نقل کی ہے۔

"پھر جبکہ رسالتمآبؐ اس واقعہ جاں سوز پر قبل وقوع روئے تو ہمارا رونا بعد وقوع کیونکر نامناسب ہو سکتا ہے اس کے بعد جس روز شہادت حسینؑ کا واقعہ پیش آیا اس دن ام سلمہؓ نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں اور آپ کے سر و ریش مبارک پر خاک ہے۔ ام سلمہ نے دریافت کیا تو فرمایا "کہ ابھی حسینؑ قتل ہوئے ہیں۔ ایسا ہی خواب ابن عباس نے بھی دیکھا۔ یہ دونوں روایتیں صحیح ترمذی میں ہیں جو کہ

صحاح ستہ میں داخل ہے۔

گریہ وزاری اور ماتموں کی صورت جاننے کی سند کے لئے تو یہ کافی ہے کہا جائے گا کہ شیعہ، علم تعزیہ وغیرہ مختلف طرح کی شبیہیں بناتے ہیں یہ جائز نہیں ہے سوال ہوتا ہے کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں یعنی رسالتمآب کے زمانے میں ان کا پتہ نہ تھا مگر بہ تصریح علمائے اہل سنت بدعت واجب و مستحب و مباح بھی ہوتی ہے صاحب بحر المذاہب نے صاف لکھا ہے کہ بدعت کو قواعد شریعہ کے سامنے پیش کرنا چاہیئے اگر وہ قواعد وجوب میں داخل ہو جائے تو واجب۔ اگر استحباب کے قواعد میں آجائے تو مستحب اور اسی طرح مکروہ۔ مباح اور حرام۔ پھر ہر ایک کی مثالیں بھی دی ہیں۔ بدعت واجب کی مثال علم نحو کا سیکھنا۔ کیونکہ قرآن و حدیث کا سمجھنا اس پر موقوف ہے اور اسی طرح اصول فقہ کا علم۔ بدعت مندوب۔ مدرسوں کا بنوانا اور وہ امر خیر جو زمانہ رسول میں جاری نہ تھا اسی میں داخل ہے۔ تراویح اور دقائق تصوف میں کلام اور محافل کا جمع کرنا۔ مناظرہ کے لئے پھر جب یہ صورت ہے تو تعزیہ و ضریح کا بنانا صرف بدعت ہونے کی وجہ سے ناجائز کیوں ہو جائے گا۔ اگر کہا جائے کہ یہ تجسیم تصویر ہے اس لئے قاعدہ حرمت کے تحت میں داخل ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جاندار چیزوں کی تصویر بنانا حرام! مگر بے جان چیزوں کی تصویر بنانا جائز ہے جس کی تصریح صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیثوں میں موجود ہے۔ پھر تعزیہ و ضریح تو کسی جاندار شے کی تصویر نہیں ہے۔

اب رہ گئی یہ بحث کہ اچھا تعزیہ اور ضریح بنانا جائز سہی مگر اس کی تعظیم کرنا۔ بوسہ دینا اور اس سے اظہار خلوص کرنا کہاں تک درست ہے؟ اس کے متعلق صرف اتنا کہوں گا کہ یہ جذبات محبت سے وابستہ ہیں جس کو کسی شخص سے محبت ہو تو وہ اس کے ساتھ نسبت رکھنے والی چیز کی عزت کرتا ہے۔

خود رسالت مآبؐ کی ایک حدیث سے جو فتاوے عالمگیری وغیرہ میں

درج ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ والدین اگر موجود نہ ہوں تو ان کی قبر کو بوسہ دے اور قبر کا پتہ نہ ہو تو زمین پر دو خط کھینچ کر ایک کو قصد کرے کہ گویا وہ ماں کی قبر ہے۔ اور ایک گویا باپ کی قبر ہے پھر ان دونوں کا بوسہ لے۔!

یہ کیا ہے؟ صرف انتساب کی عزت ہے پھر تعزیہ اس حیثیت سے کہ وہ منسوب ہے۔ روضۂ حسینی کی طرف اگر قابل عزت سمجھا جائے تو کیا گناہ ہے۔

"حسینیت زندہ باد"

(ہفت روزہ شیعہ لاہور جنوری ۱۹۶۹ء)





حیاتِ ابدی

اُموی تدبر اور شامی سیاست نے سنہ ۶۰ھ ہی میں اسلام و مسلمین کے لئے ایسا دورِ سیاہ پیدا کر دیا تھا کہ اس مدت سے ایسا کالا دن اس سے پہلے اسلام کی تاریخ نے نہ دیکھا تھا اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو ایسی گھٹا ٹوپ تاریکی چھاتی جس کے کسی طرف بھی چشمۂ حیات کا وجود نہ ہوتا۔ ذریۂ ہندہ کی ہر قید سے آزاد کوششیں یزید کو تخت پر لے آئیں اور دنیا کی زبان سے "امیر المومنین" اور "خلیفۃ المسلمین" کے القاب بجبر مانگ لئے بہت جلد اقتدار یزید نے عہدِ عریاں پیدا کر دیا اب وہ عشرت کی پناہ گیریاں آگئیں جہاں دینداری نقل کے طور پر بھی استعمال نہ ہوتی تھی ہائے اس مدت کی بدنصیبی جس کا مطلق العنان آمر یزید ہو۔ آہ ایسا کمینہ کار جانشین پیغمبر سمجھا جائے اس سے زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ اس رند مشرب کے ہاتھ پہ ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے بخوشی یا بجبر وفاداری کی بیعت کر لی۔ اور اسلام کے نظم و نسق کا اس کم ذات کو وارث تسلیم کر لیا۔ حالات یہاں تک خطرناک ہو گئے اور بہت تیزی سے یہ خطرات رونما ہوئے کہ اگر یزید نے روزِ روشن کو شب کہہ دیا تو حاشیہ نشینوں نے ماہ و پروین بھی فلک پر پیدا کر دیئے۔ یزید کے اس تسلط عام نے اسلامی زندگی کا معیار ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ اسلام کی وہ روحانیت جس نے پیکر مردہ کے ساتھ مسیحائی کی تھی۔ اسلام کا وہ زریں تفکر جس نے طالبان رشد و راستی کے دل و دماغ روشن کئے تھے طاق نسیاں کے نقش و نگار بنائے جا رہے تھے جو باتیں اسلام نے ہزاروں پردوں میں کبھی منظور نہ کی

تھیں وہ آج کھلے خزانے علانیہ ہو رہی تھیں اور حکومتِ وقت ان کی سرپرست تھی۔ ظاہر ہے ایسے پُر آشوب دور میں حق و صداقت کی بیکسی کس بیچارگی میں ہوگی وہ اسلام کی جس کی بنیاد مظلوم کی طرف داری پر رکھی گئی تھی آج اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے جو ظلم و جور کو بُرائی کی فہرست میں سمجھتا ہی نہیں بلکہ اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے بہترین ذریعہ جانتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ہر برائی ظُلم کے خفیف سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ظلم کو ظلم نہ سمجھنا تمام برائیوں کا مرکز ہے جب حالات کی رفتار اس منزل تک آگئی ہو تو اُس کا جو کچھ نتیجہ ہو سکتا ہے۔ وہ سب اس وقت ہو رہا تھا سچ ہے اس سے زیادہ اسلام پر اور سخت وقت کون سا ہو سکتا تھا یہ اسلام کی خوش بختی تھی کہ اسلام ابھی تک لاوارث نہیں تھا۔ ابھی حسینؑ موجود ہیں۔ وہ حسینؑ جو ابراہیمی امتیاز ہاشمی خصوصیات اور اسلامی نیکنامی کے اپنے زمانہ میں امین تھے۔ حق و صداقت کی نگرانی شجر اسلام کی نگہداشت بھی ان کا فریضہ تھا جس کو بخوبی امامؑ نے انجام دیا۔ اس حقیقت سے یزید بھی ناواقف نہ تھا اس لئے تختِ شام پر براجمان ہوتے ہی والئی شام کو پُر زور طریقہ سے لکھا۔

"جس طرح ممکن ہو حسینؑ ابن علیؑ سے
میری بیعت لے۔ اگر انکار کریں تو
ان کا سر میرے پاس روانہ کر دے۔"

یزید اپنی قہرمانی طاقت پر مغرور تھا سمجھتا تھا بہر طور میرا مدعا حاصل ہوگا۔ دونوں صورتوں میں کامیاب رہوں گا۔ (سید المتقین سے بیعت یزید کا مطالبہ بڑی جرأت انگیز بات ہے۔) سوالِ بیعت سامنے آتے ہی انکار فرما دیا۔ اس بیعت کا مطلب امام حسینؑ خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کے بدترین نتائج سے بخوبی آگاہ تھے۔ مآل اندیش حسینؑ نے کھلے ہوئے الفاظ میں فرمایا۔

"میں یزید کی بیعت کر دوں۔ ناممکن ہے! یزید اپنے کفر میاہ سے پے کو دیکھے

وہ اپنے نانا پیا کمردار کا جائزہ لے۔ بغیر سوچے سمجھے اس کو مجھ سے بیعت طلب کرنے کا کیا حق ہے۔؟ میں اس کی بیعت ہرگز نہ کروں گا۔"

یزید کی نخوت اس انکار کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کی ضد ہے کہ میں بیعت لے کر رہوں گا۔ حسینؑ کا فیصلہ ہے کہ یہ محال ہے۔

قسطائیت یزید نے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ایسی ستم آفرینی سے کام لیا جس سے فرعونیت بھی شرما گئی اور روح نمرود بھی بیقرار ہو گئی۔ امامؑ نے فرمایا "او ظالم تو اپنے ظلم و جبر پر نازاں ہے مجھے اپنی مظلومیت پر فخر ہے تو بے حد ستم ایجادی سے کام لے میں بے پناہ مظلومی سے اس کا مقابلہ کروں گا اور اس کا نتیجہ ساری دُنیا دیکھ لے گی۔

یزید کا خیال تھا کہ میں حسینؑ کو تہ تیغ کر کے آسودہ ہو جاؤں گا حسینؑ "شہید،، کی قدر و منزلت سے واقف تھے اسی لئے شہادت کو اپنا مطمع نظر قرار دے چکے تھے۔ جس کا ثبوت پیغمبر اسلام کی متعدد پیشگوئیوں اور خود امامؑ کے متعدد خطبوں میں پورا پورا موجود ہے۔ اسی لئے کہ دُنیا کی ہر چیز فانی ہے مگر شہید نہیں مرتا۔ وہ زندہ رہتا ہے اور ابدی حیات پاتا ہے۔ خون شہادت کا ہر قطرہ اپنے اندر حیات الٰہیہ کی بالیدہ روح رکھتا ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی اس کے مطلوبہ اور خوش آئند نتائج ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ مظلوم کے خون کا پہلا قطرہ جس وقت بہتا ہے معنوی فتح اس وقت حاصل کر لیتا ہے مقدس اقتدار۔ ارجمندی اور مبارک کامرانی شہید کا حصہ ہے۔ یہ تاج اس کا ہی ہے جو شہادت کے لالہ گوں خلعت سے آراستہ ہو جاتا ہے، دُنیا نے دیکھ لیا اور یزید بھی یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ امام حسینؑ کی زندگی یزید کے لئے اتنی مضر نہ تھی جس قدر خطرناک اس کے لئے حسینؑ کی شہادت ثابت ہوئی۔ کتنی جلد گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر "مالی وللحسین،، کہتا پھرا۔ یزید کی لغت میں آمد نفس کا نام زندگی تھا جس کی ہر طرح نگہداشت کر رہا تھا۔ مگر حسینؑ کی اصطلاح میں عزت و وقار کا نام زندگی ہے جس پر آمد و شد نفس

قربان کی جاتی ہے۔

بے شک ظاہر بیں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ امامؑ بے یار و مددگار یکہ و تنہا بیکس و مجبور زخموں سے سر تا پا چور کھڑے ہوئے ہیں کثرت جراحت سے تن ناز پروردۂ رسالت چھلنی ہو رہا ہے اور دل کانپ رہا ہے۔ ہاتھ لرز رہا ہے۔ تفصیل بتانے کی طاقت نہیں) صالح ابن وہب مزنی ملعون نے پہلوئے اقدس پر نیزہ مارا حضرت دائیں رخسار کے بل گھوڑے سے زمین پر گرے اور پھر کھڑے ہو گئے شمر لعین نے اپنے اصحاب کو آواز دی۔

"اب تن تنہا کے قتل میں یہ تاخیر کیا دیکھ رہے ہو جلدی کرو!!"

یہ سُنکر اشقیا نے چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ زرعہ بن شریک نے بائیں شانہ پر تلوار لگائی ایک اور لعین نے حضرت کے دوش اقدس پر تلوار کا بھرپور وار کیا فرزند رسولؐ منہ کے بل زمین پر گر پڑے پھر سنبھلے ضعف اور نقاہت سے جسم اطہر تھک چکا تھا کبھی حضور کھڑے ہوتے تھے کبھی گر پڑتے تھے۔ اسی حال میں "سنان بن انس" نے تابڑ توڑ نیزے کے دو وار کئے۔ ایک ہنسلی پر اور دوسرا سینے پر۔ پھر اسی سنان نے پیچھے ہٹ کر ایک تیر حضرت کے گلوئے اقدس پر مارا۔ حضرت زمین پر گر پڑے پھر اُٹھ کر بیٹھے تیر گلے سے نکالا جو خون زخم سے نکلا اس کو اپنے سر اور داڑھی پر مل لیا اور ارشاد فرمایا۔ "میں اسی طرح اپنے جد سے ملاقات کروں گا"

عمر سعد ملعون نے ایک شخص کو آواز دی "کیا دیکھ رہا ہے گھوڑے سے جلدی اُتر اور حسینؑ کا کام تمام کر"۔ سنان نے ایک تلوار حضرت کے حلق پر لگائی۔ اب امامؑ سر بسجدہ ہیں کبھی دایاں رخسارہ خاک پر رکھتے ہیں ہائے آہ۔ کبھی بایاں رخسارہ خاک پر رکھتے ہیں کہتے ہیں یا سیداہؑ۔ آخر میں یہ آیۃ تلاوت ہو رہی ہے۔

(یا ایتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة) آہ! اب نہ پوچھئے وہ سر سجدے سے کیوں کر اُٹھا۔ ہائے! شمر

دلِ الحرام آگے بڑھا۔ ارے نہیں قیامت ہوگی۔!
کوئی کہہ رہا ہے ۔ قتل الحسینؑ ۔۔ اس آواز کے بعد ظاہر بین آنکھ نے پلٹ کر دیکھا تو جسم اطہر حسینؑ بے سر تھا۔ سیّدہؑ عالمین کے دودھ اور لعاب دہن رسالتؐ سے بنے ہوئے خون کے قطرے کربلا کی ریگ میں جذب ہو رہے تھے۔ تازہ زخموں میں گرم ریت گھر بنا رہی تھی۔ ہاں ہاں ظاہر بین نگاہ کا یہی مشاہدہ ہے کہ اب حقیقت پہ بھی نظر کرو۔ دیکھو خبردار یہ نہ کہنا کہ حسینؑ کا خون ہوگیا۔ لا واللہ حسینؑ سرخرو ہو گئے۔ ہاں یزید کی تمنا کا خون ہو گیا۔ اب حسینؑ وہ حسینؑ نہیں اب تو بنائے لا الٰہ الا اللہ بن گئے۔ ۔۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است!



رمز قرآں از حسینؑ آموختیم
ز آتش او شعلہا افروختیم
خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد
تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خوں او چمن ایجاد کرد

فی الحقیقت اسی پاک خون کا ایک ایک قطرہ جو کربلا کی گرم ریت پر بہا تھا۔ انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب پیدا کر گیا جس کو یزیدی تمکنت روک نہ سکی۔ وہ سلطنت۔ وہ قاہر و جابر حکومت جس کی سرحدیں ملتان، فرانس، کے قریب تک جا چکی تھیں اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور ۷۰ سال کے اندر ہی اندر ۱۳۲ھ میں جو کچھ ہوا اس کو تاریخ سے پوچھئے۔ بنی امیہ کا استیصال۔ ان کے مظالم کا خاتمہ ہوا اور عبرتناک انداز سے ہوا۔ ممکن ہے کوئی اس کو بنی عباس کی

کامیاب سیاست کا نتیجہ سمجھ لے۔ لیکن حقیقت میں یہ اسی خون کا اعجاز تھا جو ۶۱ھ میں سرزمین کربلا پر نہر علقمہ کے کنارے بہایا گیا تھا۔ کیونکہ بنی عباس کی کامیابی کا راز اسی پاکیزہ خون کی حمایت میں مضمر ہے۔ یہ بظاہر مادی کرشمہ ہے۔ روحانی کرامات شہادت پر اسلامی دنیا کی آبادی شاہد ہے جو کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ یزید برباد ہوا۔ جامِ شہادت نوش فرمانے والا زندہ جاوید بنا۔ وہ زندۂ جاوید جو اسلام کی دائمی بقاء و حیات کا ذمہ دار مانا گیا۔ اور وہ زندگی جس کو کوئی طاقت کوئی قوت چھین ہی نہیں سکتی۔

اختر صاحب نے خوب کہا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

تیرا وجود مگر اے شہیدِ راہِ خدا
تغیرات زمانہ کی دسترس میں نہیں
مٹا سکے گا دلوں سے نہ وقت تیری یاد
کہ روشنی کا عمل ظلمتوں کے بس میں نہیں

(بحوالہ "المنتظر" ۵ر جون ۱۹۶۴ء)



حسینی اقدام کا پہلا قدم

قدیم علماء و مورخین کے بیانات اور ان پر تبصرہ

جب یزید کا خط طلب بیعت کے متعلق ولید کے پاس پہنچا شیخ مفید علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔

(ترجمہ) ولید نے امام حسینؑ کے پاس شب کے وقت ایک آدمی بھیجا اور آپ کو طلب کیا، حضرت نے سمجھ لیا کہ اس کا مقصد کیا ہے لہٰذا آپ نے اپنے مخصوصین کی ایک جماعت کو بلا کر فرمایا کہ وہ مسلح ہو جائیں اور کہا کہ ولید نے اس وقت مجھے بلایا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ سے کسی ایسے امر کی خواہش کرے گا جسے میں منظور نہیں کروں گا۔ اور وہ خطرے سے خالی نہیں ہے لہٰذا تم لوگ میرے ساتھ رہو۔ اور جب میں اندر جاؤں تو تم دروازے پر بیٹھنا۔ اگر سنا کہ میری آواز بلند ہوئی تو تم میری حفاظت کے لئے اندر داخل ہو جانا۔ (ارشاد)

دینوری نے درمیان کے واقعات کی کچھ کڑیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائی ہیں، وہ رقم طراز ہیں۔

(ترجمہ) جب یزید کا خط ولید کے پاس پہنچا تو وہ پریشان ہو گیا اور اسے فتنہ و شورش کا اندیشہ ہوا لہٰذا مروان کو بلا بھیجا، حالانکہ ان دونوں کے تعلقات اس زمانے میں کشیدہ تھے۔ مروان آیا تو ولید نے وہ خط دکھایا اور مشورہ چاہا۔ مروان نے کہا کہ عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمٰن

بن ابوبکر کی طرف سے تمھیں کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہیئے، وہ اس منصب کے کسی حیثیت سے کبھی طلبگار نہیں ہوں گے مگر ہاں حسین ابن علیؑ اور عبداللہ ابن زبیر کا اندازہ کہ تم پر لازم ہے انھیں اسی وقت بلوا بھیجو اور اگر بیعت کر لیں تو خیر ورنہ ان دونوں کا سر قلم کر دو۔ اس سے قبل کہ اس خبر کا اعلان ہو اور ان میں سے ہر ایک ایک سمت کو جست و خیز کرنے لگے اور اختلاف ظاہر کرے یہ سن کر ولید نے عبداللہ بن عمرو بن عثمان سے جو اس وقت موجود تھا اور وہ کمسن نوجوانی کے حدود سے قریب تھا، کہا کہ بیٹا تم حسینؑ ابن علیؑ اور عبداللہ ابن زبیر کے پاس جاؤ اور انھیں بلا لاؤ وہ لڑکا روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ مسجد میں پہنچا۔ دیکھا کہ وہ دونوں بیٹھے ہیں اس نے کہا امیر نے آپ کو بلایا ہے دونوں نے کہا کہ تم چلو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ وہ لڑکا چلا گیا ابن زبیر نے امام حسینؑ سے پوچھا، آپ کا کیا خیال ہے، ہمیں اس وقت کیوں بلایا گیا ہے۔ حضرت نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ہمیں بیعت کے لئے بلایا گیا ہے ابن زبیر نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے اور دونوں اپنے اپنے مکان کی طرف واپس گئے۔ امام حسینؑ نے اپنے عزیزوں اور غلاموں کی ایک جماعت کو جمع کیا پھر دارالحکومت کی طرف تشریف لے گئے اور اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ دروازے پر بیٹھیں اور جب آپ کی آواز سنیں تو مکان میں داخل ہو جائیں۔

(الاخبار الطوال صفحہ ۲۲۸ و صفحہ ۲۲۹)

طبری نے بھی یہ واقعات اتنی ہی بلکہ کچھ اور زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

جب معاویہ کے انتقال کی خبر ولید کے پاس پہنچی تو وہ گھبرا گیا اور اسے اس کی بڑی اہمیت محسوس ہوئی اور اس نے مروان بن حکم کے پاس آدمی بھیجا اور اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی حالانکہ ولید جب مدینہ کا حاکم ہو کر آیا ہے تو مروان نے اس پر ناگواری محسوس کی تھی اور ولید نے اس کی بے رخی دیکھ کر اسے اپنے دربار میں کچھ برا بھلا کہا تھا

یہ خبر مروان کو پہنچی تو وہ اس سے کھنچ گیا اور آمد و رفت ترک کر دی۔ یہ حالت یوں ہی قائم رہی اس موقع تک کہ جب معاویہؓ کی خبر پہنچی تو چونکہ معاویہؓ کے مرنے اور پھر ان لوگوں سے جن کے نام لکھے گئے تھے، بیعت لینے کے لئے مسئلے کی اہمیت ولید نے بہت محسوس کی تھی۔ اس لئے مجبوراً مروان کو بلایا، ولید نے اسے یزید کا خط پڑھ کر سنایا تو اس نے کلمۂ استرجاع زبان پر جاری کیا اور دعائے مغفرت کی اس کے بعد ولید نے اصل معاملے میں مشورہ چاہا اور کہا کہ تمہاری رائے بس ہمیں کیا صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ اس نے کہا میری رائے یہ ہے کہ اسی وقت تم ان لوگوں کے پاس آدمی بھیجو اور انھیں بیعت کرنے اور حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دو۔ اگر وہ ایسا کریں تو خیر، ان سے پھر تعرض نہ کرو لیکن اگر انکار کریں تو معاویہؓ کے انتقال کی خبر ہونے سے پہلے ہی انکی گردنیں مار دو۔ اس لئے کہ اگر ان کو معاویہؓ کے انتقال کی خبر ہوگئی تو ہر ایک ایک طرف جست کر کے کھڑا ہو جائے گا۔ اور اختلاف کا اعلان کر دیگا اور لوگوں کو اپنی طرف بلانا شروع کر دے گا۔ پھر کیا جانیے کیا نتیجہ ہو، بس ابن عمر کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ جنگ کا ارادہ نہ کریں گے اور نہ خود سے حکومت حاصل کرنے کا ارادہ کریں گے۔ ہاں مگر یہ کہ وہ ان کے سر خواہ مخواہ منڈھ دی جائے۔ اس گفتگو کے بعد عبداللہ بن عمرو بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا ان دونوں کے پاس بلانے کے لئے بھیجا گیا اس نے دیکھا کہ دونوں مسجد میں بیٹھے ہیں یہ بلانے ایسے وقت آیا تھا جس وقت عموماً ولید لوگوں سے ملاقات کے لئے نہیں بیٹھتا تھا اور نہ لوگ ایسے وقت ملاقات کے لئے جاتے تھے اس نے کہا امیر نے آپ دونوں کو بلوایا ہے دونوں نے جواب دیا کہ جاؤ ہم ابھی آتے ہیں۔ پھر ایک نے دوسرے کی طرف رخ کیا اور عبداللہ بن زبیر نے امام حسینؑ سے کہا کہ آپ کا کیا خیال ہے ہم کو ایسے بے وقت کیوں بلایا گیا ہے۔ امام نے فرمایا میرا خیال تو یہ ہے کہ ان کا حاکم ہلاک ہو گیا اور ہم کو اس لئے بلایا گیا ہے کہ خبر

پھیلنے کے پہلے ہم سے بیعت حاصل کرلی جائے۔ انھوں نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے اب آپ کا کیا ارادہ ہے، فرمایا کہ میں ابھی اپنے خاندان کے جوانوں کو یکجا کرتا ہوں اور پھر ولید کے پاس جاؤں گا۔ جب دروازے پر پہنچوں گا تو انھیں وہاں ٹھہرا دوں گا اور پھر خود اندر داخل ہوں گا۔ عبداللہ نے کہا کہ اگر آپ وہاں جائیں گے تو مجھے آپ کے متعلق خطرہ ہے۔

حضرت نے فرمایا میں جا رہا ہوں تو اس وقت جب کہ میں اپنے تحفظ پر قدرت رکھتا ہوں، پھر حضرت اسی صورت سے تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ ولید کے دروازے تک پہنچے۔ اور اپنے ساتھ والوں سے فرمایا کہ میں اندر جاتا ہوں، جب میں تمھیں پکاروں یا تم ولید کی آواز کو سنو کہ بلند ہو گئی تو سب کے سب اندر داخل ہو جانا۔ اور نہیں تو جب تک میں باہر نہ آؤں تم یہاں سے حرکت نہ کرنا۔

(الطبری جلد ۶ صفحہ ۱۸۹)

مذکورہ بیانات پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ متفق علیہ ایک واقعہ ہے جو ان سب کے پیش نظر ہے ان میں آپس میں اختلاف کوئی بھی نہیں ہے بس بیان کرنے میں کسی نے اختصار سے کام لیا ہے اور کسی نے تفصیل سے، سب سے زیادہ اختصار شیخ مفید رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، مگر ایک بات کی تصریح ان کے یہاں زیادہ ہے جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں ہے۔ وہ یہ کہ ولید نے امامؑ کے پاس آدمی رات کے وقت بھیجا۔ دینوری اور طبری کسی کے یہاں رات کی تصریح نہیں ہے مگر یہ ہے کہ وہ وقت ایسا تھا جس میں عموماً ولید سے ملاقات نہ ہوتی تھی۔

طبری نے کہا ہے، کہ ولید اس وقت کسی کو بلاتا تھا نہ کوئی اس وقت اس کے پاس جاتا تھا۔ اب تک یا تو اسی سے یہ تصور پیدا

ہوا ہو کہ وہ رات کا وقت تھا یا شیخ مفید رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر کسی ایسے راوی کا بیان ہو جس نے رات ہونے کی تصریح کی ہو۔

ولید اور مروان کی باہمی نزاع کا اجمالی تذکرہ دینوری اور طبری نے کیا ہے مگر طبری نے اس نزاع کا ابتدائی سبب بھی بیان کر دیا ہے جو بالکل قرین قیاس ہے۔ اس نزاع کے باوجود ولید کا مروان کو مشورے کے لئے بلانا انتہائی اضطراب ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ یزید کا خط ولید کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بن گیا تھا اور بالخصوص ان افراد سے بیعت کا مطالبہ جن کے نام اس خط میں درج تھے اور پھر اس سلسلے میں جو کچھ اسے ہدایت کی گئی تھی وہ اسے اپنی طاقت سے باہر کی چیز سمجھ رہا تھا، تب ہی اسے اتنی تشویش لاحق ہوئی اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، سوا اس کے کہ وہ مروان سے مشورہ لے اس لئے بھی کہ مروان کافی جہاندیدہ آدمی ہے اور اس لئے بھی کہ جو کچھ میں طرز عمل اختیار کروں اور اس کا جو نتیجہ ہو اس کی ذمہ داری میں مروان بھی شریک ہو جائے، کیونکہ یہ میرا بدخواہ تو ہے ہی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری نسبت حکومت وقت کے اس تعمیل حکم میں کوتاہی کا کوئی الزام عائد کر سکے اور چونکہ یزید خود ایک الھڑ، جوشیلا اور بے خود سرمست شخص تھا لہٰذا ولید کو شاید یہ توقع بھی تھی کہ مروان اپنی تجربہ کاری کی بدولت کسی ایسے اقدام کی طرف مشورہ نہ دے۔ جو حالات کی پیچیدگی میں اضافہ کرے اور نتیجہ میں حکومت اموی کے لئے مضر ثابت ہو۔ اس کے ساتھ ممکن ہے صحابئ رسولؐ ہونے کے تخیل میں اسے مروان کی نسبت یہ خوش گمانی بھی ہو کہ اس کے دل میں اتنا خوف خدا ہوگا کہ وہ مجھ کو کوئی ایسا مشورہ نہ دے گا جو بدیہی طور پر غضب الٰہی میں گرفتار بنانے کا باعث ہو، مگر افسوس ہے کہ اس کے یہ توقعات پورے نہیں ہوئے۔ مروان نے اسے ایسا مشورہ دیا جو اموی خاندان

کا فرد ہونے کے باوجود اسے ناقابلِ عمل محسوس ہوا اور اس پر عمل نہ کرنے کی بناء پر مروان نے بالآخر خود یا کسی اور بہی خواہ کے ذریعے سے اس کی شکایت مرکز تک پہنچائی اور اس کے نتیجے میں اسے مدینے کی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے۔

مروان کا یہ مشورہ دینا کہ اگر یہ دونوں بیعت نہ کریں تو فوراً ان کا سر قلم کر دو اس کی دلیل ہے کہ یزید نے مطالبہ بیعت کے ساتھ پہلے ہی خط میں ولید کو امام حسینؑ کے خلاف ہر متشددانہ اقدام یہاں تک کہ قتل کا حکم دے دیا تھا، ورنہ مروان کو یہ مشورہ دینے کی ہرگز ہرگز جرأت نہ ہوتی اور اگر وہ ایسی حماقت سے کام لیتا بھی تو ولید اس کے جواب میں کہتا کہ یہ تم مجھے کیسا مشورہ دے رہے ہو۔ مجھے تو صرف سوال بیعت پیش کرنے اور اس پر اصرار کرنے کی ہدایت ہے۔ میرے اصرار کے بعد جو جواب مجھے ملے اس کی اطلاع مجھے مرکز میں بھیجنا چاہیئے اور پھر وہاں سے جو ہدایت ہو اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ میں بطور خود اتنا بڑا قدم کیونکر اٹھا سکتا ہوں کہ فرزند رسولؐ کا سر قلم کر دوں۔ مگر ولید نے مروان کے جواب میں یہ قانونی عذر پیش نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسے اس خونریزی میں یزید کی طرف سے کسی عتاب کا اندیشہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ خود خوفِ خدا سے اپنے کو اس سے قاصر محسوس کر رہا تھا جس کے نتیجے میں اسے حکومتِ مدینہ سے برطرف ہونا پڑا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مروان کے مشورہ پر عمل کرتا تو معتوب نہ ہوتا لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اسے معتوب ہونا پڑا۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی بالکل رد ہو جاتی ہے جو ایسا گمان کرتے ہیں یا سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یزید بذاتِ خود امام حسینؑ کے قتل کا خواہاں نہ تھا۔ اور یہ ابن زیاد کا بطور خود ایک اقدام تھا۔ اور جس کے متعلق یزید کی کوئی ہدایت موجود نہ تھی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ شروع سے یزید نے طے کر لیا تھا

کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں امام حسینؑ کی زندگی کا خاتمہ ہونا چاہیئے ، جسکی تعمیل ولید نہ کرسکا۔ اس لئے معتوب ہوا اور ابن زیاد نے اس کی تعمیل کردی تھی اور اس لئے اُس کے اثر اور رسوخ میں اس کے بعد اضافہ ہوگیا۔!



عزائے حسینؑ کی اہمیت

شیعیت، اسلام، مذہب اور انسانیت کے نقطہ نظر سے

غور کیجئے اور ان خطرناک راہوں کا مطالعہ کیجئے جن سے شیعیت گزری ہے اور گزر کر اس منزل تک پہنچی ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت سید الشہداءؑ کی عزاداری ہی ایک وہ بڑی چیز تھی جس نے فرقہ شیعہ کو دنیا کے تباہ کن اور انتہائی خطرناک ماحول سے گزار کر نہ صرف زندہ بلکہ ترقی پذیر صورت کے اس درجے تک پہنچا دیا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ آئمہ معصومینؑ کی سیاست الٰہیہ کا غیر فانی کارنامہ ہے جو غم سید الشہداء کو اتنی اہمیت دے کر شیعیت کو حیات جاوید عطا کر دی۔

آپ دیکھئے تو وہ زمانہ کہ جس وقت نغمۂ شیعیت ممکن نہ تھا جس وقت ہم حق کی آواز بلند نہ کر سکتے تھے جس وقت خاندان اہلبیتؑ کے افراد کا نام لینا جرم تھا جس وقت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے نقل حدیث کرنا گناہ تھا اس وقت کیا ممکن تھا کہ آئمہ اہلبیتؑ کا کوئی نام لیوا بھی دنیا میں باقی رہے یا شیعیت کا خیال بھی کہیں قائم رہ سکتا تھا مگر وہ صحیح نباض فطرت بشری کے تھے انھوں نے وہ چیز ڈھونڈی جو ہزار مذہبی تعصب کے پردوں میں بھی فطرت انسانی کو متاثر بنا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غم سے متاثر ہونا کسی شخصیت اور کسی شخص کی اہمیت پر موقوف نہیں ہے۔ یعنی فرض کیجئے کہ آپ کو اس شخص سے کوئی تعلق

نہیں بلکہ آپ اس شخص کو پہچانتے بھی نہیں کہ کون ہے لیکن اگر کچھ دلدوز واقعات کا اس کے ساتھ تعلق ہے تو وہ ان ہی واقعات کی بناء پر آپ سے روشناس ہو جائے گا۔ اس کا ثبوت میں آپ کی فطرت کے حوالے سے دے سکتا ہوں خصوصاً ہمارے آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اکثر اس کے محسوس کرنے کا اتفاق ہوتا ہوگا۔ جھوٹے ناول، غلط افسانے جنکے متعلق آپ کو یقین ہے کہ لکھنے والے نے کسی حقیقی واقعے پر اس کی بنیاد نہیں رکھی ہے اور کسی سچے انسان کا اس میں تذکرہ نہیں ہے بلکہ صرف تمثیل اور خیال ہے یہ آپ طے کر کے اپنے مقام پر اس کتاب کو پڑھئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں شخصیت کوئی ہے ہی نہیں جس کا اثر دل پر پڑے گا مگر پھر بھی اگر کچھ ایسے مناظر پیش کر دیئے گئے ہیں جو دلدوز اور اندوہناک ہیں تو پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا متاثر کہ اس کا بات کرنے کھانا کھانے اور ہنسنے کو دل نہیں چاہتا یہ کیا ہے دل میں انسان سمجھ رہا ہے کہ کسی شخص سے متعلق نہیں اور اس کی کوئی اصلیت نہیں مگر مصیبت وہ چیز ہے کہ اس کا غیر واقعی خیال اور غلط تصور بھی انسان کو اتنا متاثر کر سکتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی مسرتوں کو بھول جائے اور اس غم کو یاد رکھے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔

یا کسی شاعر کا دردناک شعر جس میں کسی خاص دلدوز کیفیت کا مرقع کھینچا گیا ہو اہل محفل ایسے شعر پر سر دھنتے ہیں اور سننے والے متاثر ہوتے ہیں یہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ درد و مصیبت کا تخیل بھی کسی نہ کسی حد تک درد و مصیبت کا حامل ہے۔

حسینؑ کی شخصیت میں ان تمام خیالی مصائب نے واقعیت کی شکل اختیار کر لی ان مصائب کا تذکرہ کوئی ایسا انسان سنے جو حسینؑ کو نہ جانتا ہو کوئی ایسا شخص سنے جو رسولؐ سے بھی واقف نہ ہو یا حسینؑ کا رشتہ رسولؐ نہ جانتا ہو بلکہ واقعۂ کربلا کو آپ بیان کیجئے بالکل مبہم طور پر نکال دیجئے حسینؑ کا نام، نہ کہیئے رسولؐ کا فرزند بس فقط واقعات کو بیان کیجئے تو ضرور سننے والوں کو ہمدردی پیدا ہوگی اور ان کے دل پر اثر پڑے گا

اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ واقعات کس ہستی سے تعلق رکھتے ہیں؟ اس کی جستجو پیدا ہوگی اور جب یہ معلوم ہوگا کہ یہ اپنے زمانہ میں ایک عظیم المرتبہ انسان تھا تو وہ اس کے حقیقی درجہ اور عظمت کی تحقیق کرے گا۔ اور حقیقت کے نقطہ نظر سے قریب آئے گا۔

(۲)

یہ ملت اسلامیہ کی بدقسمتی ہے کہ مظلوم کربلا کی ہستی کو ایک فرقہ وارانہ حیثیت دے دی گئی ہے یہ دیکھنا چاہیئے کہ حضرت امام حسینؑ نے یہ تمام مصائب کس لئے برداشت کئے؟ دین اسلام کی خاطر! تو پھر کیا یہ اسلام کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے؟

مظلومیت وہ کشش ہوتی ہے کہ جن اقوام و مذاہب کے یہاں اس جنس کی قحط ہے وہ کوشش کرکے اپنے یہاں مظلوم تراشتے ہیں اور ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں دیکھئے عیسائیوں کے یہاں مظلومیت کی خودساختہ حکایات اور ان کی نشر و اشاعت کی کوششیں۔

پھر کیا یہ مسلمانوں کے لئے زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے حقیقی مظلوم کو دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ اور اس کی مظلومیت کی لازوال یادگاریں قائم کریں۔

(۳)

اب میں اپنے الفاظ میں زیادہ وسعت پیدا کرتا ہوں حسینؑ کی شخصیت صرف اسلام سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ اس وقت مذہب اور لامذہبیت کی جنگ جو برپا ہے اس میں اہل مذہب کو اپنے مشترک نقطے کی حمایت میں اس واقعہ کربلا سے بہتر کوئی گواہی نہیں مل سکتی۔

یہ کہدینا کہ مذہب ایک "خیال" ہے، یہ کہدینا کہ مذہب کوئی ٹھوس حقیقت نہیں ہے یہ کہنا کہ مذہب موہوم روایات کا نام ہے یہ سب کہنا غلط ثابت ہوتا ہے کربلا کے جنگل میں بھلا خیال میں یہ طاقت کہاں کہ وہ حیات کا مقابلہ کرسکے کچھ تو ہے ان دیکھے خدا کے ماننے والوں

کے دل میں حقیقت کا جوہر، تیس ہزار کا لشکر ایک طرف اور وہ ایک خدا کا بندہ انتہائی مختصر جماعت کے ساتھ ایک طرف بلکہ ایک وہ وقت بھی آتا ہے جبکہ مظلوم بالکل ہی یکہ و تنہا کھڑا ہوا ہے مگر اس تیس ہزار کے لشکر کی ہیبت اس کو متاثر نہیں بناتی کیا مذہب کی اس طاقت کا مظاہرہ واقعہ کربلا سے بہتر کبھی ہوا ہے؟

(۴)

اس مظاہرے کے لئے انتظامات بھی سید الشہداء نے بے نظیر کئے تھے دنیا کے قائدین کوشش کرتے ہیں کہ جوش انگیز تقریروں سے، پُر اثر الفاظ سے ان لوگوں میں کہ جن میں ہمدردی نہیں ہے اپنے ساتھ ہمدردی پیدا کریں اور اپنے معاونین کی تعداد بڑھائیں مگر حسینؑ کا طرزِ عمل بالکل اس سے مختلف تھا وہ کوشش کر کے اپنے ساتھ والوں کو الگ کر رہے تھے۔ کربلا کے راستے میں کوشش کی، شب عاشور کوشش کی کہ جو لوگ جانا چاہیں وہ چلے جائیں۔ یہ کیا بات تھی؟ صرف یہ کہ قیامت تک کے لئے وہ حق و باطل کا ایک نقشہ پیش کر رہے تھے انھیں یہ منظور نہ تھا کہ حق کے دامن پر کوئی دھبہ رہ جائے۔ اگر کسی ایک فرد میں بھی کمزوری رہ جاتی ہے تو حق خالص حق نہ رہتا اس لئے حسینؑ نے کربلا کے خونیں مرقعے کو بالکل خالص نکھرا ہوا صاف رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس طرح کہ مجمع کو چھانٹ دیا صرف چنے ہوئے منتخب لوگوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ پھر قوتِ انتخاب اور مردم شناسی دیکھئے۔ مدینے میں بنی ہاشم کا دائرہ کتنا وسیع تھا مگر مجھے نہیں معلوم کہ اولاد ابوطالب کے سوا کسی کو اپنے ساتھ لیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی ہاشم میں بھی سب پر اعتماد نہیں تھا اور بہت سے اپنوں کو بھی جدا کر دیا تھا مگر جو جدا تھے انھیں خط لکھ کر کربلا بُلا لیا گیا تھا اس سے بڑھ کر انسان کی فطرت شناسی کیا ہو سکتی ہے؟

اب کوئی دیکھے کہ جن لوگوں کو امام کی نقاد فطرت نگاہ نے منتخب کیا تھا ان میں سے کسی میں نگاہ کی چوک تو ثابت نہیں ہوتی؟ تاریخی اوراق

میں ان کے حالات سامنے ہیں اتنی ہم آہنگ جماعت، یک رنگ جماعت، یک دل اور ہم دست جماعت، دنیا کے پردے پر دکھلائی ہی نہیں دی میں سچ کہتا ہوں کہ مخالفت درکنار ان لوگوں میں کسی ایک موقعے پر اختلاف رائے تک نظر نہیں آتا کچھ نہ سہی یہی ہوتا کہ کسی وقت امام رد کرتے ابھی جنگ شروع نہ ہو اور اصحاب مصر ہوتے کہ نہیں اب حملہ کر دیجئے آپ رسولؐ کی لڑائیوں میں دیکھ لیجئے۔ ان مواقع کا ذکر نہیں جہاں لوگ ساتھ چھوڑ کر چلے ہی گئے۔ نہیں ایسے مواقع بھی ہیں کہ رسولؐ کی رائے ہے کہ جنگ مدینے میں رہ کر کی جائے مگر لوگ کہتے ہیں کہ نہیں مدینے سے باہر نکل کر جنگ کیجئے یہ تو عموماً فطرت کا تقاضہ ہے کہ دس آدمی کبھی ایک جگہ جمع ہوں تو کسی کی رائے کچھ ہو گی کسی کی کچھ مگر کربلا کی تاریخ میں مجھ کو تو یہی نظر آتا ہے کہ حسینؑ دل کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام اصحاب و انصار اور اقارب اعضا و جوارح بنے ہوئے ہیں وہاں اختلاف رائے کا نشان تک نظر نہیں آتا بلکہ منشائے امام کے سامنے کسی کی رائے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ انھوں نے بتلا دیا کہ ایک قائد، رہنما اور سردار کی متابعت کے کیا معنی ہیں اور ایک امام کی پیروی کس طرح ہوتی ہے؟

(۵)

عالم انسانیت کے لئے کربلا کے واقعے میں سبق ہیں۔

متحدہ انسانیت کے پرخچے اڑتے ہیں خود غرضی، جانبداری اختلاف اور باہمی کشمکش سے، کربلا والے حسینؑ اور ان کے ساتھیوں میں حالت یہ نظر آتی ہے کہ ایک دوسرے سے پہلے جان دینے میں سبقت کر رہا تھا ہر ایک اپنے سب سے زیادہ قریب عزیز کو دوسرے سے پہلے جان دینے کی تلقین کر رہا تھا ہر ایک اپنے سب سے زیادہ قریب عزیز کو دوسرے سے پہلے میدان شہادت میں بھیجنے پر تیار تھا حسینؑ کی آواز جو حسینؑ کا نظریہ سب کا نظریہ تھا وہاں اختلاف کا نام و نشان نہ تھا اور سب ایک مقصد کی طرف،

ایک علم کے نیچے، ایک ولولے، اور ایک عزم ایک صدا اور ایک آہنگ کے ساتھ جا رہے تھے۔

دنیائے انسانیت سے کہو کہ زندگی کی شاہراہ پر حسینیت کے سائے میں آگے بڑھے تو بنی نوع انسان کی باہمی کشمکش ختم ہو جائے اور دنیا ایک نقطے پر مجتمع نظر آئے۔

مسلمانوں سے کہو کہ جہد للبقاء کے لئے حسینؑ کے دامن سے تمسک کریں تو اقوام عالم میں ان کی ہستی پائدار بنے گی اور ان کی کشتی نجات کے ساحل پر پہنچ جائے گی۔

- شیعوں سے کہو کہ تم سچے معنی میں حسینی بنو۔
- حسینؑ کی عزاداری رسم کے طور پر انجام دینے کے ساتھ ساتھ امام حسینؑ اور انصار حسینؑ کے حالات سے سبق حاصل کرو تو تمہارا موجودہ انتشار و افتراق دور ہو جائے اور تم کسی ایک سچے رہنما کی سرپرستی میں اپنے قومی حقوق حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرو گے۔



معراجِ انسانیت
سیرتِ حسنین علیہما السلام کی روشنی میں

انسان کی بلندی عقل و تدبر کے استعمال اور فرض شناسی میں ہے اسی صفت کے کمال اور نقص سے اس کی بلندی اور پستی کے حدود متعین ہوتے ہیں یہی وہ تقویٰ ہے کہ جسے قرآن نے معیار فضیلت بشری قرار دیا ہے۔ (یعنی) تم میں زیادہ صاحب عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ فرائض ہمیشہ ایک ہی شکل و صورت پر نہیں ہوتے کوئی بڑے سے بڑا حکیم و دانشمند فرائض کی کوئی ایسی فہرست نہیں مرتب کر سکتا جو ہر شخص کے لئے ہر حال میں قابل عمل ہو۔

فرض شناس انسان کا عمل انتہا پسندی کے دو لفظوں کے درمیان ہوتا ہے اسی کا نام عدل و اعتدال ہے جو حسن اخلاق کی جان ہے۔

چنانچہ پیغمبر اسلام نے ترپن سال کی عمر یعنی ہجرت کے بعد تک کبھی تلوار نیام سے نہیں نکالی مگر مکہ معظمہ میں قیام کے بعد جب مشرکین کی طرف سے جارحانہ اقدام ہو گیا تو اس کے بعد بدر ہے، اُحد ہے، خندق ہے، خیبر ہے اور حنین ہے لیکن جب خود زیارت کعبہ کی نیت سے مکہ معظمہ کی طرف گئے تو باوجودیکہ اس وقت ساتھ میں وہی بلند حوصلہ فتوحات حاصل کئے ہوئے سپاہی تھے جو ہر میدان سر کرتے رہے اور سامنے مکہ میں وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو ہر میدان میں ہارتی رہی تھی مگر پیغمبر خدا نے صلح فرما کر واپسی اختیار کی اور صلح بھی ایسی شرائط پر جن سے عام طور پر مسلمانوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور وہ انھیں اپنے

نے توہین آمیز خیال کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ آپ نے تقریباً چوبیس برس کی عمرؑ تک ایک دفعہ بھی تلوار نیام سے نہیں نکالی حالانکہ ان کے مربی حضرت پیغمبر خدا کے جسم مبارک پر پتھروں کی بارش ہوتی تھی اور طرح طرح کی ایذائیں پہنچتی تھیں مگر وہ اس نوعمری میں اُسے محسوس کرتے تھے کہ فرمان ایزدی ابھی رسولؐ کے لئے جنگ کا نہیں آیا ہے تو اُن کے کسی پیرو کا بھی کوئی اس طرح کا اقدام درست نہیں ہے مگر جب حکم جہاد آگیا تو اب ہر میدان میں علیؑ ہی علیؑ نظر آتے ہیں۔ بدر واحد خندق اور خیبر، ہر بڑی جنگ کے فاتح حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی ہیں لیکن حدیبیہ میں جب رسولؐ صلح پر مامور تھے تو دوسروں کی زبان پر جوش میں نہ جانے کیا کیا آرہا تھا مگر علیؑ کی زبان سے ایک دفعہ بھی نہیں نکلا کہ ہم صلح کیوں کریں بلکہ جس طرح جنگ میں علم ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا اسی طرح آج صلحنامہ کے لکھتے وقت قلم ان کے ہاتھ میں تھا اور پھر رسولؐ کے بعد تو پچیس برس خاموشی میں گزار دیئے اور کتنے ہی جوش میں آنے والے حالات کے باوجود تلوار نیام سے نہیں نکالی لیکن آخر عمر میں پھر جب فریضہ جہاد ذمہ پر آیا تو جمل اور صفین اور نہروان کے معرکوں میں وہی تلوار چمکتی نظر آئی جو پہلے بدر واحد وغیرہ میں چمک چکی تھی۔

اب جبکہ حضرت پیغمبر خدا کی واحد زندگی میں مختلف نمونے سامنے آگئے جو بظاہر متضاد ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی واحد زندگی میں ایسی ہی مثالیں سامنے آگئیں تو اب اگر دو شخصیتوں میں باختلاف حالات اس طرح کی دورنگی نظر آئے تو اس کو اختلاف طبیعت یا اختلاف رائے کا نتیجہ سمجھنا کیوں کر درست ہو سکتا ہے اور یہ کیوں کہا جائے کہ حسنؑ مجتبیٰ طبعاً صلح پسند تھے اور امام حسینؑ طبعاً جنگ پسند تھے بلکہ یہی کہنا چاہیئے کہ اس وقت کے حالات کا تقاضہ وہ تھا اور اس وقت کے حالات کا تقاضہ یہ ہے اس وقت حسنؑ مجتبیٰ امام تھے ان کو فریضہ الٰہی وہ محسوس

ہوا اور اس وقت حسینؑ بن علی علیہ السلام امام تھے ان کو فریضہ ربانی اس وقت کے حالات میں یہ محسوس ہوا نہ اس میں جذبات کا کوئی دخل تھا اور نہ اس میں! اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا حضرت پیغمبرؐ خدا نے مختلف الفاظ میں پہلے سے اظہار فرمادیا تھا کبھی ان الفاظ میں کہ

ابنای ھذان امامان قاما او قعدا

"یہ میرے دونوں فرزند امام ہیں چاہے کھڑے ہوں اور چاہے بیٹھے ہوں"

اس وقت کی دنیا اُسے نہیں سمجھ سکتی تھی کہ امام کہنے کے ساتھ قاما او قعدا کس لئے کہا جا رہا ہے، امامت میں اٹھنے اور بیٹھنے کا کیا دخل۔ مگر جب مستقبل نے واقعات پر سے پردہ ہٹایا تو اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ اسلام ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہے تھے کہ ایک صلح کر کے بیٹھ جائے گا اور ایک تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا کچھ لوگ حسنؑ کی صلح پر اعتراض کریں گے اور کچھ حسینؑ کی جنگ پر۔ آپ نے اسی لئے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ دونوں امام ہیں چاہے کھڑے ہوں اور چاہے بیٹھے ہوں یعنی حسنؑ صلح کر کے بیٹھ جائے تو اعتراض نہ کرنا اور حسینؑ تلوار لے کر کھڑا ہو جائے تو اعتراض نہ کرنا۔ وہ بیٹھنا بھی حکم خدا سے ہے اور یہ کھڑا ہونا بھی حکم خدا سے ہے۔ وہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا اور یہ اس وقت کے حالات کا۔

اور کبھی اس طرح جسے علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ سیدہ عالمؑ اپنے والد بزرگوار حضرت رسول اللہ صلعم کے پاس دونوں شہزادوں کو لیکر حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔

یا ابت ھذان ابناک انحلھما

"ابا جان! یہ دونوں بچے آئے ہیں۔ انھیں کچھ عطا فرمائیے۔"

حضرتؐ نے فرمایا۔

اما الحسن فلہ حلمی وسردی و اما الحسین فلہ جراتی وجودی۔

مطلب یہ ہوا کہ انھیں اور کسی عطیے کی ضرورت نہیں ہے ان میں تو میری صفتیں
تقسیم ہو گئی ہیں۔ حسنؑ میں میرا حلم ہے اور میری شان سرداری کا اور حسینؑ
میں میری جراءت و ہمت ہے۔ اور میری فیاضی۔! اب اس تقسیم پر غور
کیجیے معلوم ہوتا ہے کہ ظرف زمانہ کے لحاظ سے جس کو جس صفت کا مظہر بننا
تھا اُسی صفت کو رسولؐ نے اپنا قرار دیا تاکہ اس صفت سے جو کارنامہ
ظہور میں آئے۔ وہ کسی مسلمان کے نزدیک قابل اعتراض نہ ہو سکے۔
اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسنؑ کی صلح کو حسنؑ کی طبیعت کا تقاضہ نہ سمجھنا بلکہ
وہ میرے حلم کا نتیجہ ہے اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اس موقعے پر میں
ہوتا تو وہی کرتا جو حسنؑ کرے گا۔ اور حسینؑ کی جنگ کو حسینؑ کی طبیعت
کا تقاضہ نہ سمجھنا بلکہ وہ میری جراءت کا نتیجہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ
اس موقعے پر میں ہوتا تو وہی کرتا جو حسینؑ کرے گا۔ اب حسنؑ کی صلح پر اعتراض
رسولؐ کے حلم پر اعتراض ہے۔ اور حسینؑ کی جنگ پر اعتراض رسولؐ کی جراءت
پر اعتراض ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسنؑ نے صلح کر کے جہاد حسین علیہ السلام کا پس منظر
تیار کیا۔ وہ صلح اس وقت نہ ہوتی تو اس کے بعد جہاد کا یہ ہنگامہ نہ آسکتا
کیونکہ اسلام میں جنگ یہ مجبوری ہوتی ہے اس وقت جب صلح کا امکان باقی
نہ رہے جب تک اصول کے ساتھ صلح کا امکان رہے اس وقت تک جنگ
کرنا غلط ہے پھر جب کہ آئین اسلام میں صلح کا درجہ جنگ پر مقدم ہے تو
اگر امام حسنؑ صلح نہ کر چکے ہوتے تو اتمام حجت نہ ہوتی اور حضرت امام حسینؑ کے
لئے جنگ کا موقع پیدا نہ ہوتا۔

امام حسین علیہ السلام کے شرائط صلح پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا
اور اس صلح کے شرائط میں ان مقاصد کا پورا پورا تحفظ کیا گیا تھا جن کے
لئے پھر کربلا کی جنگ ہوئی۔ یہ نہ دیکھیے کہ اُن شرائط پر عمل ہوا یا نہیں
بعد میں عمل تو حدیبیہ کی صلح کے شرائط پر بھی نہ ہوا تھا مگر جب تک
صلح کا معاہدہ وقوع میں نہ آئے فریق مخالف پر شرائط کی خلاف ورزی

کا الزام ہی کہاں عائد ہو سکتا ہے تاکہ جنگ کا جواز پیدا ہو۔ وہاں جب حدیبیہ کے شرائط پر عمل نہ ہوا تو معرکۂ کربلا قائم ہوا۔

معلوم ہوا کہ یہ تاریخی واقعات کی رفتار کا لازمی اقتضاء تھا کہ اس وقت صلح ہو اور اس وقت جنگ ہو اور وہ حصّہ وقت کا امام حسنؑ کے حصّے میں آیا اور یہ ہنگام امام حسین علیہ السّلام کے حصّے میں آیا اگر معاملہ بالعکس ہوتا یعنی ۴۱ھ ہجری میں امام وقت امام حسینؑ ہوتے تو وہ صلح امام حسینؑ کرتے اور اگر ۶۱ھ ہجری میں امام حسنؑ موجود ہوتے تو یہ جہاد امام حسن علیہ السلام فرماتے۔

حضرت امام حسن علیہ السّلام جانتے تھے کہ میرا جہاد ہے صلح کرنا۔ ان کی صلح مقتضائے شجاعت تھی اور امام حسین علیہ السّلام کا جہاد تھا یزید کے مقابلے میں تلوار کھینچنا یہ ان کی شجاعت کا مظاہرہ تھا کیوں کہ جس طرح علمائے اخلاق نے بیان کیا ہے شجاعت ہر موقعے پر تلوار لے کر بڑھ جانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ شجاعت قوتِ غضب کے تابع حکم عقل ہونے کا نام ہے اور یہ قوتِ غضبیہ کے اعتدال کا درجہ ہے۔ اگر انسان نے بے موقع غصے سے کام لیا اور قدم آگے بڑھا دیا تو "تہور" ہوگا۔ اور اگر موقع آنے پر بھی کمزوری دکھائی تو اس کا نام جُبن ہوگا یہ دونوں چیزیں شجاعت کے خلاف ہیں۔ شجاعت یہ ہے کہ بے محل قدم آگے نہ بڑھے اور محل آنے پر خاموشی نہ ہو۔ ان دونوں رُخوں کو حسن و حسین علیہما السّلام نے پیش کیا اور اس طرح دونوں نے ملکر شجاعت کی مکمل تصویر کھینچ دی۔

پھر یہ واقعہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السّلام نے بھی صلح کی کوشش میں کوئی کمی نہیں کی یہ تو فریق مخالف کا طرزِ عمل تھا کہ اس نے وہ تمام شرائط مسترد کر دیئے اگر دشمن شرائط کو منظور کر لیتا تو کارنامۂ کربلا بھی صلح پر ختم ہوتا۔ اس کے بعد کسی کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ امام حسن علیہ السّلام طبعاً صلح پسند تھے۔ اور امام حسین علیہ السّلام نسبتاً جنگ پسند تھے۔

وہاں امیر شام نے سادہ کاغذ بھیجدیا تھا کہ حسن مجتبیٰ علیہ السلام جو

جو شرائط چاہیں لکھ دیں۔ امام حسن علیہ السلام نے شرائط لکھے اور امیر شام نے ان کو منظور کر لیا اور امام حسین علیہ السلام کے سامنے تھا یزید ایسے شخص کی بیعت کا سوال! جسے آل محمدؐ میں سے کوئی بھی منظور نہ کر سکتا تھا۔

امام حسین علیہ السلام زندگی کے اس ایک دن یعنی عاشورہ کو ہی حسینؑ نہ تھے وہ اپنی زندگی کے ۵۷ برس میں ہر دن حسینؑ تھے۔ پھر آخر ایک دن کے کردار کو سامنے رکھ کر کیوں رائے قائم کی جاتی ہے؟ اس ایک دن کو نکالکر جو ستاون برس ہیں وہ ان کی فہرست حیات سے کیونکر خارج ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح حضرت امام حسن علیہ السلام صرف اس دن جب صلح نامہ پر دستخط کئے تھے اسی وقت امام حسنؑ نہ تھے۔ حسنؑ نام تو اس پوری زندگی کا تھا لہذا آپ کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرنا درست ہوگا اور اگر صرف ایک حصۂ حیات کو سامنے رکھکر تصویر کھینچی جائے گی تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے رسول اللہ صلعم کے صرف دور جہاد کو دیکھکر مخالفین اسلام نے آپ کی یہ تصویر کھینچی کہ آپ کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور ایک ہاتھ میں قرآن۔! جس طرح یہ تصویر غلط ہے اسی طرح امام حسن علیہ السلام کی تصویر صرف صلح کو سامنے رکھ کر اور امام حسینؑ علیہ السلام کی تصویر صرف ان کی جنگ کو دیکھ کر! بیشک یہ غلطی اتنی عام ہے کہ ان کے نام لیوا تک اور ان کی سیرت و کردار کی پیروی پر زور دینے والے بھی ان کا وہی صرف ایک کردار جانتے اور اسی کو پیش کرتے ہیں اسی لئے تقریروں میں گرمی پیدا کرنے کے لئے اور کسی بڑے معرکے میں قدم بڑھانے کے لئے خون میں جوش پیدا کرنے کے واسطے حضرت امام حسین علیہ السلام کا نام لیتے اور ان کے کارنامے کو یاد دلاتے ہیں چاہے مقصد صحیح ہو یا غلط اور وہ جو اپنی تمام عمر شہادت سے ایک دن پہلے تک معرکہ آرائی کو ملتے رہے وہ گویا امام حسین علیہ السلام کا کردار نہیں تھے بلکہ کسی اور کا ہے پوری تصویر تو اسی وقت ہوگی۔ جب پوری سیرت کو سامنے رکھ کر تصویر کھینچی جائے۔

(بحوالہ شیعہ اپریل ۱۹۶۷ء)



بین الاقوامی شہید اعظم

حسین ابنِ علی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین و آلہ الطیبین الطاہرین

آج جبکہ کانوں میں فرقہ وارانہ نعروں کی آواز گونجی ہوئی ہے آنکھیں فرقہ پرستی کے مناظر دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں اور دل و دماغ فرقہ بندی کے تخیلات سے پُر ہیں، یہ کہنا کہ حسینؑ کی ذات فرقہ بندیوں سے بالاتر ہے بظاہر غلط معلوم ہوگا۔ جبکہ یہ ظاہر ہے کہ حسینؑ کی ذات کا تعلق ایک خاص فرقہ سے ہے۔ بہ ایں معنی کہ حسینؑ اسلام کے پیرو تھے۔ بے شک حسینؑ کا تعلق ایک فرقہ سے ہے بایں معنی کہ حسینؑ مسلمانوں میں پیدا ہوئے اور بے شک حسینؑ کا تعلق ایک ہی فرقہ سے بایں معنی کہ حسینؑ پیغمبرؐ اسلام کے نواسے تھے لیکن جس طرح کوئی دریا باوجودیکہ کسی ایک ہی حصۂ زمین سے نکلا ہو۔ مگر جہاں جہاں تک پہنچتا ہے ہر قوم کو فیضیاب کرتا ہے جس طرح سورج مشرق سے نکلنے کے باوجود مغربی حصوں کو بھی اپنی ضوفشانیوں سے منور کر دیتا ہے جس طرح بادلوں کا ایک سمت سے اٹھنا دوسری طرف کی خشک زمین کو سیراب کرنے سے نہیں روکتا۔ اسی طرح حسینؑ کی شخصیت کا عرب قوم میں اور اسلام کے مذہب میں پیدا ہونا ان کو بلحاظ افادیت

کسی ایک فرقے تک محدود نہیں رکھ سکتا بالکل اسی طرح جیسے ان کا ہی ہاشم کے خاندان میں ہونا عرب ملک اور قوم کے دوسرے خاندانوں کو انسے بیگانہ قرار دینے کا باعث نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں مختلف مذاہب ہیں لیکن باوجود تمام اختلافات کے کچھ اچھائیاں ایسی ہیں جن کو متفقہ طور پر تمام مذاہب اچھائیاں سمجھتے ہیں اور بہت سی برائیاں ہیں جو سب کے نزدیک برائیاں ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے آدمی بھی برائیاں کرتے ہیں تو اچھائی کے نام کے ساتھ ہر جھوٹ سچ کے نام سے بولا جاتا ہے۔ ہر بے ایمانی دیانتداری کے نام سے کی جاتی ہے اور ہر برائی کو اچھائی کہہ کے کرنا ہی اس کا ثبوت ہے کہ برا آدمی بھی اپنے اس عمل کو برا سمجھتا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر دنیا میں ایک بین الاقوامی ادارہ ایسا قائم کیا جائے جس میں تمام مذاہب کے ذمہ دار افراد شامل ہوں اور اس کا مقصد نوع انسانی میں ان اچھائیوں کی تبلیغ ہو جن کے اچھے ہونے پر سب متفق ہیں اور ان برائیوں سے روکنا ہو۔ جنکی برائی سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ تو یہ ایک بڑی انسانی خدمت قرار پائے گی اور اگر دنیا عملی طور پر اس پر کاربند ہو جائے تو باوجود اختلاف مذہب و ملت کے یہ دنیا سب کے لئے اس دور حیات میں ایک جنت بن سکتی ہے۔

جس طرح عمدہ اخلاقی اصول کسی ایک فرقے سے مخصوص نہیں ہیں اسی طرح کسی ایسے بلند اصول کی تعلیم دینے والے کی ذات ایک ہی فرقے سے وابستہ نہیں ہو سکتی۔ امام حسینؑ نے ایک ایسا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جو یکساں طور پر ہر فرقے کے لئے مشعل راہ بن سکتا ہے۔ اور وہ ہے حسین ابن علیؑ کا وہ جہاد جو انھوں نے خود اپنی قوم کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کیا۔ حسینؑ کی ذات فرقہ بندیوں سے بالاتر نہ ہوتی، اس وقت جبکہ وہ کسی دوسرے فرقے کے خلاف جہاد کرتے اور نتیجۃً مخالف فرقے کے افراد امام حسینؑ کے مخالف ہو جاتے لیکن امام حسینؑ نے جو جہاد کیا وہ مذہب (اسلام) والوں کے ان افراد کے خلاف تھا، جو اچھائیوں کے اصول سے ہٹ کر برائیوں

کے بیرو ہو گئے تھے۔

موجودہ خلفشار اور ہنگامہ آرائیوں میں ہمارا اور آپ کا مشاہدہ ہے کہ ننانوے فیصدی لوگوں کا رجحان طبع اس طرف ہے کہ دوسری قوم کی خرابیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جائے اور اپنی قوم کے مظالم کی پردہ پوشی کی جائے یہاں تک کہ جو بڑے افراد اپنی قوم کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہیں انھیں بھی دو طریقوں سے ہلکا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں ایک یہ کہ ہماری قوم نے جو مظالم کئے وہ دوسروں کے مقابلے میں کم ہیں دوسرے یہ کہ پہل دوسروں نے کی تھی ادھر سے جو کچھ ہوا وہ جواب میں ہوا۔ پھر لیڈروں کی یہ کوشش ہو تو ظاہر ہے کہ عوام اس کے معنی کیا سمجھ سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کے افراد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ اگر چہ برا ہوتا مگر اس لئے اب برا نہیں کہ جوابی طور پر کیا گیا۔ یا یہ کہ جو کچھ کیا دوسرے فریق کی برائیوں سے وہ کم ہے اس لئے اسے قابل اعتراض نہیں سمجھنا چاہیئے اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عام افراد توازن برابر کرنے کے لئے اور زیادہ تشدد و بربریت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے بعد منتقمانہ کاروائیاں دوسری طرف سے شروع ہو جاتی ہیں اس طرح قتل و غارت کا لامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

امام حسینؑ کی تعلیم یہ ہے کہ تم غیروں کے عیوب دیکھنے کے بجائے خود اپنے نقائص پر توجہ کرو اور ان ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دو حقیقی رہنما کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام کو ان کی غلطیوں پر سختی سے متنبہ کرے اور دوسرے فریق کی بداعمالیوں کے تذکرے کو خفیف سمجھ کر ان کو اتنی اہمیت نہ دے تاکہ لوگوں کی نظر اپنی غلطیوں پر پڑے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کتنے غضب کی بات ہے کہ مذہب کے پرستار ایک دوسرے کا برائیوں میں مقابلہ کرتے ہیں۔ یعنی دوسرا برائی میں بڑھا نہ رہنے پائے ہماری طرف سے کمی ہوئی ہے تو ہم اس کو پورا کر دیں۔ حالانکہ اگر مذہب کی روح دماغوں میں راسخ ہوتی تو اچھائیوں میں مقابلہ ہوتا

چاہیئے تھا حقیقت یہ ہے کہ عوام مذہب کو بحیثیت ایک برحق اصول کے مانتے ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اس لئے مانتے ہیں کہ وہ اس مذہب کے ماننے والے کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے دل سے لا مذہب ہیں۔

اپنے مذہب سے ان کو اس طرح کی محبت ہے جیسے اپنے وطن اپنی اولاد سے، اپنے گھر سے اور اپنے کسی دوست سے یہ اپنے ہونے کی بنا پر جو محبت ہوتی ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کی محبت ہوا کرتی ہے بس اس طرح سے ان کو اپنے مذہب کی محبت ہے اس لئے ان کی مذہبی جنگ بھی درحقیقت ایک ذاتی لڑائی ہے جیسے زر، زمین، زن کے اوپر لڑائیاں ہوا کرتی ہیں لیکن تصادم کی بنیاد تو یہ ہوتی ہے کہ ہر دوسرے کو اس حق سے کچھ کم ہی دینا چاہتا ہے لہذا کشمکش فساد اور خونریزی کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ مصلحین کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کی بے راہ روی اور گمراہی کے خلاف علم جہاد بلند کریں چاہے اس راستے میں ان کی جان بھی کام آ جائے جسے انتہائی بلندی کی منزل پر امام حسینؑ نے اپنے عمل سے پیش کیا۔

مذہب نے جو اصول بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے مقابلے میں بلندی حاصل کرنا ہو تو اپنے حقیقی عمل کو اس سے بلند رکھے اسی طرح اگر مقابلہ بھی دو فریق میں ہونا چاہیئے تو اس بات کا دیکھیں کون دوسرے کے ساتھ احسان زیادہ کرتا ہے اس کے نتیجہ میں کبھی تصادم نہیں ہو سکتا اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس کی ایک معمولی چیز پیش کرتا ہوں تجارت میں ترازو سے تولنے والی چیزوں کے متعلق حکم ہے کہ اگر تم خود تول کر بیچ رہے ہو تو کچھ زیادہ دینے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم خریدنے جاؤ اور دکاندار تم سے تو لنے کے لئے کہہ دے تو کچھ کم ہی لینے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد کیا مول تول میں کوئی جھگڑا ہو سکتا ہے۔

اب اگر دو قوموں کے درمیان کوئی معاملہ ہو اور وہ اسی نظریہ کے ماتحت زمین کی تقسیم کریں کہ چاہے دوسری طرف زیادہ زمین چلی جائے مگر

دوسری قوم کی حق تلفی نہ ہو تو پھر تصادم کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

یزید نے حسینؑ سے بیعت چاہی اور حسینؑ نے انکار کیا۔ حسینؑ کو بیعت سے انکار کیوں تھا؟ اس کا جواب اسی سے ملیگا کہ آخر یزید کو بیعت کے لئے اتنا اصرار کیوں تھا بس جس لئے اسے اتنا اصرار تھا اسی لئے حسینؑ کو انکار تھا یزید کا اصرار بیعت پر اس لئے تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اسلامی قوانین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی تھی جن کی بناء پر خود اسے یقین تھا کہ ادھر لوگوں کے دماغوں سے رشوت کا نشہ ذرا بھی کم ہوا۔ ادھر چمکتی ہوئی تلواروں کی چمک نظر سے ذرا اوجھل ہوئی اور ہر متوسطی نظر کا مسلمان بھی محض ایک نگاہ غلط انداز سے یہ سمجھ لے گا کہ یزید خلیفۂ برحق نہیں ہو سکتا۔ ضرورت تھی کہ اپنے خلیفۂ برحق ہونے کے جواز میں شریعت اسلامی کے حقیقی پاسبان سے سند لی جائے تاکہ جب کبھی مسلمان بیدار ہو فوراً اس سے کہہ دیا جائے کہ اگر حکومت اس قابل نہ ہوتی تو رسولؐ کے نواسے حسینؑ کیوں بیعت کرتے۔ یہ یزید کی نادانی تھی کہ اس نے یہ تصور بھی کیا کہ حسینؑ بیعت کرلیں گے۔ حسینؑ اگر بیعت کر لیتے تو قیامت تک حقائق پر پردہ پڑ جاتا۔ اسی لئے ان کو بیعت سے انکار ضرور تھا اس طرح حسینؑ نے دو نتیجے حاصل کئے ایک مسلمانوں کے لئے اور ایک دوسروں کے لئے۔ مسلمانوں کے لئے آپ نے یہ اصول اپنے خون کی سرخ روشنائی سے ثبت کر دیا کہ قانون شریعت پابند نہیں ہے۔

دوسرے فرقوں کے لئے یہ کہ اگر تمہیں اسلامی تمدن اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق کا مطالعہ کرنا ہو تو کسی دمشق یا قرطبہ کے قصر خضرا یا قصر حمراء میں نہ جانا بلکہ مدینے کے ان ٹوٹے پھوٹے ہوئے کھنڈروں پر نظر ڈالنا جہاں بوسیدہ پردے اور کچی دیواریں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح حسینؑ نے قیامت تک یزید اور یزیدنش انسانوں

کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور غلط فہمی کے امکانات کو ختم کر دیا حسینؑ کا یہ جہاد جو اپنی قوم ہی کے مقابلے میں تھا اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ تھا وہ اسلامی جہاد جو غیروں کے مقابلے میں ہو اس میں کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں مثلاً جہاد اسی وقت کیا جائے گا جب غلبے کا امکان ہو۔ تعداد کافی ہو پھر سپاہیوں کی عمر کے لحاظ کی بھی ایک مقدار مقرر ہے کہ اس سے کم یا زیادہ عمر نہ ہو اسی طرح اور بھی پابندیاں ہیں لیکن حسینؑ نے جو جہاد کیا وہ اس جہاد سے بالکل مختلف تھا قرآن میں حکم آیا ہے کہ ۲۰ مسلمان دو سو کا مقابلہ کریں لیکن جب یہ معیار عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا تو کہا گیا کہ ایک سو اور دو سو کی نسبت سے مقابلہ کرو۔ یہ وہ معیار جو قرآن نے قائم کیا تھا اور جو عمل کی کمزوری کی بنا پر قابل قبول نہ ہوا زیادہ سے زیادہ بیس اور دو سو یعنی دس گنے کی نسبت سے تھا لیکن کربلا میں جو جہاد کیا گیا تھا اس میں ادھر ۷۲ بہتر دوسری طرف کم از کم تیس ۳۰ ہزار فوج اس میں جو نسبت کا فرق ہے وہ بدرجہا زیادہ ہے پھر جہاد میں تعداد کافی ہونا ضروری چیز ہے مگر کربلا کی جنگ میں تعداد کے بڑھانے کے بجائے گھٹانے کی کوشش ہوئی راستے میں جتنے لوگ کچھ امیدوں کی بنا پر ساتھ ہو لئے تھے آپ نے شہادت مسلمؑ کی خبر سننے کے بعد ان سے کہا کہ میں کسی فوج کشی یا حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے نہیں جا رہا ہوں وہ واپس جائیں۔ اور اس طرح بہت سے لوگ چلے گئے اس کے بعد کربلا میں بھی شب عاشور آپ نے اپنے ساتھ کے لوگوں سے فرمایا کہ "تم میں سے جو جانا چاہے بخوشی چلا جائے"۔

پھر عمر کی پابندیاں جہاد میں لازمی ہوتی ہیں یہاں وہ بھی باقی نہیں رہیں اسی برس کے حبیب ابن مظاہر بھی ساتھ میں ہیں اور نابالغ بچے بھی۔ بلکہ چھ ماہ کا شیر خوار علی اصغرؑ بھی میدان جہاد میں ساتھ ہے معلوم ہوا کہ غیروں کے ساتھ جہاد میں جو شرائط ضروری ہوا کرتی

ہیں، دینِ خدا کی حفاظت کے لئے اپنوں کے ساتھ جہاد کرنے میں ان کا کبھی لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ تمام شدید ترین مصائب کو اس سلسلے میں برداشت کیا گیا۔ امام حسینؑ نے دُنیا کو مختصر کہ انسانی حقوق کی جو تعلیم دی ہے وہ موجودہ زمانہ میں بھولی ہوئی انسانیت کی یاد دلانے کے لئے کافی ہے۔

پانی رسد کا اہم ترین جزو ہونے کی حیثیت سے خود حسینؑ کے لشکر کیلئے ضروری اور بیش قیمت تھا اور دشمن کو پانی پلا کر تقویت پہنچانا بظاہر اپنے کو کمزور کرنے کے مترادف تھا لیکن امام حسینؑ نے فوجِ حر کو پانی پلا کر ظاہر کیا کہ اگرچہ دشمن ہیں مگر نوعِ بشر کے افراد ہیں اور پیاسے ہیں۔ لہٰذا پانی ان سے عزیز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نہیں کہ محض حکم دے دیا ہو جیسا کہ اکثر لیڈر کرتے ہیں۔ کہ زبانی تعلیم دے دیتے ہیں اور اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو یہ عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم نے تو کہہ دیا تھا۔ جماعت نے ہمارا حکم نہ مانا بلکہ اس حقیقی رہنما کی شان یہ تھی کہ خود کرسی بچھا کر اپنے سامنے پانی پلوانے لگے۔ بخدا امام حسینؑ کے انصار کرتے وہی جیسا حسینؑ نے حکم دیا تھا لیکن امام حسینؑ نے خود اپنا فرض بھی ادا کرنا ضروری سمجھا۔

علی ابن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں بہت پیاسا تھا۔ حسینؑ نے محسوس کر لیا اور کہا اے شخص فلاں اونٹ پر پانی ہے، پی لے! میں گیا لیکن فرطِ تشنگی سے دہانہ ٹھیک منہ تک نہ لگا سکا اور پانی گرنے لگا حسینؑ بہ نفسِ نفیس اٹھ کھڑے ہوئے اور خود مشک کا دہانہ ٹھیک کر کے مجھے سیراب فرمایا۔

یہ اور اس کے مثل وہ حسینی تعلیم کے خط و خال ہیں جنکی وجہ سے ہم یہ کہنے کی جراءت کرتے ہیں کہ

"حسینؑ کی ذات تمام فرقہ بندیوں سے بالاتر ہے"

مسلمانوں کی حقیقی اکثریت



اسلام کی ترقی کا انتہائی نقطہ

واقعۂ کربلا کا ایک خاص پہلو

عام طور پر اسلامی ترقی کا جو معیار سمجھا گیا ہے اس کی بنیاد پر اسلام کا عہد زریں مختلف اوقات میں سمجھا جا سکتا ہے ممکن ہے اس وقت کو اسلام کا نمایاں زمانہ سمجھا جائے جب روم اور فارس کی عظیم الشان سلطنتوں کو اسلام نے فتح کیا ممکن ہے وہ دور قرار دیا جائے جب دنیا کا خراج سمٹ سمٹ کر اسلامی بیت المال میں آتا تھا اور سلطنت کی حدود اتنی وسیع ہو گئیں تھیں کہ سامنے نظر آنے والا ابر بادشاہ اسلام کی زبان سے مطمئن دل کے ساتھ یہ الفاظ کہلواتا تھا کہ جہاں تجھے جانا ہو جا اور برس، تیرے محاصل کا خراج بہر حال میرے ہی خزانے میں آئے گا ممکن ہے وہ دور مسلمانوں کی مردم شماری کا انتہائی مکمل نمونہ قرار دیا جائے جب دنیا میں اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کا نام لینے والا ڈرتا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ مجھے جزیہ دینے کی مصیبت میں گرفتار نہ ہونا پڑے لیکن کیا حقیقتاً یہ نام کی مردم شماری سچے مسلمانوں کی تھی کیا جتنی تعداد سرکاری دفتروں میں اسلامی افراد کی لکھی جاتی تھی وہ حقیقی اسلام کے نقطہ نظر سے بھی اسلام کی واقعی تعداد تھی۔

جہاں تک اسلامی روح اور اس کے حقیقی جوہر کا تعلق ہے میں بلا خوف

انکار یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان اسلامی ترقیوں کے بہت سے دور وہ ہیں جو اس کی پستی قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

اس کے برخلاف اگر اسلام کی انتہائی بے کسی، بے بسی اور تنزلی کی مثال دنیا سے پوچھی جائے گی تو وہ بہت جلد واقعۂ کربلا کا نام لے دے گی وہ یہ سمجھے گی کہ اس سے بڑھ کر اسلام کی پستی اور کسمپرسی کا کوئی اور دور نہیں ہے اور بیشک اس حیثیت سے یہ بھی صحیح ہے کہ خود فرزند رسولؐ اسلام کا نام لینے والوں کے ہاتھ سے قتل ہوا مگر میں جب ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی حقیقی مردم شماری اور اس کی اکثریت کا مظاہرہ اگر کبھی ہوا ہے تو وہ صرف واقعۂ کربلا میں! نہ اس کے پہلے کبھی اور نہ اس کے بعد!

یہ ایک عجیب بات معلوم ہوگی لیکن تھوڑے سے صبر و تحمل کے بعد متحیر دماغ میرے ساتھ متفق نظر آئیں گے۔

اسلام کی تعلیم خدا پر سچا اعتماد، حق کا پورا یقین اور راہ حقیقت پر کامل ثبات و استقلال۔ مجھے اس اعتبار سے اسلام کی مردم شماری کا جائزہ لینا ہے۔

مجھے سب سے پہلے رسولؐ کا دور نظر آتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ حضرتؐ کے زمانہ میں ہی مسلمانوں کی مردم شماری ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ممکن ہے یہ صحیح بھی ہو اس طرح کہ حج آخر میں حضرتؐ کے ساتھ مناسک عبادت کرنے والے قریب اتنے ہی تھے مگر مجھے جس طرح کے اسلام کی تلاش ہے میں صاف کہوں گا کہ رسولؐ کے زمانے میں اس کی تعداد بہت کم تھی ممکن ہے کہا جائے کہ رسولؐ کے ابتدائی غزوات کا زمانہ تھا مگر افسوس ہے کہ حنین نے جو رسولؐ کے آخری زمانے میں ہوئی ہے اس میں بھی تاریخ گواہ ہے کہ آدھی باقی نہیں رہے تھے اس کے بعد رسولؐ دنیا سے اٹھ گئے اور "خلفائے راشدین" کے زمانے میں افراد اسلام میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ لیکن کیا مسلمانوں کی وہ جو مردم شماری

جو اتحاد اور حسینؑ میں ظاہر ہوئی تھی اس میں واقعی ترقی ہوئی؟

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے بعد کون سا دور اسلام کی تاریخ پیش کر سکتا ہے جس میں مسلمانوں کی حقیقی تعداد کا مجھے اندازہ ہو سکے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ کربلا کا واقعہ ایک وہ یگانہ مثال ہے جس میں اسلام کی حقیقی روح اور پر ثبات مسلمانوں کی واقعی تعداد کا اعلیٰ نقطہ سمجھا جا سکتا ہے وہ حسینؑ کے ساتھی تھے جو مشہور روایت کی بنا پر صرف بہتر ۷۲ سہی لیکن تاریخی تحقیقات پر سو سے کچھ زیادہ تھے۔ میں سچ کہتا ہوں یہ مردم شماری وہ تھی جو رسولؐ کے زمانہ میں نہ بڑھی اس کے بعد کسی دور میں اتنی تعداد میں اتنی خالص عملی کامیابی کے ساتھ دنیا میں پیش نہیں ہوئی جس طرح حسینی معرکے میں دنیا کے سامنے آگئی حسینؑ نے تمام عالمی مذاہب کے سامنے حقیقی مسلمانوں کا ایک نمونہ اجتماعی شکل سے پیش کر دیا ہے جسکی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے کوئی مذہب اتنی خالص تعداد بوقت واحد اپنے پیروؤں کی پیش نہیں کر سکتا جنھوں نے اتنی سختیوں کے باوجود ایک مسلک پر قائم رہ کر اپنی زندگی کو ظاہری طور پر فنا کر دیا ہو۔

حسینؑ دنیا میں سب سے پہلی بار اور بالکل آخری مرتبہ مسلمانوں کی ایک متحد جماعت کی مثال پیش کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے آپ کے انتخاب کی اگر دنیا تعریف نہ کرے تو ظلم ہے۔ بہت سے ساتھ تھے مگر آپ نے کوشش کر کے مجمع کو متفرق کیا اسی لئے کہ خالص حق میں کمزوری کا شائبہ نہ رہ جائے وہ اپنے ساتھ والے مجمع کو ایک خالص اسلامی جماعت کی مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے اگر ان میں سے کسی ایک فرد کی طرف سے کمزوری ہو جاتی تو پورے مجمع کی وہ کامل شان باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

میں سچ کہتا ہوں کہ مباہلہ میں رسولؐ کو خالص افراد اتنے ہی ملے تھے جو بالکل اپنے تھے ورنہ وہ اوروں کو بھی اپنے ساتھ ضرور لاتے حسینؑ

اگر کربلا میں صرف اپنی جان اسلام کی خاطر نثار کر دیتے تو مسلمانوں کے لئے صحیح نمونۂ عمل پورے طور پر نہ ملتا اس لئے کہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ معصوم تھے۔ غیر معصوم اتنا سخت امتحان نہیں دے سکتا۔ حسینؑ اپنے ساتھ اگر صرف بنی ہاشم کو لائے ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہاشمی خون کا اثر تھا وہ شیر فاطمہؑ کی طاقت تھی جو بنی ہاشم یا اولادِ علیؑ و فاطمہؑ سے مخصوص تھی۔ دوسرے کے بس کی یہ بات نہیں ہے لیکن حسینؑ نے اپنے ساتھ غیر خاندان ال کی تمام جماعتوں کے بہت سے اصحاب انصار و اعوان کو مثال میں پیش کیا جن کے خیالات و احساسات و جذبات میں حلقۂ مشترک سوائے نصرت اسلام کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ حقیقتاً اتنے ہم آہنگ ہم دل، ہم زبان، ثابت قدم، مستقل، پختہ مسلمان دنیا کے سامنے بطور نمونہ عمل کے نہ واقعہ کربلا کے پہلے کبھی پیش ہوئے نہ واقعہ کربلا کے بعد اور یہ واقعہ کربلا کا وہ پہلو ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو ہمیشہ اس کی یاد تازہ رکھنا چاہیئے۔

خاندانِ ہاشم کی قربانی

یوں تو کربلا کی جنگ کوئی خاندانی جنگ بنی ہاشم کی بنی اُمیّہ کے خلاف نہ تھی باوجودِ قلت تعداد امام حسینؑ کے ساتھ تقریباً عرب کے ہر قبیلے اور مختلف مقامات کے ممتاز اور مذہبی حیثیت سے سربرآوردہ افراد موجود تھے۔ بلکہ کچھ غیر عرب تھے یہ سب وہ تھے جن میں نقطہ مشترک صرف اصول کا احساس اور ایک وجہ خاص یعنی فریضۂ دینی کا اتحاد ہی تھا اور بس پھر بھی اس مقصدِ بلند کی خاطر جس کے واسطے غیر بنی ہاشم اس طرح جاں نثاری کر رہے تھے یقیناً بنی ہاشم جنھیں دینی روایات سے ساتھ دوسروں سے زیادہ وابستگی تھی زیادہ حق رکھتے تھے کہ ان کی قربانیاں زیادہ نمایاں حیثیت رکھتی ہوں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

"کربلا میں بنی ہاشم کی قربانیوں کا وزن اسی طرح ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے جس طرح اسلام کے ہر معرکہ میں بنی ہاشم کے کارناموں کو جناب رسولِ خدا کے ساتھ حضرت حیدرِ کرارؑ اور حمزہ و جعفرِ طیارؑ کے ذریعے سے امتیازِ خاص رہا تھا۔"

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ کربلا میں بنی ہاشم کے سر اس بے مثال کارنامہ قربانی کا سہرا صرف ان کے ایک گھرانے کی بدولت بندھا ہے اور وہ اولاد حضرت ابوطالب کربلا میں اٹھارہ بنی ہاشم شہید ہوئے ہیں ان میں سوا جناب ابوطالب رضوان اللہ علیہ کی نسل طاہر کے اور کون تھا۔

علی اکبرؑ و علی اصغرؑ ہیں وہ فرزندانِ حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ۔ قاسمؑ و عبداللہ ہیں۔ وہ فرزندانِ حسنؑ بن علیؑ بن ابی طالبؑ۔ خود حضرت سید الشہداءؑ اور ابوالفضل العباسؑ اور ان کے بھائی علاوہ ازیں فرزندانِ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب وہ جعفر و عبدالرحمٰن و محمد ہیں۔ اور فرزندانِ عقیل مسلم بن عقیل

بن ابی طالب بس الذی سے اٹھارہ کی تعداد پوری ہو جاتی ہے۔

یہ فخر قدرت کی طرف سے حضرت جناب ابو طالب کی اولاد کو عطا ہوا ہے کہ جس طرح ان کے مورث اعلیٰ حضرت ابو طالب نے آغاز اسلام میں اسلام اور پیغمبر اسلام کو بچایا اسی طرح سنہ ۶۱ھ میں جب اسلام خطرہ میں ہوا تو ان ہی کی اولاد تھی۔ جس نے اسلام کی حیات ثانیہ اور بقا کے بجائے کے لئے کربلا کی عظیم قربانی پیش کر کے یہ تو رحیم کا درجہ حاصل کیا۔

ان مفتخر بنی ہاشم افراد آل ابی طالب کے ذاتی کردار و رفعت کے علاوہ ان خصوصی اسناد کے بجز ان میں سے متعدد افراد کو حاصل ہیں جیسے حضرت علی اکبرؑ کے بارے میں حضرت سید الشہداء کے یہ الفاظ جو بوقت رخصت فرمائے اللھم اشھد علیٰ (یعنی) خداوندا گواہ رہنا کہ اب وہ جوان جا رہا ہے جو صورت سیرت اور رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے سب سے زیادہ مشابہ ہے۔"

اس میں صرف مشابہت صورت کا ذکر نہیں ہے بلکہ مشابہت سیرت کا بھی۔ جو حضرت علی اکبرؑ کے لئے اس بلندئ کردار کا ثبوت ہے جس کا تصور کسی غیر معصوم کے بارے میں بہت دشوار ہے یا حضرت ابو الفضل العباسؑ کے بارے میں افضل الشہداء کی سند یا امام جعفر صادق کی زبان سے آپ کی مدح میں جو الفاظ وارد ہوئے ان سب کے علاوہ مشترکہ طور پر ان تمام حضرات کی بلندئ کردار کے ثبوت کے لئے امام حسینؑ کے وہ الفاظ کافی ہیں جو شب عاشور کے خطبے میں ارشاد فرمائے تھے۔

انی لا اعلم اصحابا اوفیٰ من اصحابی

مجھے نہیں معلوم کوئی اصحاب جو میرے اصحاب سے زیادہ باوفا ہوں اور نہ کوئی عزیز و اقارب جو میرے عزیزوں سے زیادہ ادائے حقوق اور حسن سلوک کرنے والے ہوں۔

پھر کربلا کے میدان میں ان کے موقف کا خصوصی امتیاز تمام اصحاب کے مقابلے میں ترتیب شہدا سے ظاہر ہے جس پر ہم نے اپنی مشہور ترین کتاب "شہیدِ انسانیت" میں روشنی ڈالی ہے کہ سطحی نظر میں مجاہدین کی یہ ترتیب خلافِ قیاس سمجھی جا سکتی ہے اس لئے کہ عملی رہنمائی کا تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت امام حسین علیہ السلام خود میدانِ جہاد میں قدم رکھتے ہوئے عملی مثال پیش فرماتے پھر آپ کے عزیز یکے بعد دیگرے جاتے اور آخر میں اصحاب کی نوبت آتی حضرت علی بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ میں رسول اللہؐ کے طریقہ جنگ کے متعلق فرمایا ہے کہ آپ خطرے کے موقعوں پر اپنے اہلِ بیت اور لوگوں کو آگے رکھتے تھے اور انھیں اپنے اصحاب کی سپر بناتے تھے مگر میدانِ کربلا میں ترتیب دوسری رکھی گئی۔ یہاں اصحاب پہلے میدان میں بھیجے گئے اور پھر اعزا اور آخر میں خود امام حسینؑ تشریف لے گئے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا اور دوسرے معرکوں کی نوعیت میں بڑا فرق تھا دوسرے ہر موقع پر یہ یقینی تھا کہ کچھ لوگ قتل ہوں گے اور کچھ صحیح و سلامت محفوظ رہیں گے لہٰذا یہ کوشش کی جاتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خطرہ وہی برداشت کریں جو رسول اللہؐ کے ساتھ خاندانی تعلق رکھتے ہوں اور وہ لوگ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں۔ جو غیروں کی حیثیت رکھتے ہوں مگر معرکہ کربلا میں تو یہ طے شدہ تھا کہ زندہ بچنے والا کوئی نہیں جتنے ہیں سب کو شہید ہونا ہے اگر کسی کو زندہ رہنا ہوتا تو اس کے لئے شبِ عاشور کا موقع دے دیا گیا تھا جب حضرت امام حسینؑ نے باصرار تمام فرمایا کہ

"مجھے تنہا اس خطرے کو قبول کر لینے دو"

"تم سب جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ"

مگر سب نے اس اجازت سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا اور اپنی جانیں قربان کرنے کے عزم بالجزم کا اعلان کر دیا اس کے بعد اب یہ سوال باقی ہی نہیں رہا تھا کہ کون قتل ہوگا اور کون زندہ رہے گا۔ اب تو ہر ایک کے سامنے بس موت ہی تھی۔

اس کے بعد سوال ہے تو صرف قبل اور بعد کا مگر واقعۂ کربلا کی نوعیت یہ تھی کہ جتنا وقت گزرتا جاتا تھا امتحان سخت تر ہوتا جاتا تھا۔ پانی بند تھا ہی اور روز عاشور دن چڑھنے اور حرارت آفتاب میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ پیاس کی تکلیف لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جاتی تھی پھر اس حالت میں کثیر التعداد دشمنوں سے پیہم نبرد آزمائی ساتھیوں کی جدائی اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ جتنی بھی کسی مجاہد کی شہادت میں دیر واقع ہوتی تھی اس کا امتحان شدید ہوتا جاتا تھا۔

اسی لئے حُر کو جو نو وارد تھے سب سے پہلے میدان میں جانے کی اجازت دیدی حبیب بن مظاہر وغیرہ خاص خاص اصحاب دوپہر تک موجود رکھے اور جب تک اصحاب میں سے ایک بھی باقی رہا بنی ہاشم میں سے کسی کو اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اسی طرح بنی ہاشم کے ایک ایک بچے نے جتنی سختی برداشت کی وہ اصحاب میں سے کسی نے برداشت نہیں کی اور سب سے زیادہ سخت تر امتحان خود حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا تھا جنھوں نے اصحاب کے بھی غم اٹھائے اور پھر عزیزوں کے بھی صدمے برداشت کئے یہاں تک کہ چھ مہینے کے بچے کا بھی ہدیہ راہ خدا میں پیش کر دیا اس وقت خود منزل شہادت کی طرف روانہ ہوئے۔



توحید اور امام حسینؑ

کارنامۂ حسینیؑ یعنی مجاہدۂ کربلا کا اصل سرچشمہ وہی کلمۂ توحید ہے جس کی اشاعت میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں جسمِ مبارک پر پتھر کھائے اور اس کے تقاضوں کی تکمیل میں اُن کے فرزند حسینؑ نے کربلا میں جسمِ اقدس پر تلواریں کھائیں۔

یہ لا الٰہ الا اللہ فقط ایک وِرد اور وظیفہ تھوڑی تھا جو مسلمانوں کو سکھایا گیا ہو کہ وہ زبان پر جاری کر لیں اور بس! بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ اللہ کے مقابلہ میں کسی دوسرے اقتدار کے قائل نہ ہو۔ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے سامنے سر نہ جھکاؤ اور اس کے قانون پر عمل کے معاہدہ کے بعد جو از روئے فطرت پہلے ہی لازم بلکہ عائد تھا اور اب اقرارِ اسلام کے بعد اس نے رسمی شکل بھی اختیار کر لی ہے اب کسی دوسرے کے غیر مشروط اطاعت کا عہد و پیمان جس کا نام "بیعت" ہے نہ کرو۔ کسی خطا کار کا کسی اللہ کے بندے سے بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ اس عہد و پیمان کی نفی ہے جو خالق کی جانب سے بر بنائے توحید عائد ہوتا ہے اور جس کی تکمیل ہر مسلمان یعنی ہر سچے انسان کا لازمی فریضہ ہے۔

وہ توحید ہی کا ایک تقاضہ ہے جس کے تحت یہ اصول قائم ہوا ہے۔

"لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے یہاں تک کہ قرآن مجید میں پیغمبرِ خداؐ کی اطاعت کا بھی حکم دیا تو یہ کہہ دیا گیا کہ "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ" جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی" یعنی مرکزِ اطاعت درحقیقت ایک ہی ہے یہ شخصیں تصور نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کر رہے ہیں اور اسی سے مسلمانوں کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ اولی الامر بھی جن کی اطاعت بعد رسولؐ فرض قرار دی گئی ہے ایسے ہی افراد ہو سکتے ہیں جن کا کوئی حکم خالق کے حکم سے

کبھی متصادم نہ ہوتا ہو بلکہ جن کا ارادہ و مشیئت ہمیشہ مشیئتِ خالق کا پابند رہتا ہو اس لئے ان کی اطاعت اطاعت خالق سے الگ نہ ہو۔

اس بنا پر حضرت امام حسینؑ کے سامنے یزید کی بیعت کا سوال پیش ہونا فقط کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا بلکہ یہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تعلیم توحید کی روشنی میں اسلام اور نفی اسلام کا سوال تھا۔

حقیقت میں یہ ایک یزید نہ تھا جو امام حسینؑ سے طلبگار بیعت ہو بلکہ حضرت کے مقابل میں نمرود اور فرعون اور پھر ابوجہل وغیرہ سب کی روحیں تھیں جو یزید کے پیکر میں بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کے عہد و پیمان کی طلبگار تھیں اور حسین ابن علیؑ۔ ابراہیمؑ۔ موسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نمائندہ ہوتے ہوئے غیر اللہ کی اس اطاعت سے انکار کر دینا اپنا فرض عین سمجھتے تھے جس فرض کو انھوں نے ناقابل تصور مشکلات کے باوجود پورا کیا اور اس طرح توحید الٰہی کے اس پرچم کو بلند رکھا جسے ان کے جد بزرگوار حضرت محمد مصطفےٰ نے اونچا کیا تھا اور جس کے ان کے آباؤ اجداد اور اب خود محافظ تھے۔ (ہفت روزہ شیعہ لاہور ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء)



قتیل العبرۃ

کشتۂ گریہ پر عقیدت کے چند آنسو

ماہ محرم کا غم انگیز ہلال آسمان پر نمودار ہو گیا گھر گھر مظلوم کربلا کی صف ماتم بچھ گئی صدیوں کے زخم جنہوں نے پاک عقیدت مند مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے تازہ ہو گئے ہر قوم اپنے مذہب کے موافق اس کا اثر لیتی ہے کربلا میں بے گناہ شہید ہو جانے والا مظلوم تھا بھی اس قابل کہ اس کا رنج عالم کو گرویدہ تاثیر بنا گئے۔ قدرت نے بھی اس اثر کے بقاء کا اہتمام کیا اور دامن افق کو ہمیشہ کے لئے شفق سے خون آلود بنا کر اس خون ناحق کا یادگار رشتا ہمیشہ قرار دے دیا۔

شیعہ و سنی افراد کو جانے دو وہ تو رسولِ پاک کا کلمہ پڑھتے اور حسینِ مظلوم کی محبت کے دعویدار ہیں ہندو اور پارسی اقوام بھی اس رنج کا حصہ لیتے اور شہید کربلا کی مظلومیت کا تذکرہ کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ اسلام کا دعویٰ کرنے والے بعض نام نہاد افراد اس مصیبت کا اثر مٹا دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے نظر آتے ہیں یہ بات اور ہے کہ یہ کوشش ان کی نقش بر آب اور قدرت کے مقابلے میں ناکام ہے۔

عام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سب سے پہلے جو چیز اس قابل ہے کہ سر تسلیم اس کے سامنے خم ہو جائے وہ کتاب اللہ اور قول رسولؐ، فعل رسولؐ تقریر رسولؐ ہے اس کے بعد صحابہ کرام کی سیرت اور تابعین کا طرز عمل ہے ان میں سے اگر ایک چیز موجود ہو، تو مطلب کے ثابت کرنے کے لئے کافی

ہے چہ جائیکہ تمام ادلہ و براہین پہلو بہ پہلو ہو کر کسی مطلب کو ثابت کریں۔

قرآن مجید سے گریہ وزاری کا ثبوت

خداوند عالم جناب یعقوبؑ کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے

"وابیضت عیناہ من الحزن فھو کظیم"

"ان کی آنکھیں رنج و غم سے سفید ہو گئی تھیں"

(سورۂ یوسفؑ)

علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

ماجفت عیناہ منذ فراق یوسف الی حین لقائہ ثمانین عاما وما علی وجہ الارض اکرم منہ

(یعنی) یعقوب کی آنکھیں فراق یوسف میں ۸۰ برس تک خشک نہیں ہوئیں ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی تھیں حالانکہ ان سے بڑھ کر اس وقت خدا کا مقرب بندہ کوئی نہ تھا۔

اور اسی تفسیر میں جناب رسالت مآبؐ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ یعقوبؑ کا رنج یوسفؑ کے فراق میں کس حد پر تھا؟ انھوں نے کہا کہ ستر پسر مردہ عورتوں کے برابر۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ ثواب ان کو کس حد تک ملا جواب دیا کہ سو شہیدوں کے برابر ثواب عطا کیا گیا۔

اس آیت سے بضمیمۂ تفسیر چند باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت یعقوبؑ باوجود مرتبۂ نبوت یوسف کے فراق میں ۸۰ برس تک شب و روز روتے رہے۔

۲۔ قرآن مجید میں اس فعل کا تذکرہ بغیر کسی اعتراض کے درج کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظر احدیت میں یہ فعل محمود و مستحسن تھا، ورنہ قرآن جو امت اسلامیہ کی تعلیم کے لئے ان واقعات کا تذکرہ کرتا ہے ضرور اس پر اعتراض کرتا۔

۳۔ ان کے گریہ و بکا نے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اس

حزن و غم کے تذکرے کے بعد ثواب کا ذکر کرنا بتلاتا ہے کہ یہ حزن و غم عبادت تھا۔

فعلِ رسولؐ

خود جناب رسالت مآبؐ وقت مصیبت بے چین ہو کر روئے ہیں اور بہ آواز بلند گریہ فرمایا ہے کتب اسلامیہ اس قسم کے واقعات سے پر ہیں ہم اس موقع پر بعض حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

١۔ ابن عبد البر نے استیعاب میں لکھا ہے

عن جابر بن عبد اللہ قال لما رأی النبی صلی اللہ علیہ وسلم حمزۃ قتیلا بکی فلما رأی ما مثل بہ شہق۔ (استیعاب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد جلد ا صفحہ ١٠)

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ جب حضرت رسولؐ نے حمزہ کو مقتول پایا تو گریہ فرمایا اور جب ان کے اعضائے بریدہ پر نظر پڑی تو چیخ مار کر روئے۔

علی بن برہان الدین شافعی محدث نے انسان العیون میں تحریر کیا ہے

عن ابن مسعود ما رأینا رسول اللہ باکیا اشد من بکائہ علی حمزۃ وفی القبلۃ ثم وقف علی جنازتہ وانتحب حتی نشغ ای شہق حتی بلغ بہ الغشی یقول یا عم رسول اللہ واسد رسولہ یا حمزۃ یا فاعل الخیرات یا مزیل الکربات یا ذاب یا لذال المعجمۃ ای یا مانع عن وجہ رسول اللہ۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت رسولؐ کو کبھی اس شدت سے روتے نہیں دیکھا جیسے حضرت حمزہؓ پر گریہ فرمایا۔ قبلہ رُخ لاش کو رکھ کر لاش کے قریب کھڑے ہوئے اور ایک چیخ ماری یہاں تک کہ غش آ گیا اور حضرت یوں نوحہ پڑھ رہے تھے۔

"اے رسولؐ خدا کے چچا، اے خدا و رسولؐ کے شیر، اے حمزہؓ اے نیک باتوں

کے کرنے والے، اے دین پر سے مصیبتوں کے دور کرنے والے، اے رسولؐ سے دشمنوں کو ہٹانے والے۔"

اور علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے واقدی سے نقل کیا ہے کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یومئذ اذا بکت صفیۃ یبکی واذا نشجت ینشج (شرح نہج البلاغۃ طبع مصر جلد ۳ ص ۳۸۶)

حضرت رسول خداؐ کی روز اُحد یہ حالت تھی کہ جب صفیہ (خواہر حمزہؓ) روتی تھیں حضرتؐ پر گریہ طاری ہو جاتا تھا اور جب روتے روتے ان کے گلے میں پھندے پڑنے لگتے تھے تو حضرتؐ کی بھی وہی حالت ہو جاتی تھی کیا اس سے بڑھ کر بیتابی اور گریہ و بکا کی حالت ہو سکتی ہے۔؟ اس کے بعد گریہ و بکا کو خلافِ شرع بتلانا فعل رسولؐ پر اعتراض کی صورت رکھتا ہے۔

دوسرا موقع

حضرت رسولؐ کریم نے اپنے فرزند ابراہیم کے احتضار کے وقت گریہ فرمایا چنانچہ علامہ ابن عبد البر مالکی اپنی کتاب استیعاب میں لکھتے ہیں۔

عن انس قال لقد رأیت ابراھیم وھو یکید بنفسہ بین یدی النبیؐ فدمعت عینا رسول اللہ وقال یدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی الرب وانا بک یا ابراھیم لمحزونون (استیعاب ص ۲۳)

انس سے روایت ہے کہ میں نے ابراہیم کی حالت نزع کا مشاہدہ کیا ہے کہ اس وقت حضرت رسولؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور حضرتؐ فرما رہے تھے کہ آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل کو صدمہ پہنچتا ہے لیکن ہم ایسی بات نہیں کہتے جو خدا کو ناراض کرے لے ابراہیم ہم کو تمھارا دلی صدمہ ہے۔"

اس حدیث میں جس طرح فعل رسولؐ سے گریہ و بکا کا جواز ثابت

ہوتا ہے زبانی ارشاد سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی خلاف شرع ہے وہ ایسے الفاظ کا زبان سے جاری کرنا جو خدا کی مرضی کے خلاف ہوں لیکن آنکھوں سے آنسوؤں کا بہانا یا مصیبت کا اثر لینا کسی طرح ناجائز نہیں ہو سکتا۔

اس روایت کو حافظ ابن جوزی حنبلی نے اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں بھی نقل کیا ہے اور صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۴۸ میں حضرت رسولؐ کی گریہ وزاری کے واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے۔

فقال له عبد الرحمٰن بن عوف انت یا رسول الله قال یا ابن عوف انها رحمة ثم اتبعها باخری فقال ان العین تدمع والقلب یحزن۔

عبد الرحمٰن بن عوف نے (اعتراض کیا اور) کہا کہ آپ یا رسول اللہ اور اس طرح گریہ کریں!۔

حضرت نے فرمایا "اے ابن عوف یہ رقت قلب کی علامت ہے۔ پھر دوبارہ گریہ فرمایا اور کہا کہ بلاشبہ آنکھیں رو رہی ہیں اور قلب محزون ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ باوجود صحابی کے ٹوکنے کے حضرت رسولؐ نے گریہ فرمایا اور اپنے عمل سے ظاہر کیا کہ گریہ کسی طرح خلاف شرع نہیں ہے۔

تیسرا موقع

مشکوٰۃ میں صحیح مسلم سے منقول ہے۔

عن ابی هریرة زار النبیؐ قبر امه فبکی وابکی من حوله۔ ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضرت رسولؐ نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اور خود بھی روئے اور اپنے گرد کے لوگوں کو بھی رلایا۔

اگرچہ سابق کی حدیث سے کسی مصیبت کے وقوع پر گریہ کا جواز ثابت ہو چکا تھا لیکن یہ حدیث اس بات کو بتلاتی ہے کہ کسی عرصہ دراز کی مصیبت کو یاد کر کے رونا بھی جائز ہے بلکہ دوسروں کو رلانا بھی جائز

ہے اس سے مجلس عزا کی مشروعیت پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

چوتھا موقع

زید بن حارث اور جعفر طیار اور عبداللہ بن رواحہ کی شہادت سُنکر حضرتؐ نے گریہ فرمایا اس کو امام بخاری نے کتاب الجنائز کے صفحہ ۳ پر اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور ابن بخاری عبدالبر نے استیعاب میں زید بن حارث کے حالات میں لکھا ہے کہ

ان النبی بکی علی جعفر و زید وقال اخوای وموانسای ومحدثای حضرت رسولؐ نے جعفر اور زید پر گریہ کیا اور فرمایا ہائے میرے بھائی اور میرے مونس تنہائی اور مجھ سے باتیں کرنے والے۔

پانچواں موقع

حضرت کی کسی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرتؐ قبر پر بیٹھے وعیناہ تدمعان درآنحالیکہ حضرتؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے (دیکھو صحیح بخاری جلد اول ص ۱۲۶)

چھٹا موقع

صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۴۶ اور صحیح مسلم باب البکا علی المیت میں مذکور ہے کہ حضرت کی کسی صاحبزادی کے بچے کا انتقال ہو گیا تھا تو حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فقال سعد ما ھذا یا رسول اللہ قال ھذا رحمۃ جعلھا اللہ فی قلوب عبادہ وانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء سعد بن ابی وقاص نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ کیا؟ فرمایا یہ رقت قلب ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دل میں ودیعت کیا ہے

خدا ان ہی بندوں پر رحم کرتا ہے جن کے دل میں رحم ہو اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ گریہ فطری امر ہے۔

ساتواں موقع

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔

قال اشتکی سعد فعادہ رسول اللہ مع جماعۃ من اصحابہ فوجدہ فی غشیۃ فبکی قال فلما رای القوم بکاءہ بکوا۔ سعد بن ابی وقاص بیمار ہوئے اور حضرت رسول اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ عیادت کے لئے گئے سعد کو بے ہوش پایا تو حضرت رونے لگے جس کی وجہ سے تمام مجمع پر گریہ طاری ہو گیا۔ کیا اس کے بعد گریہ و زاری کے جواز میں شبہ کرنا رسول کے افعال اور شرعی احکام کا مقابلہ نہیں ہے۔

تقریر رسول

جس طرح خود رسالت مآبؐ کے فعل سے رونے کا جواز ثابت ہے اسی طرح دوسروں کو کسی مصیبت پر روتے دیکھ کر رسولؐ کا منع نہ کرنا بلکہ منع کرنے والے کو روکنا بھی منقول ہے۔ دیکھو جامع الاصول میں ہے۔ مات میت من آل محمد فاجتمع النساء یبکین علیہ فقام عمر ینہاہن فقال رسول اللہ دعہن یا عمر فان العین دامعۃ والقلب مصاب والعہد قریب (اخرجہ النسائی)

اہل بیت رسولؐ میں کوئی موت ہو گئی تو تمام عورتیں جمع ہو کر گریہ و زاری کرنے لگیں۔ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر سب کو منع کیا اور روکنا شروع کیا جس پر حضرت رسولؐ نے فرمایا چھوڑ دو ان کو اے عمرؓ کیونکہ آنکھیں روتی ہیں اور دل دکھتا ہی ہے اور ابھی تو زمانہ مصیبت کچھ زیادہ دور

نہیں ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ رونے والوں کو جب منع کر رہے تھے تو رسالت مآبؐ کو ناگوار ہوا اور آپؐ نے منع کیا اگر گریہ کسی حیثیت سے ناجائز ہوتا تو کبھی حضرت رسولؐ اس کو گوارا نہ فرماتے کم از کم خود ممانعت نہ کی تھی تو دوسرے کے ممانعت کرنے پر سکوت فرماتے مگر برخلاف اس کے آپؐ نے ممانعت سے روکا جو جواز کی صریحی دلیل ہے۔

دوسرا موقع

امام احمد بن حنبل نے رقیہ دختر حضرت رسولؐ کی وفات اور عورتوں کے گریہ کے متعلق ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں فجعل عمر یضربهن بسوطه فقال النبیؐ دعهن یبکین ثم قال مهما یبکین القلب والعین فمن الله والرحمة وقعد علی شفیر القبر وفاطمة الی جنبه تبکی قال فجعل النبیؐ یمسح عین فاطمة بثوبه رحمة لها (مسند احمد جلد اول)

حضرت عمر اپنے کوڑے سے عورتوں کو مارنے لگے حضرت نے فرمایا کہ چھوڑ دو ان کو کہ روتی رہیں۔

پھر فرمایا کہ "دل اور آنکھ سے جہاں تک تعلق ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور رقتِ قلب کی علامت ہے۔ اور حضرتؐ شفیر قبر پر بیٹھ گئے حضرت فاطمہؑ آپؐ کے پہلو میں رو رہی تھیں تو حضرت بمقتضائے شفقت اپنے کپڑے سے آنکھیں پونچھتے تھے۔

تیسرا موقع

مسند امام احمد بن حنبل میں ابو ہریرہ سے روایت ہے
مرّ علی رسول الله جنازة معها بواکی فنهی هن عمر

فقال رسول اللہ دعھن فان النفس مصابۃ والعین دامعۃ (جلد دوم صفحہ ۳۳۲)

جناب رسالت مآبؐ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا جس کے ساتھ عورتیں رو رہی تھیں حضرت عمر نے ان کو منع کیا تو رسولؐ نے فرمایا چھوڑ دو ان کو کیونکہ دل کو رنج پہنچتا ہی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنا فطری ہے۔

چوتھا موقع

علامہ ابن عبدالبر قرطبی مالکی نے استیعاب میں ابوالربیع عبداللہ بن ثابت انصاری کے حال میں لکھا ہے کہ

کفنہ رسول اللہ فی قمیصہ فقال لجبیر بن عتیکؓ ان نھی النساء عن البکاء علیہ دعھن یا اباعبدالرحمٰن فلیبکین ابا الربیع مادام بینھن (استیعاب جلد ۱ صفحہ ۳۵۲)

حضرت رسالت مآب نے ان کو اپنی قمیص کا کفن دیا اور جبیر بن عتیک (صحابی) نے جب عورتوں کو رونے سے منع کیا تو حضرت نے فرمایا کہ چھوڑ دو۔ ان کو اے ابوعبدالرحمٰن جب تک ابوالربیع کا جنازہ ان کے درمیان ہے یہ روتی رہیں۔

اس روایت کا باختلاف الفاظ ابن اثیر جزری نے اسد الغابہ میں بھی نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ثالث صفحہ ۱۲۸)

پانچواں موقع

استیعاب ابن عبدالبر صفحہ ۳۸ جلد اول میں جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ

لما جیئی بابی یوم احد وجاءت عمتی تبکی علیہ قال فجعلت ابکی وجعل القوم ینھں لی ورسول اللہ لا ینھانی

فقال رسول اللہ ابکوہ او لا تبکوہ فواللہ مازالت الملائکتہ تظلہ باجنحتہا حتی دفنتموہ

"روایت ہے جب میرے پدر بزرگوار کی لاش لائی گئی اور میری پھوپھی روتی ہوئی آئیں تو میں بھی رونے لگا لوگ مجھ کو منع کرنے لگے مگر رسولؐ نے مجھ کو منع نہیں کیا اور فرمایا کہ لوگو رو‌ؤ یا نہ روؤ۔ خدا کی قسم ملائکہ اپنے پروں کا سایہ کیے رہے یہاں تک کہ تم نے لاش کو دفن کیا۔

اس روایت کو علامہ ابن اثیر جزری نے بھی اپنی کتاب اسد الغابہ (جلد ثالث) میں تھوڑے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ درحقیقت گریہ و بکا سے ممانعت ایک جاہلیت کی رسم تھی جو اکثر افراد میں طبیعت ثانیہ کے طور پر رائج ہو گئی تھی۔ اہل جاہلیت کا عقیدہ تھا کہ گریہ و بکا کی وجہ سے جوش انتقام فرو ہو جاتا ہے اور بزدلی پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہ لوگ سختی سے اپنی عورتوں کو رونے سے باز رکھا کرتے تھے اور اس کا مقام فخر میں ذکر کیا کرتے تھے۔ عرب کا شاعر اپنے مایۂ ناز محاسن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

معاذ الالٰہ ان تنوح نساؤنا
علی ھالک اوان نضج من القتل

"خدا کی پناہ اس بات سے کہ ہماری عورتیں نوحہ کریں کسی مرنے والے کے اوپر یا ہم قتل سے چیخ اٹھیں"۔

اس عادت کا فلسفہ اگرچہ مذکورہ بالا اصول پر مبنی تھا لیکن

رفتہ رفتہ رونے سے نفرت عادت بن گئی اور وہ قساوت قلب اور بے رحمی کا پیش خیمہ قرار پائی۔ رونے سے منع کرنا درحقیقت طبیعت میں ایسی عادت کے نفوذ کا اثر تھا جس کی وجہ سے رسولؐ کا ایک مرتبہ نہیں بلکہ چند مرتبہ کا ارشاد بھی ان کی طبیعت کو نہ بدل سکا اور آخر عمر تک ان میں یہ عادت باقی رہی۔

قولِ رسولؐ

واقعات تو یہاں تک بتلاتے ہیں کہ خود حضرت رسولؐ نے گریہ وزاری پر آمادہ کیا ہے اور صحابہ کو ترغیب دی ہے چنانچہ مطالب المومنین اور تفسیر کبیر میں محمد بن ابی جعفر سے نقل ہے۔

قال قدم علینا رجل من الانصار فحدثنا من حدیثه عن رسول الله انه مر ببنی اسد وهم یبکون قتلاهم یوم احد فقال لکن حمزة لا بواکی له قالت النساء فخرجنا حتی اتینا رسول الله فندبنا حمزة ورسول الله فی البیت حتی سمعنا نشیجه فارسل الینا قد اهبتم او قد احسنتم قال السرخسی انما قال ذالک لان حمزة کان سید الشهداء یومئذ ولکنه کان غریبا فی جوار رسول الله وفی المغازی ان سعد بن معاذ وسعد بن عبادة ومعاذ بن جبل لما سمعوا ذالک جاءوا بنساء قومهم الی دار رسول الله یندبن حمزة حتی نام ومن ذالک جری الرسم بالمدینة اذا مات احد یبتدئن اولا بالبکاء علی حمزة۔

محمد بن ابی جعفر کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک شخص انصار میں سے آیا اس نے منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بیان کی کہ رسالتمآب کا گزر بنی اسد کی طرف سے ہوا اس وقت وہ اپنے مقتولین جنگ احد پر

روتے تھے حضرت نے فرمایا "افسوس حمزہؓ پر کوئی رونے والا نہیں ہے۔
عورتیں کہتی ہیں کہ ہم اپنے گھروں سے نکل کر خانہ رسولؐ میں آئے
اور ہم نے حمزہؓ پر گریہ و زاری کی اس وقت رسالت مآبؐ گھر میں موجود
تھے اور ہم ان کی تسبیح کی آواز سن رہے تھے آپ نے ہمارے
پاس پیغام بھیجا کہ تمہارا بڑا احسان ہوا۔

سرخسی نے کہا ہے کہ حضرت نے یہ افسوس اس لئے کیا تھا کہ حمزہؓ
اس دن سید الشہداء تھے مگر عالم مسافرت میں انتقال ہوا تھا تو
رسالتمآبؐ نے مرثیہ پڑھوایا اور کتاب مغازی میں ہے کہ سعد بن
معاذ اور سعد بن عبادہ اور معاذ بن جبل نے یہ سنا تو اپنے گھرانے
کی عورتوں کو خانہ حضرتؐ میں لائے اور انھوں نے حمزہؓ پر نوحہ کیا۔
اور اس دن سے مدینے میں یہ رسم جاری ہوگئی کہ جب کوئی مرتا تھا تو
پہلے حمزہؓ پر گریہ و بکا کر لیتے تھے۔

اس روایت کو امام احمد بن حنبل نے اپنے مسند میں بایں الفاظ نقل
کیا ہے۔

رجع رسول الله من احد فجعلت نساء الانصار يبكين
على من قتل من ازواجهن فقال رسول الله ولكن
حمزة لا بواكى له قال ثم نام فانتبه وهن يبكين قال
فهن اليوم اذا يبكين يبدأن بحمزة۔ (جلد ۳ صفحہ ۴۰)

حضرت رسول خدا نے احد سے مراجعت فرمائی تو انصار کی عورتیں
اپنے شہید شدہ عزیز و اقارب پر رونے لگیں۔ حضرت نے فرمایا کہ
افسوس حمزہ پر رونے والی عورتیں موجود نہیں۔ حضرت سو گئے آنکھ
جو کھلی تو صحابہ کی عورتیں حمزہؓ پر رو رہی تھیں۔ راوی کہتا ہے کہ اب تک
یہ رسم ہے کہ جب عورتیں صحابہ کو روتی ہیں تو پہلے حمزہؓ پر گریہ کرتی ہیں۔

نیز اس روایت کو طبری اور ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں اور ابن عبد البر
قرطبی نے عقد فرید میں اور ابن عبد البر نے استیعاب میں بھی ذکر کیا ہے۔

جس کے بعد اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔
غور کے قابل تو یہ ہے کہ حمزہؓ نے مسافرت میں انتقال کیا تھا اور کوئی رونے والا نہ تھا تو حضرت رسولؐ نے انصار کی عورتوں سے گریہ و بکا اور نوحہ کرایا اور یہ رسم جاری ہو گئی کہ کسی عزیز کی موت میں سب سے پہلے حمزہؓ پر گریہ کیا جاتا تھا تو پھر کسی مظلوم کے عالم مسافرت میں شہید ہونے ان کے اعزّا کے رو سکنے پر اگر ہم گریہ و زاری کریں تو کون سا محل طعن ہے پھر جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حمزہ کی مظلومیت سید الشہداء کی مظلومیت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی، شہید کربلا پر مصائب کا خاتمہ ہو گیا تھا اور یقیناً رسولؐ کے دل میں حسینؑ کی جتنی محبت تھی وہ بھی حمزہؓ سے زیادہ ہے۔ پھر حضرت امام حسینؑ پر گریہ کہاں تک خدا و رسولؐ کی نظر میں ممدوح و مستحسن نہ ہو گا۔

دوسری روایت

ابن عبدالبر نے استیعاب فی اسماء الاصحاب میں جعفر بن ابی طالب کے تذکرے میں لکھا ہے۔

لما اتی النبیؐ نعی جعفر اتی امرأتہ اسماء بنت عمیس فعزاھا زوجھا جعفر ودخلت فاطمۃ رضی اللہ عنھا وھی تبکی وتقول واعماہ فقال رسول اللہ علی مثل جعفر فلتبک البواکی۔ (استیعاب جلد ا ص۸۲)

جب حضرت رسولؐ کو جعفر کی خبر شہادت پہنچی تو حضرتؐ انکی زوجہ اسماء بنت عمیس کے یہاں تشریف لے گئے اور ان کو جعفر کا پرسہ دیا۔ اسی اثناء میں فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا روتی ہوئی آئیں اور کہہ رہی تھیں ہائے میرے چچا! رسولؐ نے فرمایا کہ جعفر ایسے شخص پر رونے والیوں کو رونا چاہیے۔

ایک تو سیدۃ النساء العالمین کا فعل خود حجت اور واجب الاتباع ہے کیونکہ یہ معظمہ باتفاق علمائے امت آیۃ تطہیر میں داخل اور بقول اکابر علمائے اہلسنت مریم و آسیہ سے افضل تھیں اس کے ساتھ رسولؐ کا اس فعل سے منع نہ کرنا جواز کی صریح علامت ہے اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو مطلب ثابت تھا مگر رسالت مآبؐ نے اپنے قول سے شبہ کی گنجائش باقی نہیں رکھی۔ علی مثل جعفر فلتبك البواکی (جعفر ایسے ذی مرتبہ شخص پر رونے والوں کو رونا چاہیئے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے والا اگر بارگاہ احدیت میں مثل جعفر کے تقرب رکھنے والا اور مراتب فضیلت پر فائز ہو تو اس پر رونا مستحسن ہے۔

اسلامی کتب حدیث و تواریخ سے پوچھو کہ جعفر کے فضائل کو حسینؑ بن علیؑ کے فضائل سے کون سی مناسبت ہے اور اگر مظلومیت کو خیال کرو تو کربلا کے میدان کا جنگ موتہ کے معرکے سے تقابل کرو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

بحمد اللہ قول رسولؐ، فعل رسولؐ، تقریر رسولؐ ہر طرح سے گریہ و بکا کا جواز بلکہ استحباب ثابت ہو گیا۔

مضمون اپنے حدود سے گزر چکا ہے اور موقع نہیں کہ قلم کو زیادہ گردش دی جائے۔

صحابہ و تابعین کے اقوال و افعال سے گریہ و بکا کے ثبوت کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ اسی طرح خصوصاً حضرت سید الشہداء سلام اللہ علیہ پر جس طرح رسولؐ نے گریہ و بکا کے استحسان کو ظاہر فرمایا ہے اور خود واقعے سے قبل اس مصیبت کا اثر لیا ہے یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔

پھر صحابہ و تابعین، تبع تابعین اور اکابر اہل اسلام

نے شہادت سید الشہداء پر جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے
اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ اگر موقع ہوا تو
ان مطالب پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔!



زندہ جاوید کا ماتم

اقبال سہیل کا اعتراض مشہور ہے کہ ؎

روئیں وہ جو قایل ہوں ممات شہداء کے
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

اس کا تجزیہ کیا جائے گا تو کیا ہوگا؟ غور کیجئے کہ یہ ممات اور حیات جو شہداء کے لئے مورد نفی و اثبات ہو سکتی ہے، کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ شہداء کی زندگی وہ مادی زندگی نہیں ہے جس لحاظ سے قبل شہادت انھیں زندہ کہا جاتا تھا اور جو ظاہری طور پر اس دار دُنیا سے متعلق ہوتی ہے اس لئے کہ شرع اسلامی میں شہداء کی میراث تقسیم ہوتی ہے۔ ان کے اطفال حکم یتیم میں آتے ہیں اور ان کی ازواج حکم بیوہ میں آتی ہیں۔ اگر ان کے لئے موت کا تصور کسی حیثیت سے کیا نہ جائے تو ان کے متروکہ کی تقسیم ان کی اولاد کی یتیمی اور ان کے ازواج کی بیوگی بالکل بے بنیاد ہوگی ہمارے مذہبی نقطۂ نظر سے شہید اگر امام ہے تو اس کے بعد دوسرا امام برسرِاقتدار آجاتا ہے حالانکہ حیات ظاہری میں ایک امام کے ہوتے ہوئے دوسرا امام حامل منصب نہیں ہوتا۔ بیوہ کے لئے عقد ثانی کی اجازت جس طرح شوہر کی موت کے بعد ہے اسی طرح شہادت کے بعد حالانکہ زندگی میں یہ ممکن نہیں، احکام اموات میں صرف غسل و کفن شہید کے لئے نہیں ہے۔ نماز میت اور دفن لازم ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا کبھی تعلق موت کے ساتھ ہے زندگی کے ساتھ نہیں۔

جب کہ شہداء کی زندگی جیسے شہداء کے لئے ثابت کیا گیا ہے ارتقائے

رُوحانیت کا کوئی خاص درجہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اولیائے الٰہی میں سے کسی کے لئے بھی اگرچہ اصطلاحی طور پر شہید نہ ہو، موت نہیں ہے بلکہ جاودانی زندگی ہے جس کے مدارج باعتبار مراتب تقرب الٰہی مختلف ہوں گے۔ پیغمبر خدا کی متفقہ حدیث میں ہے۔

مَنْ مَاتَ عَلیٰ حُبِّ اٰلِ مُحَمَّدٍ مَاتَ شَهِیْدًا

بے شک فقہی حیثیت سے احکام شہید یعنی غسل و کفن کا ساقط ہونا معرکہ جنگ میں شہادت پانے والوں کے ساتھ مخصوص ہیں مگر مرتبہ شہادت کا حصول بقدر ایمان ہر مومن کے لئے ہے۔ پھر جب ہر مومن بقدر ایمان مردہ نہیں تو انبیاء و مرسلین کا کیا تذکرہ! خود حضرتؐ کی حدیث ہے کہ

" میری وفات کے بعد مجھ پر اسی طرح سلام کرنا جیسے زندگی میں، کیونکہ تمہارا سلام دونوں حالتوں میں مجھے یکساں طور پر پہنچے گا۔"

بعض علمائے اسلام نے اسی لئے روضۂ رسولؐ کے پاس بلند آواز سے بات کرنے کو منع کیا اور کہا کہ قرآن مجید میں ہے کہ

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ۔

اس حکم کی تعمیل جس طرح اس وقت تھی اسی طرح اب ہونا چاہیئے اس لئے کہ رسولؐ زندہ ہیں اور ہماری آواز سنتے ہیں۔

اب مذکورہ بالا شعر کے مضمون پر غور کیجئے وہ کہتا ہے کہ " جو زندۂ جاوید ہو اس کا ماتم نہیں کرنا چاہیئے۔" اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ زندگی جاوید حسن عمل سے وابستہ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماتم کے قابل انکی موت ہے جو انتہائی بداعمال ہوں۔ اور حسن اعمال رکھنے والوں کا ماتم نہیں کرنا چاہیئے۔ اب جب کہ اس شعر سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے تو دیکھئے

اسے قرآن کے سامنے پیش کریں کیونکہ کہنے والا ابطاہر مسلمان ہے۔ اور اس نے جو کہا ہے وہ صرف شاعرانہ انداز میں نہیں ہے جسے زیر لب تبسم کے ساتھ صرف اس کے شاعرانہ کیف کو محسوس کر کے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اصل نے منطقی انداز میں صغریٰ اور کبریٰ مرتب کر کے ایک نتیجہ نکالا ہے جس سے ایک پوری قوم کے طرز عمل پر اعتراض مقصود ہے۔

آیت قرآن مجید کی سامنے ہے اس موقع کی جب فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا تو ارشاد ہوا ہے۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ۔

"نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین نے گریہ کیا اور نہ انھیں اللہ کی طرف سے مہلت دی گئی"۔

ظاہر ہے کہ یہ کنایہ ہے جس سے ان کی بداعمالی کا اظہار مقصود ہے۔ کنایہ میں کسی حقیقت کے آثار و لوازم کا تذکرہ کر کے ذہن کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ اس کی ضد کے لوازم کو بیان کیا جائے۔ مثلاً یہ بتانا کہ صبح ہو گئی تو یہ کہیں گے کہ روشنی ہو گئی یہ نہیں کہیں گے کہ اندھیرا ہو گیا جو کہ شام کے لوازم میں سے ہے۔ رات کی شدت دکھانا ہو تو کہیں گے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا جو ظلمت کے اظہار میں مبالغہ ہے۔ اب دیکھئے شاعر کا نظریہ یہ تھا کہ رونا اسے نہیں چاہئے جو خوش اعمال ہو بلکہ اُسے رویا جائے جو بداعمال ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رونا بداعمالی کا نتیجہ ہے۔ استحقاق گریہ خوش اعمالی کا نتیجہ نہیں ہے۔ مگر قرآن بداعمالی کے اظہار میں کہہ رہا ہے۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ

ان پر آسمان و زمین نے گریہ نہیں کیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے بداعمالی کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر نہ رویا جائے اس کے بالمقابل جو حسن عمل رکھنے والے ہوں وہ مستحق گریہ ہوں گے۔ اب جتنا بلند مرتبے کا انسان ہو جتنا مرکز فیوض برکات

زیادہ ہو۔ وہ دنیا سے اٹھے تو اس کا اٹھنا گریہ و ماتم کا باعث ہوگا یعنی لوگ عموماً آسمان و زمین کی گریہ کی نسبت بطور مجاز عقلی ہو سکتی ہے جیسے واسئل القریۃ یعنی اہل القریہ ہماری روزمرہ میں پورا شہر گواہ ہے یعنی اہل شہر، اسی طرح آسمان و زمین روتے ہیں یعنی اہل آسمان و زمین مگر اٹھنے والے کی بیش خدا شخصیت کے لحاظ سے کبھی یہ مجاز حقیقت بھی بن سکتا ہے یعنی مرنے والا جو دنیا سے اٹھا تو واقعی وہ زمین روئی اور آسمان نے گریہ کیا۔ پھر اگر زندہ جاوید پر آسمان و زمین گریہ کر سکتے ہیں جن کا کوئی فعل ارادہ باری کے بغیر نہیں ہو سکتا تو اس کا انسان بھی ماتم کریں تو یہ مرضی الٰہی کے مطابق ہوگا۔

پھر اب یہ دیکھئے کہ شہداء کے زندہ جاوید ہونے کا علم ہم کو کس کے ذریعہ سے ہوا، ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کے ذریعہ سے پھر اس زندگی کے تقاضوں سے ہم زیادہ واقف ہوں گے یا پیغمبر اسلامؐ۔ اب تاریخ اسلام پر نظر ڈالئے، بتائیے جناب حمزہ ابن عبدالمطلب شہید تھے یا نہیں؟ یقیناً شہید اور ایسے شہید کہ پیغمبرؐ خدا نے سید الشہداء کا لقب دیا، تو پھر زندہ جاوید ہونے میں کیا شبہ! مگر حمزہؓ کی شہادت کے بعد کیا ہوا۔ غم کیا گیا۔ یا خوشی کے آنسو بہائے گئے۔ یا قہقہے لگائے گئے۔ یاد رکھئے کہ سنت وہی ہے جس کی نظیر عمل رسولؐ میں ہو اور بدعت وہ ہے کہ جو عمل رسولؐ کے خلاف ہو۔ اگر حمزہؓ کی شہادت پر رسول اللہ ہنسے ہوتے تو رونا بدعت ہوتا۔ لیکن اگر رسول اللہ روئے ہیں تو پھر کسی شہید پہ رونا بدعت نہ ہوگا خوشیاں کرنا ہی بدعت قرار پائے گا۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب حمزہؓ کی شہادت ہوگئی ہے اور صفیہ خواہر حمزہؓ بھائی کی خبر مرگ سنکر میدان احد کی طرف روانہ ہوئیں اور جناب رسول اللہ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ صفیہ آ رہی ہیں تو پہلے آپ نے حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے فرمایا کہ جلدی حمزہؓ کی لاش کو چھپائیں تاکہ بہن کی نظر بھائی کے جسد عریاں پر نہ پڑے۔ حضرت علیؑ نے جا کر اپنی عبا لاش جناب حمزہؓ پر ڈالی

مگر جنابِ حمزہؓ قد آور تھے۔ پاؤں کھلے رہ گئے تو آپ نے گھاس صحرا کی جمع کر کے پیروں کو مخفی کیا اتنی دیر میں صفیہ پہنچ گئیں اور لاشِ برادر پر گریہ شروع کیا اس موقعے پر یہ نہیں ہوا کہ رسول اللہ صفیہ کو منع فرماتے اور ارشاد کرتے کہ تمہارے بھائی زندہ جاوید ہیں، زندہ جاوید کا ماتم کیوں کرتی ہو بجائے یہ فرمانے کے خود آپ صفیہ کے ساتھ رونے میں شریک ہو گئے اور تاریخ میں یہ فقرہ ہے۔

یبکی کلما بکت صفیۃ و ینشج کلما نشجت صفیۃ

نشج کے معنی عربی میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جانے کے ہیں مطلب یہ ہوا کہ جتنا جتنا صفیہ روتی تھیں اتنا اتنا رسولؐ گریہ فرماتے تھے یہاں تک کہ جب صفیہ کی روتے روتے ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں تو خود پیغمبرؐ کی بھی یہی حالت تھی۔ اب بتلایئے زندہ جاوید کا ماتم ہوتا ہے یا نہیں!

اس کے بعد جب حضرت مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور مسجد کی طرف جاتے ہوئے سُنا کہ انصار کے گھروں میں رونے کی صدائیں بلند ہیں ان عزیزوں کے غم میں جو جنگ اُحد میں شہید ہوئے تھے تو حضرت نے فرمایا "اما حمزۃ فلا بواکی لہ"۔ افسوس! میرے چچا حمزہؓ پر رونے والیاں کوئی نہیں"۔ چونکہ جناب صفیہ اپنے گھر میں اکیلی تھیں مثل مشہور ہے "اکیلا آدمی نہ روتا بھلا نہ ہنستا"۔ وہ تھوڑی دیر رو کر چپ ہو گئی تھیں حضرتؐ نے یہ کلام حسرت آمیز فرمایا تو اس کی اطلاع خواتین انصار تک پہنچ گئی وہ اسے سُنکر خانہ جناب حمزہؓ میں آ گئیں اور حمزہؓ کا ماتم برپا ہو گیا۔

یہ زندہ جاوید کا ماتم کس نے برپا کرایا؟ رسول اللہؐ نے، اب کسی مسلمان کو اختیار ہے کہ وہ اس ماتم کو اچھا سمجھے یا بُرا؟

جناب جعفر طیارؓ بھی شہید ہوئے۔ موتہ میں ان کے دونوں ہاتھ قلم ہوئے، پیغمبر خداؐ نے منبر پر اپنے خطبے میں ان کی خبر شہادت مسلمانوں کو سُنائی جو خانہ سیدۂ عالم میں بھی پہنچ گئی۔ جب حضرت

تشریف لائے تو دیکھا فاطمہ زہرا رو رہی ہیں۔ رسولؐ نے انھیں بھی منع نہیں فرمایا کہ جعفر زندۂ جاوید ہیں۔ روتی کیوں ہو۔ بلکہ آپ نے ارشاد فرمایا عَلٰی مِثْلِ جَعْفَرٍ فَلْتَبْکِ الْبَوَاکِیْ "جعفر ایسے آدمی پر رونے والیوں کو رونا ہی چاہیئے"۔

لیجئے جناب رسولؐ خدا نے ایک عام اصول کا اعلان کر دیا اگر کہا ہوتا کہ جعفرؓ پر ضرور رونا چاہیئے تو وہ ایک حکم جزئی ہوتا اسے صرف بحیثیت نظیر پیش کیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ تو ایک کلی اصول ہے، ایک اصولی معیار ہے۔ اب جعفرؓ ایسے الفاظ کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ایسے صاحب اوصاف شخص پر، تب بھی ثابت ہوگا کہ حسن اعمال کا نتیجہ ہے: استحقاق گریہ! جو قرآن کی آیت کے بالکل مطابق ہے اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جس کو اس طرح موت آئی ہو جیسے جعفرؓ کو آئی یعنی راہ خدا میں شہید ہوا ہو، تب تو صاف صاف یہ اس اصول کا اعلان ہے کہ زندۂ جاوید ہی کا ماتم کیا جانا چاہیئے۔ اب کس مسلمان کے لئے جائز ہوگا کہ وہ کہے ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے وہ جب یہ کہتا ہے تو وہ پیغمبر خدا کے ارشاد سے بغاوت کا اعلان کرتا ہے۔ جو اگر سمجھ بوجھ کر ہے تو یقیناً دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کے لئے کافی ہے۔

اپنے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں اگر ہم ایک شعر کی شکل میں اقبال سہیل کا جواب دینا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں ؎

کیا روؤ گے ان کو جو ہلاک ابدی ہیں
کیوں زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے!

(یعنی) قرآن اور حدیث تو یہی کہہ رہے ہیں کہ زندۂ جاوید کا ماتم کرنا چاہیئے۔

اب اگر کچھ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تو وہ ان کا ماتم کریں جنھیں ہلاکت ابدی نصیب ہوئی ہے مگر ان کا ضمیر بھی شاید اس کو پسند نہ کریگا

کہا جاتا ہے کہ رونا بزدلی کی نشانی ہے میں کہتا ہوں کہ کسی خطرناک معرکے میں موجود رہ کر خطرے کے احساس سے رونا بزدلی قرار دیا جا سکتا ہے مگر کسی خطرناک جہاد میں عدم شرکت پر رونا عین بہادری ہے یاد رکھئے کہ کربلا کے مجاہدین زخم کھاتے اور خون بہاتے ہوئے گریہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہاں تو بریر اور عبدالرحمٰن آپس میں مذاق کرتے نظر آتے ہیں وہاں تو عباسؑ و علی اکبرؑ کا کیا ذکر شیر خوار علی اصغرؑ تک مسکراتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ ہاں عباسؑ نہیں روئے اور علی اکبرؑ نہیں روئے کہ انھیں خون افشانی کا موقع مل گیا مگر زین العابدینؑ عمر بھر روئے کیونکہ حکمت ربّانی نے ان کو اس قربانی میں شہید ہو کر شرکت سے مجبور بنا دیا تھا۔

ہماری بھی اگر قسمت یاوری کرتی کہ اس قربانی میں عملی حیثیت سے شریک ہوتے تو پھر خون افشانی کرتے اشک افشانی نہ کرتے یہ اشک افشانی تو اس پر ہے کہ اس سعادت کو حاصل نہ کر سکے اب اگر اس تصور کے ساتھ یہ آنسو بہائے جا رہے ہوں تو ان سے ہمت میں کمزوری پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں آرزو رہے اور بےچینی سے انتظار کہ اب جو نصرت دین کا عملی موقع ہمیں دستیاب ہو سکے اس میں اپنی ممکن اور با محل قربانی سے دریغ نہ کریں۔



اگر واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

الحمد للّٰہ ربّ العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین و آلہ الطّیبین الطّاھرین

سنہ ۱۳۶۱ھ کے بین الاقوامی اجتماعات کے بعد جو شہر، قصبہ، اور دیہات میں منعقد ہوئے تھے اور جن میں سے ہر اجتماع میں ہر قوم و مذہب کے افراد شریک ہوئے تھے کم از کم میرے لئے اور میرے ان رفقائے کار کے لئے جو دہلی یا لکھنؤ سے آئے ہیں یا اس زمانے میں وہاں کے باشندے تھے لاہور کا یہ مظاہرۂ حسینیت کوئی حیرت خیز یا غیر معمولی موقف نہیں۔

مگر یاد رکھئے کہ جتنا مرض شدید ہوتا ہے دوا کی تاثیر اسی قدر زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ سنہ ۱۳۶۱ھ تھا اور آج سنہ ۱۳۷۲ھ ہے۔ اتنی مدت میں حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا ہے اس درمیان میں جو انقلابات، زلزلے، آندھیاں اور سیلاب آئے انھوں نے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے، ان حالات میں یقیناً لاہور کا یہ جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور یہ ایک قسم کا نیا تجربہ ہے جو نوعِ انسانی کے سامنے پیش ہوا ہے۔

سنہ ۱۳۶۱ھ میں دلوں کے آبگینوں میں بال پڑے تھے مگر اُن کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوئے تھے اور دل میں خراشیں آئی تھیں مگر گھاؤ نہ ہوئے تھے ہمارے رجحانات کی سمتیں الگ ہوئی تھیں، لیکن جسم جُدا جُدا نہ ہوئے تھے۔

مگر سنہ ۱۳۷۲ھ میں جب کہ لاہور میں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہوا ہے وہ وقت ہے جب کہ حالات نے ایسا عظیم تفرقہ ڈال دیا کہ ملک کا کیا ذکر گھرانے

اور گھر تقسیم ہو گئے اکثر بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا، شوہر سے بیوی، بہن سے بھائی کی جدائی ہو گئی اس دور میں حسینیت کا یہ عجیب تجربہ ہے جو نوعِ انسانی کے سامنے پیش ہو رہا ہے اور یہ ثابت کر رہا ہے کہ گوناگوں انقلابات کے باوجود جب حسینیت کا پرچم کھل جاتا ہے تو مذاہب کا فرق اور اقوام و ممالک کا امتیاز مٹ جاتا ہے ۔ اور ہندوستان اور پاکستان ایک ہو جاتے ہیں ۔

سنہ ۱۳۶۱ھ سے زیادہ آج کا یہ تجربہ کارگر اور مفید ہے اس لئے کہ اس وقت ہم ایک ایسے نظام کے ماتحت گرفتار تھے کہ تمدن عالم میں ہماری آواز اثر نہ رکھتی تھی، عالم کی بین الاقوامی مجالس میں آواز بلند کرنے سے ہم گھبراتے بلکہ شرماتے تھے مگر اب جبکہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تو ہم حق رکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عالم میں اپنے اس پیغام کو پہنچا سکیں ۔

آج ہم اپنے ملک میں آزاد ہو چکے ہیں ہر ایک اپنے اپنے وسائل کا خود مالک ہے، اقوام عالم میں کم از کم آئینی طور پر دوسروں کے ساتھ عالمی مسائل کے حل کے لئے برابر سے بیٹھ سکتے ہیں بلکہ بعض جگہ ہم ثالث بن کر مسائل کو حل بھی کرتے ہیں اور دنیا ہمارے سامنے اپنے مسائل پیش کرتی ہے تو یہ جلسہ ایک تجربہ گاہ ہے اس کی کامیابی کے بعد میں اس مستقبل کو دیکھتا ہوں جب کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اکابر و عمائد حسینیت کے زیر سایہ عالمی مسائل کو طے کریں اور شاید آگے چل کر وہ حالات پیدا ہوں کہ "حسین ڈے" کا یہ جلسہ کل عالم کے کسی بڑے مرکز میں منعقد کیا جائے ۔ خواہ امریکہ میں خواہ یورپ میں اور خواہ روس وغیرہ میں اور پھر اس حسینیت کے مرکز پر بین الاقوامی دکھ درد کا علاج کیا جائے ۔

یاد رکھئے کہ آج کوئی تاجدار و فاتح ممالک ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جس کا نام اقوام و ملل کو گلے ملا دے گا ۔ چاہے وہ کتنے ہی جاہ و جلال کا مالک ہو مگر کربلا کے تڑپتے ہوئے لاشے، بہتا ہوا خون، نیزوں پر بلند ہونے

والے سر آج دُنیا کو ایک موقع پر لے آسکتے ہیں۔ سمجھے آپ نظام اہل بیت ؟

دُنیا نے فتح ممالک کو کامیابی کی دلیل سمجھا، لیکن اہل بیتؑ نے فتح قلوب کو اصل فتح کی دلیل سمجھا۔ فاتحین ممالک ختم ہو گئے لیکن فاتحین قلوب اسی طرح زندہ ہیں۔

یاد رکھئے کی یہ فتح کا راز وہ تھا جسے حسینؑ کے مشیر کار سمجھے نہ تھے اور حضرت امام حسینؑ کو رائے دی کہ آپ کربلا نہ جایئے مگر امامؑ نے مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا یہ بُرا کیا؟ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے مشیروں کا کہنا کب مانا تھا؟ کسی اور کا کیا ذکر، سگے چچا کا کہنا نہ مانا۔

یہ مشیران امام مادی مستقبل سامنے رکھتے تھے اور آج کے مشیروں کا حوالہ دینے والے بھی دماغ رکھتے ہیں۔ بیشک وہ محمدود نگاہ کی رو سے مر گئے، مٹ گئے، گود کے بچے تک شہید ہو گئے، عورتیں اسیر ہو گئیں، یہ سب مشیروں کا کہنا نہ مان کر ہوا مگر پیغمبرؐ اسلام نے بھی تو مشیروں کا کہنا نہ مان کر دکھ ہی اٹھائے۔

یہ نہ دیکھیے کہ ۱۳ برس کے بعد ہجرت ہوئی اور انصار ملے لیکن ہجرت سے پہلے تیرہ برس رسولؐ خدا نے کیا کیا دکھ نہیں سہے جسم مبارک پر پتھر نہیں کھائے؟ سر مبارک پر خس و خاشاک نہیں پھینکا گیا؟ یہ سب کچھ ہوا۔ شعب ابوطالب میں سو برس مقید رہے، یہ زمانہ اتنا شدائد سے بھرا ہوا تھا کہ کئی کئی وقت نہ کھانا ملتا تھا نہ پانی، اکثر درختوں کے پتے کھا کر گذر کی جاتی تھی۔ ان ہی تکالیف کا اثر تھا کہ محاصرے سے باہر آنے کے چند ہی ماہ کے اندر حضرت خدیجہؓ اور ابو طالبؑ کی لوگوں کی وفات ہو گئی جس کی بنا پر رسولؐ خدا نے اس سال کا نام "عام الحزن" رکھا یہ سب کچھ کہنا نہ ماننے ہی کا نتیجہ تو ہوا

اب دُنیا بتائے کہ انھوں نے اچھا کیا یا بُرا اور اس کا کیا نتیجہ حاصل ہوا؟ پھر اگر پیغمبرؐ اسلام کا مشیروں کے مشوروں کو رد کر دینا درست تھا تو حضرت امام حسینؑ نے بھی اگر مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا بُرا کیا؟

کتب تاریخ میں مشیروں کا ذکر بہت جگہ ہے مگر کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی یہ بات نہ ملے گی کہ کسی مشیر نے یہ رائے دی ہو کہ آپ یزید لعین کی بیعت کر لیجئے، مشورے اس طرح کے سنئے کہ عراق نہ جائیے۔ طائف تشریف لے جائیے۔ یمن چلے جائیے۔ مکہ معظمہ میں قیام کیجئے لیکن کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ یزید کی بیعت کرنا امام حسینؑ کے لئے سب ہی کے نزدیک ناممکن یا نا روایات تھی، اب بیعت نہ کرنے کے بعد جن جگہوں کے متعلق مشورہ دیا جارہا تھا ان میں سے کوئی بھی کیا ایسی تھی جو مملکت یزید کی حدود سے باہر ہو لہذا نتیجہ یہی تھا کہ یزید کی طرف سے قتل کی کوشش ہو۔

" پنڈت ویاس دیو مصرا کا وہ فقرا کس قدر پسندیدہ ہے جو آپ نے اپنی آج کی تقریر کے دوران میں کہا۔ کہ " اب سوال مقتل کے انتخاب کا تھا ،، شہادت امام حسین علیہ السلام تو یقینی تھی ہی اگر مدینہ میں رہتے تو اسی طرح ہوتا جیسا حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ اسی طرح مکے میں ہوتے تو بھی کسی خفیہ طریقے سے خاتمہ کر دیا جاتا۔

امام حسینؑ کا مکہ چھوڑنا کن حالات میں تھا اس کو یوں سمجھئے کہ جو دستور فطرت کے خلاف عمل ہوگا اسے ضرور غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ماننا پڑے گا۔ وہ حسینؑ جو ۲۵ حج پاپیادہ کر چکے تھے اور حج کے اسقدر مشتاق ہوں کہ مدینے سے آ آ کر حج کرتے ہوں، اس طرح کہ مرکب ساتھ خالی جارہے ہوں اور آپ پیدل جارہے ہوں، کیا اتنے ذوق عبادت رکھنے والے حسینؑ کو مکہ سے آج وہ رابطہ نہ تھا جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے ہوتا ہے؟ ان کا تعلق کعبہ کے ساتھ مذہبی تعلق کے علاوہ خاندانی تعلق بھی تھا۔ وہ ان کے باپ کا مولد بھی تھا، پھر خیال تو کیجئے کہ پیغمبرؐ اسلام کا نواسہ اور ایک دن حج کا باقی رہتے ہوئے وہاں سے سفر کر رہا ہے جب کہ تمام مسلمان مکے کی طرف حج کرنے جارہے ہیں وہ

وہاں سے مکہ چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور راہ میں قافلے والے حیرت سے پوچھتے ہیں کہ امام اس وقت کدھر جا رہے ہیں، اور ہر شخص کا سوال فرزند رسولؐ کے دل پر نشتر کا کام کر رہا ہے ہر ایک سے کہاں اصلی بات بتائے کسی کسی سے کہہ بھی دیا کہ اگر میں نکل نہ کھڑا ہوتا تو قتل ہو جاتا یا گرفتار ہو جاتا (واللہ لو لم اخرج لاخذت) اس لئے کہ حاجیوں کے بھیس میں سپاہی بھیجے گئے تھے کہ جب اور جہاں امامؑ ملیں انھیں شہید کر دیا جائے۔

ان ظالموں کے لئے جب وہ شہر الحرام نہ تھے تو بلد الحرام اُن کے لئے حرام کہاں ہو سکتا تھا جب کہ ان کو وقت کی حرمت کا خیال نہ تھا تو جگہ کی حرمت کا احترام کہاں کرتے۔

آج دنیاوی سیاست کی نظر سے اس امر کو جانچئے کہ اگر کہیں مکہ میں طواف یا سعی کی حالت میں یا نماز میں کوئی شخص آکر شہید کر دیتا تو فرزند رسولؐ شہید ہو جاتے لیکن آج تک دُنیا کو یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ قاتل کون ہے۔

صفحات تاریخ پر آج یہ معاملہ صاف ہے کہ حضرت امام حسینؑ بالکل بے جرم تھے اور ان کا قاتل یزید تھا لیکن اگر فرزند رسولؐ اس صورت میں شہید ہو جاتے تو قاتل امام پوشیدہ ہو کر زندہ رہتا۔ امامؑ حقیقی معنوں میں قتل ہو جاتے اور آپ کا مقصد بھی آپ کے ساتھ ہی قتل ہو جاتا۔

کیا مشیران امام اتنے دور رس تھے جو ان نتائج کو مدنظر رکھ کر مشورہ دیتے؟ ان میں کچھ واقعی ہمدرد تھے اور کچھ نمائشی طور پر خیر خواہ تھے جو سیاست کے ماتحت ہمدرد بن رہے تھے مگر سب کے مشورے صرف وقتی حالات کی بنا پر جذبات سے متاثر ہو کر دیئے گئے تھے مگر حسینؑ علیہ السلام جذبات سے بلند تر تھے، کیونکہ جذبات سے بلند ہستی کا نام

ہی محصوم ہے اور انھوں نے مشوروں کی مخالفت کر کے اپنا جذبات سے بلند ہونا دکھا دیا اور ثابت کر دیا کہ وہ جذبات سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتے

کہا جاتا ہے کہ کربلا کا واقعہ اس قدر اہمیت کیوں رکھتا ہے ؟ یا اس کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے ، اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا ؟ مگر اب جبکہ واقعۂ کربلا ہو چکا میں کیا بتاؤں کہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا جس نے تاریکی نہ دیکھی ہو اور دن ہی کو آنکھ کھولی ہو وہ پوچھے کہ سورج نہ ہوتا تو کیا ہوتا ؟ تو اسے کس طرح بتایا جا سکتا ہے ۔

امام نے جو قربانی پیش کی ہم تو اس کی برکات کے زیر سایہ آنکھ کھولی ہے آپ نے حقانیت کا ایسا سورج چمکایا جو غروب ہونے والا نہیں ، لہٰذا اب کوئی کیا سمجھے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا ، یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ خدا نہ ہوتا تو کیا ہوتا ؟ ظاہر ہے کہ خدا نہ ہونے کا تجربہ ہی کسی کو نہیں ہو سکتا ، کیونکہ خدا ازل سے ہے ، میں تو سمجھتا ہوں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو یہ جو کچھ آج ہے کچھ بھی نہ ہوتا ہماری دینی زندگی جسکو دوسرے لفظوں میں انسانی زندگی کہوں گا اور شریفانہ باشعور باعزت اور خود دار زندگی ، اس کا کچھ پتہ نہ ہوتا ، اذانیں نہ ہوتیں اقامت نہ ہوتی ، نماز نہ ہوتی ، روزہ نہ ہوتا ، حج نہ ہوتا ، قرآن نہ ہوتا ، اخلاق نہ ہوتا ، احساس نہ ہوتا ، تمدن نہ ہوتا ، تہذیب نہ ہوتی ، مساوات و اخوت نہ ہوتی ، حریت نہ ہوتی ، جذبۂ شہادت نہ ہوتا ، حقانیت نہ ہوتی اور حق پرستی نہ ہوتی ، اب اس کے بعد میں کیا بتاؤں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا مگر ابھی تک تو یہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے اس کے ثبوت کے لئے میں کہوں گا ۔ یہ دیکھئے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوا تھا تو کیا ہو رہا تھا اور خدا کی قسم جو ہو رہا تھا وہ ایسا ہے کہ اب یقین مشکل سے آتا ہے کہ یہ ہو رہا تھا ۔

جس پیغمبر نے یہ نمونہ پیش کیا ہو کہ دین و دنیا کا اقتدار زیر قدم رکھتے ہوئے کئی کئی وقت پیٹ پر پتھر باندھا اور رکھا نان کھایا ہوا ور

پیغمبرؐ نے ہمیں یہ نمونہ دکھایا ہو کہ وہ معزز بیٹی جس کی تعظیم کو آپ کھڑے ہو جاتے ہوں یعنی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنی جگہ تو ان کا یہ اعزاز مگر جب انھیں کنیز سپرد فرماتے ہیں تو کنیز کے ساتھ مساوات کا اتنا خیال فرماتے ہیں کہ بیٹی گھر کا سارا کام کاج فضہ پر نہ ڈالنا بلکہ ایک دن گھر کا کام خود کرنا اور ایک دن فضہؑ سے لینا۔ چنانچہ بیٹی نے ایسا ہی کر کے دکھایا کہ ایک دن فضہؑ لونڈی کھانا پکاتی اور کام کاج کرتی اور حضرت فاطمہؑ آرام فرماتیں اور دوسرے روز حضرت فاطمہؑ گھر کا کام کرتیں اور فضہؑ آرام کرتیں لوگ کہتے ہیں کہ غلامی کو ختم کیوں نہ کر دیا؟ اگر ایسا ہوتا تو معیار غلامی اپنی جگہ ہی رہتا۔ آل رسولؐ نے بتایا کہ یہ تو باہمی تعاون کے ذریعے ہیں۔ آقا غلام، خاوند بیوی وغیرہ۔ یہ رشتے گھر کے افراد میں متمول کا ذریعہ ہیں ان کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں مگر ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ آج جب چھوٹے بھائی سے یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کہتے ہیں سگ باش برادر خورد مباش" تو ہمارے اس تمدن میں غلام، کنیز کے ساتھ اچھا برتاؤ کہاں ہوگا۔ مگر یہ قصور ہمارے تمدن کا ہے۔ آل محمد کے غلاموں اور کنیزوں سے پوچھو کہ تم کو آزاد ہونا منظور ہے یا غلام رہنا۔ آج کی آزادی ہزار غلامی سے بدتر اور وہ غلامی رشک تاجداری تھی، وہ فاطمہ زہراؑ کا حسب ہدایت پیغمبرؐ برتاؤ اپنی کنیز فضہؑ کے ساتھ اور اسی طرح حضرت علیؑ کا برتاؤ اپنے غلام قنبر کے ساتھ اس وقت نہیں کہ آپ جب کہ خانہ نشین تھے بلکہ اس وقت جب کہ آپ شہنشاہ تسلیم کئے جا رہے تھے ایسے وقت قنبر کے ساتھ جو برتاؤ آپ نے دکھلایا کہ بازار سے دو پیرہن خریدے ایک سات درہم کا دوسرا پانچ درہم کا۔ پہلا پیراہن اپنے غلام قنبر کو حضرتؑ نے عطا فرمایا اور پانچ درہم والا خود زیب تن کیا۔ قنبر عرض کرتے ہیں کہ حضور یہ کچھ بہتر ہے آپ اسے زیب جسم فرمائیے ہم میں سے آج کا کوئی آدمی اول تو ایسا کرتا ہی کیوں۔ اگر کوئی لیڈر قسم کا آدمی ایسا کر بھی دیتا تو جب قنبر نے عرض کیا تھا کہ حضور یہ بہتر ہے آپ

پہن لیں تو وہ فوراً اپنی مصلحانہ حیثیت کا علم اونچا کر دیتا، وہ جواب میں ایک تقریر کر دیتا کہ قنبر میں دنیا سے اس تفرقہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں میں دنیا میں غلاموں کا معیار بلند کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ لیکن حضرت علیؑ نے یہ جواب نہیں دیا۔ حالانکہ پیشِ نظر یہی تھا لیکن قنبر سے اگر یہ فرماتے تو اس جواب میں خود عدم مساوات مضمر تھی اس ارشاد سے قنبر کو احساس غلامی پیدا ہو جاتا۔ آپ قنبر کو ایسا جواب دیتے ہیں جیسا اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے کہ تم جوان ہو تمھیں یہ پیرہن اچھا لگتا ہے۔"

پیغمبر اسلامؐ خود جس طرح کی تربیت مسلمانوں کی کرنا چاہتے تھے وہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت کے پاس صف میں ایک رئیس خالی جگہ پا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اتنے میں ایک غریب بوسیدہ کپڑوں والا جو آداب نبویؐ کا عادی ہے آکر اس رئیس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے رئیس صاحب نے اپنے معیار طبیعت کے لحاظ سے بہت اخلاق سے کام لیا، بہت ضبط سے کام لیا اپنا دربار ہوتا تو شاید اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتے اور بدتمیز کہہ دیتے مگر وہ بارگاہ پیغمبر تھی۔ یہاں یہ ممکن نہ تھا۔ پھر بھی فطری طور پر ذہنیت کا مظاہرہ اس طرح ہو گیا کہ رئیس نے اپنا لباس سمیٹ لیا پیغمبرؐ اسلام نے اتنا بھی گوارا نہ کیا اور خلق عظیم کی تیوریوں پر بل آ گئے اور فرمایا "یہ تم نے کیا کیا؟" کیا اس کی غربت تم میں آجاتی یا تمہاری ریاست اس کو مل جاتی۔ یا چلی جاتی، دامن کیوں سمیٹا؟"

مربیٔ اعظم کی اس تنبیہ کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ وقتی طور پر اس کا ضمیر شرمندہ ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ اس گناہ کے کفارہ میں میں اپنی نصف دولت اس غریب بھائی کو دیتا ہوں۔ متبسم ہوتے ہوئے حضورؐ غریب کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ نصف دولت کی پیشکش تم کو منظور ہے؟ غریب صحابی نے جواب میں عرض کیا کہ میں اسے شکریہ کے ساتھ واپس کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یہ خوشی سے دے رہا ہے" اس نے عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ ذہنیت کہیں مجھ میں نہ پیدا ہو جائے۔"

محض اخلاق کی کتابوں میں نمائشی طور پر اصول کو درج کر دینا آسان بات ہے لیکن جیتی جاگتی عمل کی دنیا میں اتنی کم مدت میں اس کو پیش کر دینا بڑی مشکل بات ہے۔ پیغمبر خدا نے ہر تعلیم کو عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے زندہ مجسمے کی شکل میں پیش کر دیا کہ میرا نظام فقط ذہنی یا دماغی نہیں بلکہ عملی ہے، وہ زندہ نظام ہے جو سیرت و کردار کی شکل میں آنکھوں کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ میرا آئین اخلاق لفظی نہیں بلکہ بالکل عملی ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ اہل بیت کی ضرورت ہوئی اور ارشاد ہوا۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی

اور اسی لئے ان اہل بیت کو مباہلہ کے میدان میں اپنے ساتھ لے گئے تھے میرا عقیدہ ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیئے کہ دعائے رسول کسی کی آمین کی محتاج نہ تھی بلکہ ان میں سے ہر فرد کی دعا تنہا کافی تھی مگر خالق اکبر نے نبی علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ ان سب کو ساتھ لے جاؤ منزل مباہلہ میں اس لئے کہ جب صادقین اور کاذبین میں مقابلہ ہو رہا ہے تو دنیا جان لے کہ خالص صادقین افراد یہ ہیں اور جب رسالت مآب دنیا سے اٹھ جائیں تو جو کام آپ کے بعد ان سے لیا جانا ہے وہ زندگی ہی میں ان سے لے لیا جائے اس لئے نصرت اسلام کے لئے آج ان کو ساتھ لیا اور شریک کار بنایا، مباہلہ کے اس شرکا میں سب سے کم سن حسین تھے اور ان کو رسول خود اپنی گود میں لے گئے تھے پیغمبر خدا کی نگاہ ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہی تھی کہ اسی حسین کی قربانی کی دنیا کو ضرورت پیش آئے گی۔ چنانچہ ۶۱ھ میں وہ پیش آ گئی۔ یہ اہلبیت دنیا میں اسی لئے چھوڑے گئے تھے اور ان کا تعارف مسلمانوں سے اسی لئے کرایا گیا تھا کہ یہ اسلامی نظام و تمدن کی زندہ تصویر تھے۔ کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ جن مسلمانوں کی تربیت اس معیار پر کی جا رہی ہو، ان مسلمانوں میں صرف پچاس برس کے بعد ہی

یہ وقت آگیا کہ دارالحکومت اسلامی میں ریشم کے پردے لٹک رہے ہوں اور غلام زرّیں کمربند لگائے ہوئے بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوں اور دروازوں کے اوپر پہرے لگے ہوں تاکہ کسی غریب کی رسائی نہ ہوسکے اور کسی مظلوم کی فریاد انُس کے کانوں تک پہنچانا ناممکن ہو جائے یہی نہیں بلکہ بادشاہ کے سامنے طلا و نقرہ کے برتنوں میں پانی پلایا جارہا ہو۔

یہ سب باتیں یزید سے پہلے ہو چکی تھیں اور اگر کوئی صحابی مثلاً عبادہ بن صامت وغیرہ ٹوکتے بھی تھے تو ان کو قدامت پسند ہونے کی سند ملتی تھی۔

یاد رکھئے یہی حالات ترقی کرکے یزید کے کردار کے درجے تک پہنچے یزید سے پہلے سونے چاندی کے برتنوں میں پانی پیا گیا جو ظرف کے اعتبار سے شرعِ اسلامی میں حرام ہے تو یزید کے یہاں شیشے کے جاموں میں شراب پی جانے لگی اور شراب کے دور چلنے لگے۔ اب بجائے صدائے تکبیر کے نائے و نوش کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، رنگ برنگ کی محفلوں میں نماز کا وقت اگر گزر جاتا لیکن رونق محفل میں کچھ فرق نہ آتا۔

غضب یہ ہے کہ یہ سب جانشینیٔ رسولؐ کے نام پر ہو رہا ہو اور سب مسلمان درباری وغیرہ مان رہے ہوں اور یہ ہونا اتنا حیرت ناک نہیں جتنا کہ عام طور پر مسلمانوں کا ماننا یعنی یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور مسلمان اس حاکم کو خلیفۂ رسول مان رہے ہوں آج کا مسلمان ضرور حیرت سے یہ پوچھے گا کہ کیا مسلمان اس کو مان رہے تھے؟

جی ہاں سب مان رہے تھے اگر سب نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ شمار کرکے کیوں بتاتی کہ فلاں فلاں نے نہیں مانا۔ تاریخ کا شمار کرنا بتا رہا ہے کہ سب مان رہے تھے۔ وفات پیغمبرؐ کے پچاس برس کے بعد ہی احساس مذہبی کا یہ حال ہو چکا تھا اور ۶۱ھ سے اب تک کہ تیرہ سو برس ہو چکے ہیں مگر جب کہ عموماً احساس کیا جاتا ہے کہ اسلام گھٹتا چلا جا رہا ہے اور تمدن و تہذیب کی حدیں پامال ہو رہی ہیں مگر ۶۰ھ کے مقابل

میں اس وقت بھی حالت بہتر ہے اور یہ مجمع کم نہیں ہے۔ مگر میں اسی جلسے کے مجمع سے شہر اور دیہات سے آئے ہوئے تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی یزید ایسے شخص کو جانشین رسول مان سکتا ہے۔

آج کے جاہل سے جاہل اور فاسق سے فاسق مسلمان سے بھی پوچھا جائے تو یزید ایسے کسی آدمی کو جانشین رسولؐ نہ مانے گا لیکن رسولِ خدا کی وفات کے صرف پچاس برس کے بعد لوگ مان رہے تھے کیا اس کے بعد بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

ظلم اور فسق و فجور سے یہ نفرت کیونکر پیدا ہوئی۔ یہ واقعۂ کربلا کا فیض ہے آج کا یہ مسئلہ اور اس طرح کی تمام یادگاریں اس اثر کو زندہ رکھنے کے لئے ہیں اسی کے لئے عزاداری ہوتی ہے اور اسی کے لئے نام حسینؑ کی تکرار کی جاتی ہے۔

اب بھی سوال ہوگا کہ حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا اور یہ کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ میں کہوں گا کہ وہ حسینؑ نہ ہوتے جو مان لیتے کوئی اور ہوتا۔ حسینؑ تو کبھی پشیمان نہیں ہوئے کہ مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا حسینؑ کے ساتھ والا بھی کوئی پشیمان نہ ہوا، کوئی بچہ حسینؑ کے ساتھ کا نادم نہ ہوا۔ اور ادھر کوئی اور کیا خود یزید ملعون نادم ہوا۔ !

مگر یاد رکھئے اس فرق کو کہ وہ ندامت زندہ ضمیر کا نتیجہ نہ تھی جسے توبہ سمجھا جاسکے بلکہ وہ احساس شکست کا نتیجہ تھی اب اس خیال سے کہ میرے بعد والے مقررین پر ظلم ہوگا اور مجھے خود جلسے کے مفاد کا بھی احساس ہے اس لئے اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا کرے جس طرح آج کے جلسہ میں اجسام یک جا ہوگئے ہیں اسی طرح ہمارے دل و دماغ بھی یکجا ہو جائیں اور حسینیت کا جھنڈا خدا کرے برابر لہراتا رہے۔ اور مشرق سے مغرب تک کو اپنے سائے میں لے لے۔ ! (آمین)

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا
یا
جنگِ قسطنطنیہ



حامیان یزید کو یزید کی بدانجامی کے احساس کی بناء پر تیرہ سو برس سے جو فکر لاحق ہے اس کے نتیجہ میں بڑی کدوکاوش کے بعد انھوں نے اس کی "مغفرت" کے لئے صحیح بخاری سے جو سند حاصل کی ہے اور جسے اس چودھویں صدی میں محمود عباسی نے بھی "جہاد قسطنطنیہ و بشارت مغفرت" کی سرخی قائم کر کے درج کیا ہے وہ یہ موضوع حدیث ہے کہ اول جیش من امتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم ۔ اور جب تنہا حدیث کے الفاظ اثبات مطلب کے لئے کچھ ناکافی ثابت ہوئے تو شارحین بخاری کے بیان سے مدد لی جاتی ہے کہ قسطلانی نے اس حدیث کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد رومی نصرانیت کا صدر مقام قسطنطنیہ ہے اور ابن حجر شارح بخاری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث معاویہؓ اور ان کے فرزند یزید کی منقبت میں ہے اور پھر اس کے لئے کسی ام حرام کی یہ روایت بھی تلاش کر لی کہ ان کے گھر میں رسولؐ نے قیلولہ فرمایا تھا اور خواب میں معاویہؓ کے بحری جہاد کا نقشہ دیکھا اور فرمایا کہ میری امت کی پہلی فوج جو بحری جہاد کرے گی اس پر جنت واجب ہے اور ابن کثیر شامی کہتے ہیں کہ ام حرام نے جب یہ بشارت سنی تو رسولؐ سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ میں بھی ان میں شامل ہوں۔

آپ نے فرمایا کہ تم بھی اس میں شامل ہو گی پھر ابن کثیر شامی اور ابن تیمیہ شامی کے شاگرد ذہبی کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین بھی اس جنگ میں شریک تھے اس طرح گویا قاتل و مقتول دونوں کے جنتی ہونے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔

حالانکہ اول تو اس حدیث کے راویوں کو جانچنا چاہیئے، پتہ چلے گا کہ ان میں کئی آدمی ناصبی ہیں جو علانیہ اہل بیت رسول ؐ کے دشمن تھے چنانچہ فاضل ہمعصر نہال احمد صاحب حنفی اپنی کتاب "ناصبان ملک عضوض ص ۳۴۲ پر لکھتے ہیں "اس روایت کے چاروں راویان آخر اسحق و یحیٰی و تور و خالد بن محمد مجروح و مقدوح ہیں ان میں سے تین تو قدری اور ناصبی بھی ہیں اور ارسال سے بھی کام لیا گیا ہے اور سب دمشقی و حمصی بھی ہیں۔ جہاں بنی امیہ کی پروردہ نسلیں آباد تھیں۔ اور ان کی رگوں میں بنی امیہ کا کھلایا ہوا نمک دوڑ رہا تھا۔

پھر یہ کہ جب بات تاریخ سے بڑھ کر حدیث تک پہنچ گئی تو یہ ایک حدیث اگر بظاہر مغفرت بتاتی بھی ہو تو وہ بھی ایسے عام الفاظ کی بناء پر تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کے بالمقابل ایسی دوسری احادیث تو نہیں ہیں جو خواہ سندی طور پر قابل ترجیح ہونے کی وجہ سے اس حدیث کے مطروح و متروک قرار دینے کے باعث ہو جائیں اور خواہ دلالت میں قوی ہونے کی وجہ سے اس کے اطلاق میں تقیید یا عموم میں تخصیص کا باعث ہوں۔ چنانچہ علامہ قسطلانی نے جن کا حوالہ دے کر عباسی صاحب نے مہلب کا استدلال مفید مطلب ہونے کی وجہ سے نقل کر دیا جو اس کی رد و جرح کی ہے وہ یہی ہے کہ

اجيب بان هذا جار على طريق الحمية لنبي امية ولا يلزم من دخوله في ذالك العموم ان لا يخرج بدليل خاص اذ لا خلاف ان قوله عليه السلام مغفور لهم مشروط بكونه من اهل المغفرة حتى لو ارتد واحد ممن غزاها بعد ذالك لم يدخل في ذالك العموم اتفاقا قاله ابن المنير (قسطلانی جلد ۵ ص ۱۲۱)

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ استدلال صرف بنی امیہ کی طرفداری کی بنا پر ہے عموم الفاظ میں اس کے داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی دلیل خاص کی بنا پر اس سے خارج نہ ہو سکے اس لئے کہ بالاتفاق حضرت کے اس ارشاد میں کہ وہ بخشے جائیں گے یہ شرط ہے کہ وہ بخشش کے قابل ہوں یہاں تک کہ اگر اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں سے کوئی بعد میں مرتد ہو جائے تو وہ بالاتفاق اس عام حکم میں داخل نہ ہوگا۔"

یہ ابن منیر نے کہا ہے!

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند کا ارشاد جسے شیخ الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے درج کیا ہے مولانا مدنی ہی کے ساتھ ملاحظہ ہو:۔

"غایۃ ما فی الباب بسبب خرابی ہائے پنہانی کہ داشت ہمچو منافقان کہ در بیعت الرضوان شریک بودند بوجہ نفاق رضوان اللہ، نصیب او شان نہ شد، یزید ہم از فضائل این بشارت محروم ماند (انتہیٰ کلامہ علیہ الرحمۃ) یعنی جس طرح بیعت رضوان میں منافقین شریک ہوئے اور اپنے نفاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل نہ کر سکے یزید بھی اپنی اندرونی خرابیوں کے باعث اس بشارت کی فضیلت سے محروم رہا۔ (قاسم العلوم نمبر ۴ ص۱۳) (منقول از مکتوبات شیخ الاسلام جلد ۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی صحت بالفرض تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ حدیث مغفرت کی علت تامہ کا اظہار نہیں کرتی بلکہ مقتضی کو بیان کرتی ہے جس کے ساتھ شرائط اور موانع ہو سکتے ہیں جیسے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ حدیث درست ہے مگر اس میں شرائط کا لحاظ ضروری ہے ان شرائط کو نظر انداز کے تصور کو سیاسی مقاصد سے یزید اور اس کے بعد کے سلاطین ہی نے قائم کیا ہے اور اسی غلط تصور میں اس نے ہر قسم کے معاصی کا دیدہ دلیری سے ارتکاب کیا بلکہ عباسی صاحب کے بڑے معتمد علیہ مورخ ابن کثیر نے بھی یزید کی بداعمالیوں کا باعث اسی غلط تصور

کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

حدثنا اسحٰق بن عیسیٰ عن ابی حسنة عن ابی ایوب الانصاری انه قال حین حضرته الوفاة قد کنت کتمت عنکم شیئاً سمعته من رسول اللّٰه سمعته یقول لولا انکم تذنبون لخلق اللّٰه قوما یذنبون فیغفر لهم وعندی ان هذا الحدیث والذی قبله حمل یزید بن معاویة علی طرق من الارجاء ورکب بسببه افعالا کثیرة انکرت علیه

(البدایة والنہایة ج ۸، ص۲۲۹)

اسحٰق بن یعقوب کی روایت ہے ابو حسنہ سے کہ ابو ایوب انصاری نے اپنی وفات کے وقت کہا کہ میں نے ایک بات تم لوگوں سے چھپا رکھی تھی جو میں نے رسول خدا سے سنی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے ہوتے تو وہ انھیں بخشے۔ میرے نزدیک یہ حدیث اور اس کے پہلے والی حدیث ہی نے یزید بن معاویہ کو ایک حد تک مرجئہ کے مسلک پر ڈال دیا اور اس کے سبب سے اس نے بہت سے قابل اعتراض افعال کا ارتکاب کیا۔

قاضی اطہر مبارک پوری اپنی کتاب "علی و حسین" میں لکھتے ہیں۔

"اس سے پہلے والی حدیث من مات لا یشرک باللّٰه شیئاً جعله اللّٰه فی الجنة ہے۔ اسی طرح یزید نے حضرت معاویہؓ سے اپنے ولی عہد بننے کا اصرار کرتے ہوئے ایک حدیث بیان کی تھی اور کہا تھا "لانی وجدت فی الاثارات من تقلد امر الامة ثلثة ایام حرمه علی النار ص۱۲۶)

وہ کہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ نے یزید کو مرجئہ کی صف اول میں کھڑا کر دیا ہو۔ ارجاء اور مرجئیت نے بنو امیہ کے دور میں ان ہی حالات میں جنم لیا اور حکمرانوں کی خرابی کو برداشت کرنے کے لئے اس وقت کی سیاست نے یہ ذہن پیدا کیا اور بڑے سے بڑے گناہ کرنے کے باوجود اللّٰہ تعالٰی سے رحمت و مغفرت کی رجاء اور امید کا نظریہ

پیش کیا اور ہر طرح کے گناہ اور گناہ گار کو انگیز کر کے اس کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ ختم کرنے کی کوشش کی۔" (علی و حسینؑ ص۲۲۶)

تیسری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں بہ فرض صحت قسطنطنیہ کا نام نہیں ہے بلکہ مدینۃ قیصر کا لفظ ہے اور یہ امر ثابت نہیں ہے کہ بوقت صدور حدیث مدینۃ "قیصر کا اطلاق قسطنطنیہ پر ہوتا ہو اور وہ ملک روم کا دارالسلطنت ہو۔

مولوی نہال احمد صاحب حنفی امروہوی لکھتے ہیں۔

جب تک کسی مخصوص شہادت سے یہ ثابت نہ کیا جائے کہ زمانہ رسالتمآبؐ میں قسطنطنیہ اور صرف قسطنطنیہ ہی مدینۃ قیصر بطور علم بولا جاتا تھا ہم محض کسی شخص کی ذاتی رائے کی بنا پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مدینۃ قیصر سے آنحضرت کی مراد خاص قسطنطنیہ ہی تھی۔ فتح الباری میں ابن التین اور ابن المنیر کے بیانات موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مدینۃ قیصر سے مراد شہر حمص ہے۔" (ناصبان ملک عضوض ص۳۶۵)

مولوی عبدالشکور صاحب سابق مدیر النجم لکھتے ہیں۔

"یرموک کی لڑائی میں شکست پانے کے بعد بادشاہ روم اپنے دارالسلطنت حمص سے بھاگ گیا۔" الخ

(سیرت خلفائے راشدین ص۳۹)

اکبر شاہ خان لکھتے ہیں۔" انطاکیہ قیصر ہرقل کا ایشیائی دارالسلطنت تھا۔" (تاریخ اسلام ص۲۳۹)

چوتھے۔ اس حدیث کے (بفرض صحت) الفاظ یہ تھے۔ کہ "پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر جہاد کرے گی ان کے لئے مغفرت ہے۔

مگر خود عباسی صاحب کے قلم سے آگے چلکر اس استدلال کی رد ہوگئی ہے جب آپ نے یزید کے مدائح و مناقب میں عنوان قائم کیا ہے۔" حمایت دینیہ و خدمات ملیۃ،، اور اس کے تحت میں لکھا ہے کہ "معاویہؓ نے رومی عیسائیوں کے خلاف ۱۶ مرتبہ بحری و بری جہاد کئے تھے۔"

اور ہدایہ و نہایہ کے حوالے سے یہ درج کیا ہے کہ گرمیوں اور سرد یوں میں (جداگانہ) عسکری مہمیں بھیجا کرتے تھے"۔

(صفحہ ۳۱۰) پھر لکھتے ہیں۔

"یزید جیسے پرجوش قریشی نوجوان کو زمانہ شباب میں جہادی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی تڑپ بے چین کئے ہوئے تھی آخر کار اپنے والد محترم سے درخواست کی کہ گرمیوں کی عسکری مہم پر مجھے تعینات کریں"۔ (ص ۳۱۱)

"آخر کار کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ یہ بہت سی مہموں کے بعد کی بات ہے۔ اس صورت میں وہ حدیث کہ اوّل جیش "سب سے پہلا لشکر" اس "آخر کار" والی مہم پر کیونکر منطبق ہو سکتی ہے۔؟

جیسا کہ قاضی محمد اطہر مبارک پوری نے لکھا ہے۔

"بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر آئی ہے مثلاً کتاب الاستیذان حین باب من زار قوماً فقال عندھم میں یا کتاب الجہاد کے غزوۃ المرأۃ فی البحر میں، نیز کتاب الجہاد کے باب من یصرع فی سبیل اللہ فمات فھو منھم میں باب ما قیل فی قتال الروم۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ اول جیش من امتی یغزون البحر قد اوجبوا قالت ام حرام قلت یا رسول اللہ انا فیھم قال انت فیھم۔ اس کے لئے وہ لکھتے ہیں۔

"پہلا بحری غزوہ جیسا کہ معلوم ہوا ہے حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ہوا اور معاویہؓ کی امارت میں ان کے اصرار سے ہوا جس میں ام حرام بنت ملحان اپنے شوہر کے ساتھ شریک ہوئیں اور قبرص میں اپنی سواری سے گر کر شہید ہوئیں۔ اور وہیں دفن ہوئیں"۔ (علی و حسین ص ۲۴)

فتح قسطنطنیہ کے سلسلے میں جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں۔

صاحب عمدۃ القاری شارح بخاری نے اسے تسلیم ہی نہیں کیا کہ

قسطنطنیہ کے جس غزوہ میں اکابر صحابہ شریک ہوئے تھے وہ یزید کی قیادت میں ہوا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

قال صاحب المرأة والاصح ان یزید بن معاویة غزا القسطنطنیة فی سنة اثنین وخمسین وقیل سیر معاویة جیشا مع سفیان ابن عوف الی القسطنطنیة فادخلوا فی بلاد الروم وکان فی ذلک الجیش ابن عباس وابن عمر وابن الزبیر وابوایوب الانصاری وتوفی ابوایوب فی مدة الحصار قلت الاظهر ان هولاء السادات من الصحابة کانوا مع سفیان هذا ولم یکونوا مع یزید بن معاویة (عمدة القاری ج ۶ ص ۶۴۹)

مصنف مراۃ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یزید بن معاویہ نے قسطنطنیہ کی جنگ میں ۵۲ھ میں شرکت کی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ معاویہؓ نے ایک لشکر سفیان بن عوف کے ساتھ قسطنطنیہ کی جانب روانہ کیا یہ لوگ ملک روم کے اندر دور تک چلے گئے۔ اس لشکر میں ابن عباس اور ابن عمر اور ابن زبیر اور ابوایوب انصاری تھے اور محاصرہ کے دوران میں ابوایوب کی وفات ہوئی میں کہتا ہوں کہ زیادہ ظاہر امر یہ ہے کہ یہ بزرگ صحابہ ابوسفیان کے ساتھ تھے یزید بن معاویہؓ کے ساتھ نہیں تھے۔

اکبر شاہ خاں تحریر کرتے ہیں۔

"جب عظیم الشان لشکر مرتب ہو گیا تو سفیان بن عوف کی سپہ سالاری میں قسطنطنیہ کی جانب روانہ کیا اور سفیان بن عوف کی ماتحتی میں اپنے بیٹے یزید کو بھی جو سابقہ فوج کا افسر تھا ایک حصہ فوج دیا۔"

(تاریخ اسلام ص ۱۳)

بس آخر میں جہاد قسطنطنیہ میں یزید نے شرکت کی وہ جب بھی ہوئی ہو معتدد سن لیجئے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں۔

وفی هذه السنة وقیل سنة خمسین سیر معاویة جیشا کثیفا الی بلاد الروم للغزاة وجعل علیهم سفیان بن

عوف وامر ابنه یزید بالغزاة معهم فتثاقل واعتل فامسك عنه ابوه فاصاب الناس فی غزاتهم جوع ومرض شدید فانشأ یزید یقول

ما ان ابالی بما لاقت جموعهم
بالفرقدونة من حمی ومن موم
اذا اتکأت علی الانماط مرتفقاً
بدیرمران عندی ام کلثوم

ام کلثوم امرأته وهی ابنة عبد الله بن عامر
فبلغ معاویة شعره فاقسم علیه لیلحقن بسفیان فی الروم لیصیبه ما اصاب الناس (ابن اثیر ص ۱۹۷/۳)

اور اسی سنہ میں اور ایک قول یہ ہے کہ ۵۰ھ میں معاویہؓ نے ایک بڑا لشکر بلاد روم کی طرف جنگ کے لئے روانہ کیا اور ان پر سفیان بن عوف کو سردار مقرر کیا اور اپنے بیٹے یزید کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ جائے مگر اس نے سستی سے کام لیا اور بیمار بن گیا تو اس کے باپ نے چھوڑ دیا اس جنگ میں لوگوں کو بھوک اور سخت بیماری کا سامنا کرنا پڑا تو یزید نے یہ شعر کہے۔!

"مجھے اس کی نہیں پرواہ جو ان فوجیوں پر گزری مقام فرقدونہ میں بخار اور نحوست سے جبکہ میں ریشمی گدے سے لگا ہوا دیر مران میں بیٹھا ہوں اور میرے پاس ام کلثوم موجود ہے"

(یہ ام کلثوم اس کی بیوی کا نام ہے جو عبد اللہ بن عامر کی لڑکی تھی) معاویہؓ کو اس کے ان شعروں کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اسے قسم دی کہ وہ سفیان کے پاس سرزمین روم پر ضرور جائے تاکہ وہ بھی اس مصیبت کو جھیلے جو اور لوگوں کو جھیلنا پڑی۔

مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

اس سے ایک طرف یہ عقدہ کھلا کہ یزید کو جہاد کا کتنا شغف تھا؟

جیسے عیش پرستی میں یہ انہماک ہو کہ باوجود امیر کے حکم کے طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے جہاد سے جان بچائے پھر اس کے ساتھ خود غرضی اور خود منصبی کا یہ عالم کہ وہاں تو مجاہدین پر بھوک پیاس اور بیماری کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور یہاں یزید داد عیش دیتے ہوئے ترنم کر رہا ہے کہ مجھے پرواہ نہیں ہے کہ کون بھوک پیاس میں مر رہا ہے اور کون دکھ درد کا شکار ہے مجھے تو دیر مرّان کے مکلّف فرش تکیے اور ان کے ساتھ ام کلثوم کی ہم بستری بھلی ہے۔ کہاں کا جہاد اور کہاں کے مجاہد"

(شہید کربلا اور یزید ص۱۴۰)

یزید اس جہاد میں خود اپنے داعیہ سے شریک نہیں ہوا بلکہ اپنے والد بزرگوار کے حکم سے اور انھوں نے یہ حکم بھی اسے اگر دیا تو تعزیراً دیا تاکہ اس کی عیش پرستی پر اثر پڑے۔ اور اسے اس تعیش پسندی اور غفلت پروری کی سزا مل جائے۔ (ص۱۶۱)

قاضی اطہر مبارک پوری نے اس روداد کو ابن خلدون کی زبانی نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"امیر معاویہؓ نے ۵۰ھ میں ایک بہت بڑا لشکر بسر براہی سفیان بن عوف بلاد روم کی طرف روانہ کیا اور اپنے لڑکے یزید کو بھی ان کے ہمراہ جانے کا حکم دیا لیکن یزید نے جانا پسند نہ کیا معذرت کی۔ اس پر امیر معاویہؓ نے اس کی روانگی ملتوی کر دی۔ اتفاق سے مجاہدین کو اس لڑائی میں اکثر مصائب کا سامنا ہوا یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بے ساختہ یہ اشعار پڑھنے لگا:-

مالی ابالی بما لاقت جموعہم ۔۔۔ بالفرقدونة من حمی ومن شوم
اذا اتکات علی الانماط مرتفعا ۔۔۔ بدیر مروان وعندی ام کلثوم

امیر معاویہؓ کے کانوں تک ان اشعار کی آواز پہنچ گئی۔ یزید کے بھیجنے کی قسم کھائی۔ (ترجمہ تاریخ ابن خلدون ج۵ ص۲۲-۲۳)

کیا اس پر کہنے والے کو یہ کہنے کی ہمت
ہوتی ہے کہ "یزید کو زمانہ شباب میں
جہادی سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی
تڑپ بے چین کئے ہوئے تھی"

اس کے علاوہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید نے اپنے باپ کی بہت سی محنت پر اپنے دور میں پانی پھیر دیا چنانچہ علامہ بلاذری لکھتے ہیں۔

بعث الیہا اثنی عشر الفا کلھم اھل دیوان فبنوا المساجد ونقل الیہا جماعۃ من بعلبک وبنی بہا مدینۃ واقاموا یعطون الاعطیۃ الی ان توفی معاویۃ وولی بعدہ ابنہ یزید فاقفل ذالک البعث وامر بھدم المدینۃ۔ وحدثنی محمد بن مصفی الحمصی عن الولید قال بلغنا ان یزید ابن معاویۃ رشی مالاعظیما ذا قدر حتی اقفل جند قبرص فلما ولوا ھدم اھل قبرص مدینتھم ومساجدھم۔ (فتوح البلدان ص۱۶۰ طابع مصر)

وہاں بارہ ہزار فوجی بھیجے گئے انھوں نے وہاں مسجدوں کی تعمیر کی اور بہت سے بعلبک کے باشندوں کو وہاں منتقل کیا۔ اور وہاں ایک شہر کی بنیاد ڈالی اور سب نے وہاں قیام کیا۔ انھیں تنخواہیں دی جاتی تھیں یہاں تک کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا یزید اس کے بعد حاکم ہوا تو اس نے وہ تنخواہیں بند کر دیں اور شہر کو مسمار کرا دیا۔ اور محمد بن مصفی حمصی نے مجھ سے بیان کیا ولید کی زبانی کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یزید نے ایک بڑی رقم رشوت میں لیکر قبرص کی فوج کو واپس بلا لیا جب فوج چلی گئی تو قبرص کے لوگوں نے ان کے شہر اور مسجد کو مسمار کر دیا۔

انتقامِ خونِ حسینؑ

مورخ طبری کا بیان ہے کہ حضرت امام حسینؑ شہید ہو گئے اور ابن زیاد اپنے لشکر گاہ سے جو نخیلہ میں قرار دیا گیا تھا واپس ہو کر پھر کوفہ میں داخل ہوا تو شیعان علیؑ نے ایک دوسرے کو تعزیں و ملامت اور اپنی کمزوری پر اظہار ندامت کرنا شروع کیا اور یہ اچھی طرح محسوس کرنے لگے کہ ہم سے ایک بڑے جرم کا ارتکاب ہوا کہ پہلے تو امام حسینؑ سے نصرت کے وعدے پر کوفہ تشریف لانے کی خواہش کی مگر جب آپ ہماری دعوت منظور فرما کر عراق تشریف لے آئے تو ہم آپ کی مدد کو نہ گئے یہاں تک کہ آپ بالکل ہمارے قریب ہی قتل کر ڈالے گئے لہٰذا انھوں نے طے کر لیا کہ یہ عار و ننگ ہم سے دور نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان لوگوں کو جنھوں نے آپ کے قتل میں شرکت کی تھی۔ قتل نہ کر لیں یا اس کوشش کے ذیل میں خود بھی اپنی جان دے دیں چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں دوستان اہل بیت میں سے پانچ اہم شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا۔ سلیمان بن صرد خزاعی جو اصحاب رسولؐ میں سے تھے۔ مسیب بن نجبہ فزاری جو اصحاب حضرت علیؑ میں ممتاز شخصیت رکھتے تھے عبداللہ بن سعد بن نفیل ازدی۔ عبداللہ بن وال تمیمی اور رفاعہ بن شداد بجلی چنانچہ یہ پانچوں آدمی اور دوسرے بہت سے ممتاز افراد سلیمان بن صرد خزاعی کے مکان پر جمع ہوئے اور مسیب بن نجبہ نے تقریر کی۔

[1] جس میں کہا گیا کہ ہم اپنی سچائی پر ناز اور اپنی جماعت پر فخر کیا کرتے تھے لیکن جب خدا نے ہمارا امتحان لیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے دعوے سراسر

---

[1] طبری جلد ۷۔ صفحہ ۴۷

غلط تھے۔ ہم نے امام حسینؑ کو دعوت دی اور ان کے پاس پیغام بھیجے کہ آئیے ہم آپ کی نصرت پر آمادہ ہیں لیکن آپ جب تشریف لے آئے تو ہم نے اپنی جان چرائی اپنے جان و مال بلکہ اپنی زبان سے فریضہ نصرت و حمایت کو ادا نہ کیا اور نہ اپنے قبیلے ہی کو اس کے لئے آمادہ کیا۔ اب ہم خدا و رسولؐ کو کیا جواب دیں گے جب کہ ہمارا کوئی عذر قابل قبول قرار پا ہی نہیں سکتا۔ البتہ یہ ایک صورت ہو سکتی ہے۔ قتل حسینؑ میں کسی حیثیت سے بھی جن جن نے حصہ لیا۔ ان سب اشخاص کو ہم قتل کریں گے یا اس سلسلے میں خود اپنی جانوں سے گزر جائیں گے۔ اب آپ لوگوں کو لازم ہے کہ کوئی اپنا سردار منتخب کریں جس کی زیر قیادت اس مہم کی تکمیل ہو۔

ان کی تقریر کے ختم ہوتے ہی رفاعہ بن شداد کھڑے ہوئے اور انھوں نے مناسب الفاظ میں ان کی تائید کی اور کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ ہی کو اس مہم کی قیادت سپرد کی جائے۔ یا اگر آپ کی رائے ہو اور دوسرے حضرات بھی متفق ہوں تو ہم اس ذمہ داری کو اپنی جماعت کی سب سے معمر شخصیت سلیمان بن صرد کے سپرد کر دیں۔ جو پیغمبر خدا کے صحابی ہیں اور جن کے کارنامے نصرت دین میں سب ہی کو معلوم ہیں۔ اور جن کی اصابت رائے اور بصیرت بھی قابل اعتماد ہے عبداللہ بن وال اور عبداللہ بن سعد نے بھی اپنی اپنی تقریروں میں مزید تائید کی اور مسیب بن نجبہ اور سلیمان بن صرد دونوں کی اہلیت کا اقرار کیا آخر میں مسیب بن نجبہ کی اختتامی تقریر کے بعد بالاتفاق سلیمان بن صرد کا اس جماعت کی قیادت کے لئے انتخاب ہو گیا۔

اب سلیمان کھڑے ہوئے اور انھوں نے انتہائی پُر زور درد انگیز ایک تقریر کی جسے وہ اس کے بعد سے ہر جمعہ میں دہرایا کرتے تھے۔ [۱]

اس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے۔

"ہم لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر اشتیاق کے ساتھ اہلبیت رسولؐ کی تشریف آوری کی راہ دیکھ رہے تھے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے تغافل و تساہل سے

---

[۱] طبری جلد ۷ صفحہ ۴۸

سے کام لیا یہاں تک کہ فرزند رسولؐ ہمارے ملک میں اور ہمارے قریب قتل کر دیئے گئے جب کہ آپ استغاثہ بلند کر رہے تھے لیکن کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا۔ گروہ فاسقین نے ان کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا اور نیزوں کے سنہ مشق بنائے دکھایا یہاں تک کہ آپ شہید ہو گئے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اعداء نے بعد شہادت آپ کا لباس تک لوٹ لیا پھر اب اٹھنا ہے تو اٹھ کھڑے ہو۔ اللہ کا غضب حرکت میں آچکا ہے۔ پس اب طے کر لو کہ اپنے بیوی بچوں کے پاس اس وقت تک واپس نہیں جاؤ گے جب تک اللہ کی خوشنودی کا سامان نہ کر لو۔ اور بخدا میرے خیال میں تو وہ اس وقت تک تم سے خوشنود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے قاتلوں کو کیفر کردار تک نہ پہنچا دو۔ یا خود اسی راہ میں جان نہ دے دو۔ ہاں خبردار موت سے ڈرنا نہیں کیونکہ جو کوئی موت سے ڈرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے دیکھو تو بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے جب گئو سالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا تو ان کی توبہ کس طرح قبول ہوئی ان سے کہا گیا کہ تم اپنے نفوس کے قتل کرنے پر تیار ہو جاؤ۔ اس پر جماعت نے کیا کیا وہ گردنیں بڑھا کر فیصلہ قدرت کے اجراء کے لئے تیار بیٹھ گئے اس لئے کہ انھیں اپنے جرم کا صحیح احساس تھا۔ اور یہ معلوم ہو گیا کہ بغیر اس کے توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔ اب تم بھی اگر اپنے کو مجرم سمجھ رہے ہو تو ایسی ہی قربانی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تلواریں تیز کر لو۔ نیزوں کی انیاں درست کر لو۔ اور پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار ہو کر بیٹھ جاؤ کہ جب تمھیں دعوت دی جائے تو تم فوراً چل کھڑے ہو۔ دیر نہ ہونے پائے۔

یہ پر جوش تقریر تھی جسے سنکر مجمع کے جذبات میں طوفان برپا ہو گیا متعدد مقررین نے کھڑے ہو کر اپنے تاثرات اور عزائم جہاد کا اظہار کیا۔ عبداللہ بن وال تیمی خزانچی مقرر ہوئے اور یہ طے پایا کہ ان کے پاس سرمایہ جمع کیا جائے۔ اور عزم و ولولہ سے بھرا ہوا مجمع منتشر ہوا۔

اب سلیمان نے مدائن میں سعد بن حذیفہ بن یمان اور دوسرے مقامات پر کچھ دوسرے اشخاص کو خطوط بھی لکھے [1]

---

[1] طبری جلد ۷ صفحہ ۴۹

ان خطوط کے مضمون کا اہم حصہ حسب ذیل تھا۔

شیعیان اہلبیت نے اپنے اس موقف پر غور کیا جو ان سے روکا ہوا فرزند رسول کے بارے میں جنھیں دعوت دی گئی اور اس پر وہ تشریف لے آئے مگر جب انھوں نے دعوت نصرت دی تو اس پر لبیک نہ کہی گئی اور انھوں نے واپس جانا چاہا تو دشمنوں نے اسے روکا اور انھوں نے امان چاہی تو انکار کیا گیا اور انھوں نے چاہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں مگر دوسروں نے انھیں نہ چھوڑا اور ان پر چڑھائی کر کے انھیں شہید کر ڈالا۔ پھر ان کا لباس لوٹ لیا اور لاش مطہر کو عریاں چھوڑ دیا اب ہماری جماعت نے اس صورت حال پر غور کیا ہے اور انھیں شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ ان سے اس معصوم کی مدد کرنے میں بہت بڑی خطا سرزد ہوئی ہے جس کا کفارہ یہی ہے کہ ان کے قاتلوں کو قتل کریں یا خود اپنی جان دے دیں اب یہ بالکل تیار ہو گئے ہیں لہذا آپ لوگ بھی تیار ہو جائیں ہم نے اس مہم کے آغاز کے لئے ایک تاریخ اور جگہ مقرر کر دی ہے۔ جس میں سب کو مجتمع ہونا چاہیئے۔ تاریخ یکم ربیع الثانی ۶۵ھ ہوگی اور جگہ مقام نخیلہ۔

یہ خط سعد کو پہنچا اور انھوں نے مدائن کے شیعوں کو پڑھ کر سنایا اور اس کے ساتھ خود تقریر کی[۱] جس میں کہا گیا کہ واقعہ یہ ہے کہ آپ لوگ متفقہ طور پر حضرت امام حسینؑ کی نصرت کا عزم رکھتے تھے اور جونہی انکے تشریف لانے کی اطلاع ملے فوراً ان کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر آپ کو اچانک ان کی شہادت کی خبر ملی جس سے مجبور ہو گئے بہرحال اللہ کے یہاں آپ کی نیتوں کا اجر ملے گا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آپ کے برادران دینی اہل باطل سے مقابلے کے لئے آپ کی مدد کے خواستگار ہیں۔ لہذا غور کرنا ہے کہ اس بارے میں کیا کرنا چاہیئے۔

سب نے کہا کہ ہم ضرور ان کی مدد کریں گے اور متفقہ طور پر دشمنان اہلبیت سے جہاد کریں گے۔ چنانچہ سعد بن حذیفہ نے سلیمان بن صرد کے خط کا جواب اقرار نصرت پر مشتمل روانہ کر دیا۔ اسی طرح کے جواب دوسروں

[۱] طبری جلد ۷ صفحہ ۵۰

کرنے بھی آئے۔

یہ سب کارروائیاں بالکل خاموشی سے ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ مکمل رازداری کے ساتھ کافی افراد اس تحریک سے متفق ہو گئے تاہم سنہ ۶۱ھ سے لے کر سنہ ۶۴ھ ربیع الاول یعنی ہلاکت یزید تک حالات ایسے پیدا نہیں ہو سکے کہ اس سلسلہ میں کوئی عملی اقدام کیا جا سکے۔ لہ مگر یزید کی موت کے بعد اس تحریک میں زیادہ قوت پیدا ہو گئی۔ اور اب تقریباً علانیہ اس کی اشاعت کی جانے لگی یہاں تک کہ یہ تحریک مصر تک بھی پہنچ گئی اور عبید اللہ بن عبداللہ مُرّی کی مسلسل تقریروں نے جن میں شہادت امام حسینؑ کا تذکرہ تھا نہایت مؤثر الفاظ میں کیں وہاں بھی جوش و خروش پیدا کر دیا۔ ۲ه

یکم ربیع الثانی سنہ ۶۵ھ مقررہ تاریخ پر یہ لوگ نخیلہ میں جمع ہوئے تو یہ دیکھ کر کسی حد تک مایوسی ہوئی کہ جن لوگوں نے اقرار نصرت کیا تھا اور جن کے نام فہرست میں درج ہو چکے تھے وہ سولہ ہزار تھے مگر تاریخ مقررہ پر جو تعداد جمع ہوئی وہ صرف چار ہزار تھی۔ ۳ه تاہم یہ لوگ عزم و ارادہ کے پختہ تھے۔ اس لئے قلت تعداد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے عملی اقدام کا تہیہ کر لیا بعض لوگوں کی رائے تھی کہ قاتلان حسینؑ کوفہ ہی میں موجود ہیں ان سے یہیں سمجھ لینا چاہیئے مگر سلیمان کی رائے یہ ہوئی کہ سب سے بڑا قاتل حضرت امام حسینؑ کا جو اس وقت موجود ہے۔ ابن زیاد ہے جس نے تمام شرائط مصالحت کو مسترد کیا اور کہا کہ جب تک حسینؑ غیر مشروط طور پر اطاعت نہ کر لیں ان کو امان نہیں مل سکتی لہٰذا اسی کے مقابلہ کو چلنا چاہیئے جب اس سے مقابلہ میں کامیابی ہو جائے تو پھر ان دیگر آدمیوں کو سزا دینا کون سا مشکل ہے۔ چنانچہ سب نے اسی رائے پر اتفاق کر لیا۔ ۴ه

شب جمعہ ۵ ربیع الثانی سنہ ۶۵ھ کو اندھیرے منہ یہ لوگ شام کے ارادہ سے روانہ ہو گئے۔ ۵ه

لہ طبری جلد ۷ صفحہ ۵۱۔ ۲ه طبری جلد ۷ صفحہ ۵۲۔ ۳ه طبری جلد ۷ صفحہ ۶۷۔
۴ه طبری جلد ۷ صفحہ ۶۸۔ ۵ه طبری جلد ۷ صفحہ ۶۹۔

صبح سے پہلے ان لوگوں نے جاکر قبر حسینؑ کی زیارت کی اس وقت انکے گریہ وشیون کا عجیب عالم تھا اور ہر ایک اس آرزو سے بے قرار تھا کہ کاش وہ نصرت امام میں روز عاشورہ کام آیا ہوتا۔ اور اس شہادت کے درجے کو حاصل کرتا۔

ایک شب و روز انھوں نے اسی عالم میں نوحہ و ماتم کے ساتھ ساتھ نماز و مناجات اور توبہ و استغفار میں بسر کی اس کے بعد جذبات کے انتہائی پُراثر تقریروں نے ولولہ و جوش کے دریا کو شدت کے ساتھ طوفانی کر دیا [۱]

ان مجاہدین نے منزل بہ منزل طے کر کے عین الوردہ میں جا کر اپنے صفوف مرتب کئے پانچ دن کے بعد شام کی فوجیں ابن ذی الکلاع اور حصین بن نمیر کی سرکردگی میں ان کے مقابل پہنچ گئیں اب سلیمان بن صرد نے آخری انتظامات کئے اور اعلان کیا کہ اگر میں کام آجاؤں تو سردار لشکر مسیّب بن نجبہ ہوں گے اور وہ شہید ہو جائیں تو سردار عبداللہ بن سعد بن نفیل ہوں گے اور ان کے بعد عبداللہ بن وال اور پھر رفاعہ بن شداد [۲]

روز چہار شنبہ ۸ جمادی الاول کو پہلا مقابلہ ہوا۔ باوجودیکہ دشمن کی فوج بارہ ہزار تھی۔ [۳]

اور یہ کل چار ہزار۔ مگر پھر بھی غالب آئے مگر دوسرے دن آٹھ ہزار فوج کی کمک ان کے مقابل میں آگئی جس کو عبیداللہ بن زیاد نے روانہ کیا تھا۔ آج بڑی شدت کا مقابلہ رہا اور رات آنے تک جنگ جاری رہی۔

اب زخمیوں کی تعداد مجاہدین میں بہت زیادہ تھی۔

تیسرے دن دشمنوں کی کثرت اور ان کی قلت سے حالت دگرگوں ہو گئی پھر بھی جان توڑ کر مقابلہ کرتے رہے۔ مگر آخر میں بزدل دشمنوں نے تیر باران کا سلسلہ جاری کر دیا۔ چنانچہ ایک تیر سلیمان بن صرد کے لگا جس سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے ان کے بعد علم لشکر

---

[۱] طبری جلد ۷ صفحہ ۷۰ – [۲] طبری جلد ۷ صفحہ ۷۳ – [۳] طبری جلد ۷ صفحہ ۷۵

مسیب بن نجبہ نے لیا اور بڑی بہادری سے لڑے کئی زبردست حملے کئے مگر آخر وہ بھی شہید ہو گئے۔ [1]

ان کے بعد عبداللہ بن سعد بن نفیل نے علم سنبھالا اور قبیلہ ازد کی جماعت کے ساتھ مقابلہ شروع کیا اس دوران میں مدائن کے تین سوار آئے جنھوں نے اطلاع دی کہ مدائن اور بصرہ سے کمک روانہ ہو چکی ہے مگر یہاں حالت اتنی نازک ہو چکی تھی کہ ان مجاہدین کی زندگی میں اس فوج کے پہنچنے کی امید نہ تھی۔ آخر وہ سوار دتینوں مجاہد بھی لڑ کر جان بحق تسلیم ہو گئے۔ [2]

اور اس کے بعد عبداللہ بن سعد اور پھر عبداللہ بن وال بھی شہید ہوئے [3]

اب شام ہو گئی تھی اس لئے وہ جنگ موقوف ہو گئی نامزد سرداروں میں اب صرف رفاعہ بن شداد باقی تھے مگر اب حالت یہ تھی کہ فوج کی تعداد چار ہزار سے گھٹ کر صرف چند سو باقی رہ گئی تھی اور ان میں سے بھی اکثر زخمی اور ناقابل جنگ تھے لہٰذا انھوں نے مقابلہ جاری رکھنے میں کامیابی کی صورت نہ دیکھتے ہوئے رات کے وقت اپنی قلیل جماعت کے ساتھ مراجعت اختیار کی اور اس طرح قاتلان حسینؑ سے بدلہ لینے کی یہ پہلی کوشش اختتام تک پہنچی۔ [4]



[1] طبری جلد ۷ صفحہ ۷۶
[2] طبری جلد ۷ صفحہ ۷۷
[3] طبری جلد ۷ صفحہ ۷۷
[4] طبری جلد ۷ صفحہ ۸۰

(بحوالہ ہفت روزہ شیعہ ۱۴ - ۲۱ جنوری ۱۹۷۶ء)

واقعہ کربلا اور پردے کی اہمیت

کربلا میں حق و باطل کی جنگ تھی۔ نصرتِ دین کا سوال تھا اور دشمنانِ اسلام کا مقابلہ تھا کوئی شک نہیں کہ حمایتِ حق اور نصرتِ دین جس طرح مردوں کا فریضہ ہے اسی طرح عورتوں کا فریضہ ہے مگر طریقہ کار اس کا دونوں کے لئے یکساں ہونا چاہیئے یا مختلف۔

موجودہ تمدن جو عورتوں کو پردے کی پابندیوں سے آزاد کر رہا ہے اس کا جواب یہ ہونا چاہیئے کہ طریق کار دونوں کا ایک ہے جس صورت سے مرد نصرتِ حق کے لئے میدان میں آتا ہے اسی طرح عورت کو بھی آنا چاہیئے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مردوں کی تعداد اتنی نہ ہو کہ وہ ظالم کی مادی قوت کا مقابلہ کر سکیں اور خصوصاً اس حالت میں کہ جب مرد اپنا کام انجام دے کر گزر چکے ہوں اور اب عورتوں کے سوا کوئی باقی نہ ہو ایسی حالت میں تو مرد و عورت کے درمیان کوئی خطِ فاصل کھینچنا موجودہ خیالات کے لحاظ سے صحیح ہو ہی نہیں سکتا مگر یہ ایک حقیقت ثابتہ اور ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے جو اپنے وقت میں اسلامی اقدار کے تحفظ کے واحد ذمہ دار تھے کربلا کے میدان میں پردہ اور مخصوص نسوانی نظام تمدن کی وہ اہمیت ثابت کی ہے جو اس کے پہلے وہم و خیال میں بھی نہیں تھی۔

آپ دیکھئے تو کہ ایک طرف کم از کم تیس ہزار کا لشکر اور ایک طرف زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو کے قریب مجاہد ہیں جن میں ضعیف العمر بوڑھے بھی اور صغیر السن بچے بھی داخل۔ بوڑھے جہاد بالسیف سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ قاسم کے ایسے نابالغ بچے مستثنیٰ نہیں رہے۔ مگر عورتیں جہاد بالسیف سے اس وقتِ سخت میں بھی مستثنیٰ رکھی گئیں کوئی پرجوش عورت

جیسے اُمّ وہب زوجہ عبداللہ بن عمیر عمود لے کر میدان میں آ گئی تھیں تو امام حسین علیہ السلام نے یہی کہہ کر واپس فرمایا کہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضرت زینب الکبریٰ اور اُمّ کلثوم میں جرأت و شجاعت کا جوہر اُمّ وہب سے کم تھا مگر کوئی ضعیف سے ضعیف روایت ایسا نہیں بتاتی کہ ان میں سے کسی مقدس خاتون نے اس طرح کا اقدام کیا ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ نظام اسلامی جو عورت کے لئے ہے وہ ان کے دل و دماغ میں راسخ تھا۔ یہ ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ زینبؑ و اُم کلثومؑ کا کیا ذکر جو رسولؐ کے گھرانے کی بیٹیاں تھیں اُمّ لیلےٰؑ۔ ربابؑ اور مادر قاسمؑ ایسی خواتین نے بھی جو اس خاندان کے ساتھ صرف بہو ہونے کا رشتہ رکھتی تھیں قدم آگے نہیں بڑھایا، اس لئے ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ معاذاللہ ان کے دل میں نصرتِ اسلام کا ولولہ اور جوش نہ تھا ضرور تھا مگر یہ بھی سمجھتی تھیں کہ ہمارے لئے اسلامی نظام تمدن میں ایسا کرنا روا نہیں ہے۔

بڑے سخت مواقع تھے وہ، جب کوئی کڑیل جوان میدان میں مصروف جہاد ہے، کوئی کمسن بچہ معرکۂ قربانی میں حق وفا ادا کر رہا ہے کوئی جان سے زیادہ عزیز بھائی نرغے میں گھرا ہوا ہے اور اس وقت ماں تڑپنے والی ماں اور دل و جان سے فدا ہونے والی بہن پردہ کی پابندی کے ساتھ خیمہ کے اندر بیٹھی ہوئی ہے مگر واقعہ یہی تھا۔

اور سمجھئے وہ سخت ترین موقع کہ جب تمام عزیز و انصار شہید ہو چکے تھے اکیلے امام نرغۂ اعداء میں گھرے ہوئے زخموں سے چور اور آخر میں بجائے پشتِ فرس کے زمینِ گرم پر افتادہ تھے۔ اور دشمن جو اطراف سے گھیرے ہوئے تھے قتل کرنے کے لئے بڑھ رہے تھے کیا اگر اس وقت خاندان بنی ہاشم کی تمام خواتین تلواریں لے کر فوج دشمن پر ٹوٹ پڑتیں اور امام حسینؑ کو اپنے حلقہ میں لے لیتیں تو یہ حسینؑ آسانی سے قتل ہو جاتا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت کربلا کی تاریخ کس صورت سے لکھی گئی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیوں؟

کیا زینبؑ و ام کلثومؑ کی رگ و پے میں وہی خون گردش نہیں کر رہا تھا جو ابوالفضل العباسؑ بلکہ خود امام حسینؑ کی رگ و پے میں گردش کر رہا تھا کیا حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شجاعت و جرأت میں بیٹیوں کا کچھ بھی حصہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ پھر کیا تھا؟ وہی جان، بھائی اور اولاد سے بڑھ کر زیادہ عزیز اصول اسلام کا لحاظ جو زنجیر بن کر ان درد رسیدہ بے کس بیبیوں کو آخر تک جکڑے رہا۔

سب کچھ ہو گیا، مگر وہ اسی جگہ بیٹھی رہیں جہاں حضرت امام حسینؑ بٹھا گئے تھے اس وقت تک کہ جب تک وہ جگہ یعنی خیمے باقی رہے۔ ہاں جب خیموں میں آگ کے شعلے بلند تھے اور ظالموں کے ہاتھ سروں کی چادروں ہی کو نشانہ ظلم بنائے ہوئے تھے تو ناموس اسلام کی خاطر اپنی عزت و ناموس کی قربانی کے سوال کو عملی طور پر حل کرنے کی ضرورت تھی جس میں ان کے قدم پیچھے نہیں رہے۔ اب اس وقت انھیں بھائی بیٹوں اور عزیزوں کے تمام داغوں سے بڑھ کر داغ جو تھا وہ بے پردگی کا داغ تھا اور جب درد دل کے اظہار کا وقت آیا تو تمام مصائب میں شدت و قوت کے ساتھ اسی مصیبت کا اظہار کیا گیا۔

اس موقع پر جب ثانی زہرا حضرت زینب سلام اللہ علیہا کو دربار یزید میں خطبہ پڑھنے کی ضرورت پیش آئی تو یہ یادگار زمانہ الفاظ تاریخ دنیا میں پردہ کی اہمیت کا ابدی ثبوت بن کر آپ کی زبان پر آ رہے تھے۔

امن العدل یا ابن الطلقاء تخدیرک حرائرک وامائک وسوقک بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سبایا قد هتکت ستورهن وابدیت وجوههن یتصفح وجوههن القریب والبعید والدنی والشریف

(اے یزید) کیا یہی انصاف ہے کہ تو نے اپنی عورتوں اور کنیزوں کو پردہ میں بٹھا رکھا ہے اور دختران رسول خدا کو قید کر کے بے پردہ پھرایا اور ان کے چہروں کو بے نقاب کیا ہے۔ غضب ہے کہ نزدیک اور دور کے لوگ اور پست و بلند ہر طرح کے آدمی ان کے چہروں پر نظر ڈالتے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ثانیؑ زہراؑ حضرت زینب کبریٰ اپنی سب سے

بڑی مصیبت اس بے پردگی کو سمجھتی تھیں اور اسی لئے اسی کا خصوصی طور پر آپ نے تذکرہ فرمایا۔

(ہفت روزہ شیعہ اپریل ۱۹۶۷ء)

اِسلامی نظریۂ حکومت اور حسینؑ ابن علیؑ

حکومت کی ضرورت

سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ نوع انسانی کے لئے حکومت کا وجود ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اگر مطلق العنان آزادی کا تخیل انسان کے لئے صحیح ہے تو یہ خیال کیا جا سکتا کہ حکومت کی مطلق ضرورت ہی نہیں مگر انسان کا آزادیٔ مطلق سے دوچار ہونا غیر ممکن ہے یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اس کا فطری حق ہے۔ بالکل بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہے جب تک اس کے ساتھ یہ قید نہ لگائی جائے کہ "ناجائز قیود سے آزادی"

اگر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے تو اس کے لئے اجتماعی قیود کی پابندیاں ناگزیر ہیں۔ حالانکہ حیوانات میں بھی بعض میں اجتماعی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں مگر انسان کو تو اس سے مفر ہی نہیں۔

ان ہی اجتماعی قیود کا نام "دستور العمل اور قانون ہے" اور اسی کی نافذ کرنے والی طاقت کا نام حکومت ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اگر افراد خود احساس فرض رکھتے ہوں تو ان کے لئے حکومت کی ضرورت نہ ہوگی مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے لئے صرف احساس فرض کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو صحیح نظام کی معرفت بھی ضروری ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ ان سب کا نقطۂ نظر مفاد اجتماعی میں ایک ہی نقطہ تک پہنچے۔ اور کوئی دانستہ یا نادانستہ دوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے اور یہ اسی وقت ہو سکے گا جب وہ پوری جماعت فکر و ارادہ و عمل تمام منزلوں میں یکساں درجہ پر غلطی سے بری یعنی معصوم ہو۔ ایک ایسی جماعت کا ایک جگہ پر فراہم ہونا خیالی

دنیا میں ممکن ہے وجود رکھتا ہو مگر خارجی عالم میں وقوع سے بیگانہ ہے اس لئے اس صورت پر بحث ہی کرنا بے کار ہے یہاں تک کہ عام انسانوں کا تعلق ہے کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا نظام اجتماعی یہاں تک کہ ایک گھر کی آبادی جو معاشرتی زندگی کی سب سے پہلی منزل ہے یہ بھی کچھ حدود و حقوق اور انکی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی اور اس میں بھی ایک طاقت کی ضرورت ہے جو سب کو ان حدود کا پابند بنائے اسے آپ حاکم نہ کہیئے گھر کا بڑا کہہ لیجئے۔

مگر یہی چیز ایک بڑے دائرے میں پہنچ کر حکومت کہلاتی ہے جس کی نوعیت میں چاہے جتنا بھی اختلاف کیا جائے مگر اس کی ضرورت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اقسام حکومت

ارسطو نے حکومت کی تین قسمیں قرار دی ہیں

(۱) ایک شخص کی حکومت۔

(۲) تھوڑے محدود و معین افراد کی حکومت۔

(۳) بہت سے افراد کی حکومت۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت سے اب تک دو ہزار برس گزرنے کے باوجود دنیا طرح طرح کے تمدنی انقلابات اور نظریات کی تبدیلیوں کے باوجود ان تینوں قسموں کے دائرے سے باہر نہیں نکلی ہے مگر جب ہم ان تینوں صورتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی ان میں سے عقلی اصول پر درست ثابت نہیں ہوتی۔

ایک شخص کی حکومت اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص میں آخر امتیاز کون سا ہے کہ وہ حاکم ہو جائے اور باقی سب انسان محکوم ہوں۔ اس کے لئے قدیم زمانہ میں سلاطین کی جانب سے یہ خیال پھیلایا گیا کہ حاکم پیدائشی طور پر دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے یوں سمجھنا چاہیئے کہ جیسے انسان حیوانوں میں ایک نوع ممتاز ہے ویسے سلاطین کا طبقہ انسانوں میں فطری طور پر ایک نوع ممتاز ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے ان انقلابات کو دیکھنے کے بعد جن میں سلاطین معزول ہو گئے ہیں اور کبھی کبھی

آخر میں مقید رہے ہیں بلکہ گداگری پر مجبور ہو گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کا تصور صرف اس تخیل عظمت کی پیداوار ہوتا ہے جو عوام کے دماغ و دل پر ان کی سلطنت کے دور میں مستولی ہوتی ہے۔ اور اسی کے لئے جب وہ تخیل ختم ہو جاتا ہے تو بالکل معمولی انسان معلوم ہونے لگے ہیں اگر ان کا امتیاز کوئی پیدائشی حق ہوتا تو وہ کبھی سلب نہ ہوتا نہ اس میں انقلاب ہوتا جب پھر ہم تاریخ کا تبصرہ مختلف سلاطین پر دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر بہت سے اوصاف میں عام انسانوں سے بھی پست تھے۔ چونکہ مورخ کا قلم اکثر اس تخیل سے خالی ہوتا ہے جو رعایا کے دل میں بادشاہ کی نسبت ہوتا ہے اس لئے وہ صاف لکھ دیتا ہے کہ فلاں بادشاہ احمق تھا یا جاہل تھا یا بے رحم تھا یا خود غرض تھا وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا سبب جو ایک شخص کے اقتدار کے جواز کا بتایا گیا ہے وہ طاقت و اقتدار ہے اسی کو دوسرے لفظوں میں قہر و غلبہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں قہر و غلبہ کا ذریعہ حکومت ہونا تسلیم ہے مگر معیار حقانیت ہونا کسی طرح تسلیم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے حکومت قائم ہو جاتی ہے، بالکل ٹھیک، مگر قائم ہونا چاہیے بھی۔ ایسا نہیں ہے بہت سی باتیں ہو جایا کرتی ہیں مگر ان کا ہو جانا صحت و جواز کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا اور گھر والے بے خبر سو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہے کہ چور آئیں اور سارا مال لے جائیں مگر ان کا یہ مال و اسباب لے جانا جائز بھی ہو یعنی وہ مجرم نہ قرار پائیں۔ ایسا نہیں!

اسی طرح اگر ڈاکو مسلح ہو کر حملہ کریں اور گھر کے رہنے والے یا تو اسلحہ رکھتے نہ ہوں یا تعداد میں کم ہوں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ڈاکو جبر و طاقت سے ان کے مکان یا اسباب پر قبضہ کر لیں گے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مال و اسباب یا جائداد انکی ملک بھی ہو جائے بلکہ دنیا کا ہر قانون ان ڈاکوؤں کو سزا دینے اور ان سے اس مال کے برآمد کرنے کے لئے تیار ہو گا پھر اگر ایک مکان پر قہر و غلبہ ملکیت قائم نہیں کر سکتا تو ایک

ملک یا قوم پر قہر و غلبہ تسلط کو جائز کیونکر قرار دے سکتا ہے؟

پھر اگر طاقت ہی سے کسی فرد نے حکومت قائم کی تو اگر رعایا طاقت حاصل کر کے اس کی مخالفت کرے تو اسے کیونکر جرم سمجھا جا سکتا ہے۔ اب اس کے بعد ایک انسان کے اقتدار اور حکومت کے لئے کوئی دلیل نہیں مل سکتی اسی طرح یہ چند آدمیوں کی حکومت بھی بلا وجہ ہے۔

تیسری قسم یعنی بہت سے آدمیوں کی حکومت۔ اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ یہ بہت سے آدمی تمام قوم کا جزو ہیں یا کل قوم ہیں اگر جزو ہیں تو پھر وہی بات بحث طلب ہے کہ ان بہت سے آدمیوں کو مابقی افراد پر حکومت کا حق کیا ہے اور اگر یہ کل قوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پوری قوم حاکم ہے اور خود ہی محکوم تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفاد حکومت ختم۔ حکومت کی ضرورت تو اس لئے تھی کہ ان افراد میں جو خود غرض، مطلب پرست اور کوتاہ نظر ہیں کوئی طاقت ایسی ہو جو سب کو صحیح قانون کا پابند بنائے۔ لیکن جب قانون سازی خود اس جماعت کا کام ہو گیا تو یہ اپنے مطلب کے مطابق جیسا، جس وقت چاہے گی ویسا قانون بنائے گی چاہے صحیح ہو چاہے غلط اور اس کے نتیجہ میں مختلف جماعتوں اور مختلف جماعتوں کے مختلف افراد میں رسّہ کشی ہوتی رہے گی یعنی ہر ایک چاہے گا کہ اپنے مطلب کی باتوں کو تمام جامعہ کے سر منڈھ دے اور اس کو ہر ایسے موقع پر بدل دینے کی کوشش کرے جبکہ اس کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہو۔

پھر اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ تمام جماعت کسی ایک یا چند افراد کو دستور سازی کے لئے خود مقرر کرے تو جبکہ وہ افراد ان ہی عوام کے منتخب کئے ہوئے ہیں تو ان ہی عوام کی مرضی پر چلنا ضروری ہوگا یعنی انھیں یہ لحاظ نہ ہوگا کہ صحیح و مناسب کیا ہے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ عام افراد چاہتے کیا ہیں اور اگر کبھی بھی انھوں نے رائے عامہ کی مخالفت کی تو دوسری بار کے انتخاب میں ان کے ہاتھ سے اختیارات لے لئے جائیں گے اور دوسروں کے سپرد کئے جائیں گے۔

پھر ایک بحث یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟

دوسرے یعنی انتخابی رائیں مگر یاد رہے کہ عوام اپنے شعور سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بے سوچے سمجھے خواص کے ہاتھ میں ہو جاتے ہیں اور جو خواص چاہتے ہیں وہ ان سے کرا لیتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ جسے سمجھا جاتا ہے اکثریت کا فیصلہ وہ حقیقت میں چند افراد کی رائے ہوتی ہے جسے وہ مختلف صورتوں سے افراد قوم پر مسلط کرتے ہیں اور ان کے احساسات کو بے ہوشی سنگھا دیتے ہیں۔ یہ سمجھا کر کہ یہ آپ کی رائے سے ہو رہا ہے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت میں وہی شخص اکثریت کا قبلۂ عقیدت ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں وہی مخذول و منکوب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اپنے خصوصیات و اوصاف کے اعتبار سے بدلتا نہیں ہے مگر عوام کے رجحانات بدلتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عوام کا رجحان کبھی صحت کا ذمہ دار نہیں ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ جمہوری نظام سے حاصل شدہ اقتدار بھی ایک شخص یا چند اشخاص کو ایک طرح کے قہر و غلبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی غلبہ فولادی ہتھیاروں سے حاصل کیا جائے اور کوئی غلبہ ایسے ہتھیاروں سے جو دماغ کو متاثر کر دیں کوئی شکنجہ ایسا ہو جس سے جسم کے مقید ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی شکنجہ ایسا ہو جو آزادیٔ خیالات کو محصور کر دے نتیجہ دونوں کا ایک ہے اور صحت و حقیقت سے دونوں دور ہیں۔

معاہدۂ عمرانی اور اس پر بحث

ایک نظریہ جسے "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہ تمام قوم کی حکومت تمام قوم پر ہے۔ اس طرح کہ ہر فرد اپنے اختیار سے اپنی ذاتی آزادی اور مطلق العنانی کو قربان کر دے مفاد اجتماعی کی خاطر اس طرح یہ پابندی اس کے لئے بار خاطر نہ ہوگی کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے بخوشی اپنے ہی اجتماعی مفاد کے لئے اختیار کی گئی ہے۔ مگر

اس میں سوال یہ ہے کہ جس طرح ابتداء میں یہ معاہدہ دل کی خوشی سے ہے اور اسی لئے وہ حق آزادی کے خلاف نہیں، اس طرح کیا بعد میں اس معاہدہ پر باقی رہنا امر اختیاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی یا مخالفت جرم نہ ہو جبکہ وہ شخص جس نے معاہدہ کیا تھا خود ہی اس معاہدہ کو شکستہ کر دینا چاہتا ہے اور اگر خلاف ورزی جرم ہے اور اس کے بعد معاہدہ پر برقرار رہنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آزادی افراد کی ہمیشہ کے لئے سلب ہو گئی حالانکہ اس نظریئے کی بنیاد بقائے آزادی پر ہے۔

پھر یہ کہ جب افراد جامعہ خود غرض اور مطلب پرست ہوں تو انھیں اس کا پابند کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل میں اپنے مفاد شخصی کو پیش نظر نہ رکھیں اور صرف مفاد اجتماعی پر نظر ڈالیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ اور بغیر اس کے کوئی قانون بے لاگ مفاد عمومی کا پورے طور پر نگہبان نہیں ہو سکتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دنیا نے جتنی بھی حکومت کی شکلیں تجویز کی ہیں ان میں سے کوئی بھی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

اسلامی حکومتیں

اب اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ پھر آخر اسلام کا نظریۂ حکومت کیا ہے؟ یہاں پر بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریۂ حکومت یعنی مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کا نظام۔ مگر ایسا نہیں ہے یہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کے متعلق بالکل غلط طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ جمہوری اصولوں پر تھیں

ان تمام حکومتوں میں شخصی فرمانروائی تھی جس کا اصول کبھی ایک نہ تھا۔ بلکہ کبھی ایک جلسہ میں حاکم کا انتخاب ہوا اور کبھی سابق حاکم نے اپنے بعد والے کو نامزد کر دیا اور کبھی اس نے ایک کمیٹی مشورہ کے لئے بنا دی اور کبھی ابھر کر صرف اقتدار قائم کرنا رہ گیا جیسا ہوتا گیا۔ ویسے ہی اصول بنتے گئے یعنی اجماع، استخلاف، شوریٰ، قہر و غلبہ، اب مختصر طور پر ان چار اصولوں پر

تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"اجماع" اس سے مراد تمام رقبۂ مملکت کے افراد کا اتفاق ہے یا صرف دارالسلطنت کے کل افراد کا اتفاق یا وہاں کی بھی ایک جماعت کا جو کسی خاص جگہ جمع ہو گئی ہو یا ان میں سے بھی بعض کا جو متفق ہو گئے ہوں؟

اگر کل افراد محدود مملکت مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان تمام افراد کی رائے کا معلوم ہونا اس زمانۂ برق و بخارمیں، زمانہ، سیارہ و طیارہ میں بھی مہینوں کا کام ہے چہ جائیکہ اس زمانہ میں جبکہ یہ وسائل مخابرت نہ تھے اس وقت میں یہ بات برسوں میں بھی حاصل ہونا مشکل تھی چہ جائیکہ اس سے کم یعنی ایک دن کا تھوڑا سا حصہ۔

پھر عقلی طور پر وہ کتنے ہی کثیر افراد ہوں ان میں سے سب کے فیصلہ کا درست ہونا بھی اس پر موقوف ہے کہ اس میں کوئی ایک غیر جائز الخطاء یعنی معصوم مانا جائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو جس کل کا ہر جزو غلطی کی آماجگاہ ہو وہ کل غلطی سے بری کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اور اگر صرف دارالسلطنت کے کل افراد، تو انھیں حق کیا ہے کہ وہ ما بقی اطراف مملکت کے افراد کی آزادی کو سلب کر کے کسی حکومت کو ان پر مسلط کر دیں اس طرح کہ انھیں چوں چرا کا کوئی حق نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دارالسلطنت میں سے بھی کچھ لوگ اور وہ بھی اس شدید کشمکش اور اختلاف کے ساتھ جس میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آئے پھر جبکہ یہ اجماع کسی اعلان کے ساتھ بھی نہ ہوا اور اس کے لئے لوگوں کو سوچنے کا بھی موقعہ بالکل نہ دیا گیا ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ نہ جمہوری سمجھا جا سکتا ہے نہ عقلی طور پر جائز۔

اس کی صحت کے متعلق پیش کی جاتی ہے تو قرآن کی آیت اور پیغمبر کی حدیث یہ ہے کہ وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ اس میں صرف اتنے فقرہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ

"جو شخص مومنین کے راستے کے خلاف اختیار کرے وہ جہنمی ہے"۔ مگر مومنین پر تو الف لام میم استغراق ہے جس کے معنی کل مومنین ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ جتنے بھی مومنین جس جگہ پر جمع ہو کر کوئی فیصلہ کر لیں وہ صحیح ہوگا پھر یہ پوری آیت کا مضمون ہے بھی نہیں۔ پوری آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص رسولؐ سے جھگڑا کرے اور مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کرے یہ جہنم میں جائے گا اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول سے جھگڑا کرنا خود مومنین کے خلاف ہے اور تقاضائے ایمان کے منافی ہے۔ اس سے تو نتیجہ اور خلاف نکلتا ہے یعنی یہ کہ پیغمبر کے مقابلہ میں اُمت کو رائے زنی کا حق نہیں ہے۔ (حدیث) لا تجتمع اُمتی علیٰ ضلال (یا) علیٰ خطاءٍ۔ یعنی پیغمبرؐ کا ارشاد ہے کہ میری اُمت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی یا غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ حدیث سند کے اعتبار سے بالکل درست ہو تب بھی اس میں تمام اُمت کے اجتماع کا ذکر ہے۔

چند افراد کا جمع ہونا اس میں ہرگز مذکور نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اجماع جس معنی سے معیار حکومت قرار دیا گیا ہے اس کی صحت پر کوئی دلیل عقلی یا نقلی نہیں ہے۔

رہ گیا استخلاف، تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد ہے اس حکمراں حق حکومت پر جو دنیا سے جا رہا ہے اور جبکہ اسی کی حکومت کے جواز کا کوئی ثبوت نہیں تو استخلاف کا کیا حق اس سے قائم ہوگا۔ اس کے بعد

شوریٰ وہ ساختہ و پرداختہ اس حاکم کا ہے جو باستخلاف معین ہوا تھا اور جس کا خود حاکم ہونا ایک ایسے حاکم کے نامزدگی سے تھا جس کی حکومت خود اپنے محل پر ثابت نہیں ہے۔ چوتھی چیز

قہر و غلبہ یہ وہی طاقت حق والا نظریہ ہے جسکو پہلے غلط ثابت کیا جا چکا ہے پھر اگر قہر و غلبہ ہی معیار حکومت ہے تو اس میں اسلام کی بھی شرط بلا ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں تمام غیر اسلامی حکومتیں شرعی اور جائز حکومتیں

ہیں اس لئے کہ ان میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی تنہا غلبہ و اقتدار کو درجہ سلطنت نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے کافر سے اتنا شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا دشمنہ زیر آستین یہاں کئے ہوئے کافر یعنی منافق سے :-

اسلام کا نظریۂ حکومت

اب دوبارہ پھر یہ بحث آتی ہے کہ خود اسلام کا نظریہ حکومت کیا ہے ؟ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حکومت کے دو کام ہیں ایک دستور و قانون کی تشکیل ، دوسرے طاقت و اقتدار کے ساتھ اس نظام کا اجراء و نفاذ "

اب پہلے قانون کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے اگر " اسلام " نام ہوتا صرف کچھ عقائد کا جو دماغ میں جگہ پالیں اور انھیں عمل سے تعلق نہ ہو یا کم از کم عمل سے تعلق ہوتا بھی تو صرف انفرادی زندگی میں اسے اجتماعیات سے بحث نہ ہوتی تو بے شک یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو قانون کی تشکیل خود کرنے کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے ملک کے قانون کی وہ پیروی کر لیں لیکن اسلام تو خود ایک دستور حیات پیش کرتا ہے جس میں صرف عقائد نہیں بلکہ زندگی کے لئے عملی قواعد و ضوابط ہیں اور وہ بھی صرف انفرادی زندگی سے متعلق نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں ۔ ایک مسلمان اسلام کو قبول کر لینے کے ساتھ ہی ساتھ یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اپنی انفرادی اور اجتماعی حیات میں اس ضابطہ و قانون کا پابند ہوں اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ عملی طور پر مسلم رہتے ہوئے پھر خود قانون سازی کرے یا کسی دوسرے شخص کے لئے قانون سازی کا قائل ہو یا پوری قوم مجتمع طور پر قانون سازی کے کام میں شریک ہو یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا جبکہ وہ مسلم ہے اور اسلام کے ساتھ ہی وہ اپنے کو قانون اسلام کے سپرد کر چکا ہے ۔

موجودہ زمانے کے بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز کو اس جماعت سے خارج ہونا چاہیئے جس کے لئے قانون بن رہا ہے تاکہ وہ

قانون زیادہ سے زیادہ بے لوث اور غیر جانبدار ہو سکے اس لئے زیادہ مناسب طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک کے لئے قانون دوسرے ملک کے مدبرین سے بنوایا جائے مگر یہ تو اس وقت صحیح ہے جبکہ قانون کا دائرہ شروع ہی سے ملک یا اقلیم کے لئے ہو لیکن اگر قانون ملکوں اور قوموں کی تفریق سے بالاتر ہو یعنی تمام نوع انسانی کے لئے ہو تو پھر مذکورہ اصول کے مطابق اس کے سوا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ قانون ساز نوع انسانی کی جماعت سے خارج ایک بلند ذات ہو یعنی خالق عالم جس کا علم و قدرت سب کو محیط ہے۔ اور یہی اسلام کا نظریۂ حکومت ہے۔

یہاں قانون ساز بھی اللہ ہے اور حاکم بھی صرف اللہ ہے ایک مسلم اسلام کے ساتھ ہی اس کی اور صرف اس کی بادشاہت کو مان لیتا ہے جس کے بعد کسی فرد، کسی مجلس یا کسی قوم کا حکومت کرنا اللہ کے حق کا غصب کرنا ہے اور اس کے بعد ارسطو کی تینوں قسمیں حکومت کی ختم ہو جاتی ہیں۔ جب ایک حاکم حقیقی موجود ہے اور وہ اللہ ہے تو ایک فرد کی بھی حکومت غلط، چند آدمیوں کی بھی حکومت غلط اور بہت سوں کی بھی حکومت غلط۔ اس کا نتیجہ ہے آزادیٔ کامل یعنی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں رہتا یا یوں کہو کہ کسی ایسی طاقت کا محکوم نہیں رہتا جس کا دائرہ فطرت کے قیود سے باہر ہے، رہ گیا خالق، اس کی اطاعت فطری طور پر بہر حال کرنا ہی ہے۔ اگر ارادی افعال میں بخوشی نہ کرے گا تو اضطراری اور فطری افعال میں بجبر کرے ہی گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا لہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا مگر انسان کا شرف انسانی اس کا مقتضی ہے کہ وہ اس اطاعت کو اختیار کرے تاکہ اس کی حق شناسی کا ثبوت ملے۔ بیشک چونکہ اس کے قانون کے معلوم کرنے کے لئے ہم الفاظ کے محتاج ہیں اور خالق کی ذات ایسی نہیں کہ وہ ہم تک پہنچ کر ہم سے بات کرے۔ اس لئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے۔ یہ رسول ہے مگر اس کا کام احکام الٰہی کا پہنچانا ہے۔

نہ اس کا ذاتی کوئی حکم ہے نہ اس کی ذاتی اطاعت ہے بلکہ جو اس کی زبان

برتتے ہیں وہ احکام الٰہی ہیں۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ) اور جو اسکی اطاعت ہے وہ حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے (وَمَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ) اب جبکہ حکومت اللہ کی ہے تو ہر دور میں اپنے نائب مقرر کرنا اسی کا کام ہے اور اس اختیار کو کسی وقت میں بھی اپنے ہاتھ میں لینا اللہ کے حق حکومت میں مزاحمت کرنا ہے جو ایک مسلم کے شایان شان نہیں ہے۔

قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ کسی مومن یا مومنہ کو اللہ اور رسول کے فیصلہ کے سامنے اپنے معاملات کے بارے میں کوئی اختیار نہیں رہتا۔"

دوسری جگہ زیادہ واضح کلیہ کی شکل میں اعلان کیا ہے کہ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ " پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے انھیں انتخاب کا حق نہیں ہے۔"

اس کے علاوہ سنت الٰہیہ جو قرآن مجید کے تتبع سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف کا خود حکمراں اپنے لئے اس کام میں مددگار بھی خود اپنی طرف سے مقرر نہیں کرتا بلکہ اللہ سے دعا کرتا ہے (أَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي) اور محمود مقصد یعنی دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک سردار بھی جو نبی یا رسول نہیں بلکہ "ملک " کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی قوم خود نہ مقرر کر سکی بلکہ نبی سے خواہش کی اِبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور نبی نے بھی خود مقرر نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ،، اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے " پھر قوم نے اس کے استحقاق پر اعتراض کیا وہ اعتراض اور قوم کا حق مداخلت بھی قبول نہ کیا گیا۔ بلکہ اس ذیل میں ایک کلیہ کا اعلان کر دیا گیا کہ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ اللہ اپنے ملک کو جسے چاہتا ہے دیتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اللہ حاکم حقیقی ہے تو اللہ ہی نائب کو مقرر کر سکتا ہے اور یہی نائب انسانی جماعت میں ہمارا اصلی

رہنما بن سکتا ہے

مسلمانوں نے اس حاکم کے انتخاب کے حق کو اللہ سے سلب کر کے اپنے ذمے کر کے بڑا نقصان اٹھایا۔ بایں معنی کہ اگر یہ اصول معتبر رہتا تو پھر من و تو کا سوال پیدا ہو کر انتشار نہ پیدا کرتا۔ دیکھ لیجئے کہ رسول اللہ کو اللہ کی طرف سے مان لیا گیا پھر ایسا تو نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں دو رسول ہو جاتے قبلہ کو اللہ کی طرف سے مان لیا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قبلے ہو جاتے اور کتاب کو اللہ کی جانب سے مانا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قرآن ہو جاتے۔ اختلاف بس اسی وقت سے پیدا ہوا جب سے حاکم کے انتخاب کو اللہ کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا بس اس کے بعد سے جو مسلمانوں کے شیرازہ میں انتشار پیدا ہوا تو آج تک باقی ہے۔

پیغمبر کا اعلان و عمل اس بارے میں سند ہے کہ حاکم کے تقرر میں رعایا کا دخل نہیں۔ ایک عرب سردار نے جب اپنے اسلام لانے کی شرط یہ قرار دی کہ اپنے بعد حکومت میں میرا حصہ قرار دے دیجئے تو حضرتؐ نے جواب میں صاف فرما دیا کہ اس کا مجھے اختیار نہیں یہ تو اللہ سے متعلق ہے۔ اب جو حضرتؐ نے بیعت عشیرہ میں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے بارے میں اعلان کیا کہ یہ میرا وزیر، وصی اور خلیفہ ہے تو بحیثیت مسلمان یہ ماننا لازم ہے کہ یہ حضرتؐ کا اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر اعلان نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے اعلان ہے اور اس اعلان سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ خود قوم کے اختیار سے متعلق نہیں ہے ورنہ رسول اس کو اپنے ذمہ نہ لیتے۔ اسی بنا پر غدیر کے خطبے میں پیغمبرؐ نے ولایت علیؑ کے اعلان کے قبل پہلے مسلمانوں سے اصول تسلیم کرا لیا۔ اس استفہام کے ساتھ کہ اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ قَالُوْا بَلٰی کیا میں تم سب سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا ہوں؟ سب نے کہا بے شک آپ زیادہ اختیار رکھتے ہیں۔ اب اس کو تسلیم کرنے کے بعد تو مسلمان کو اپنے خود مختاری کے حق کا حکومت کے بارے میں دعویٰ کبھی صحیح قرار ہی نہیں پا سکتا اور اسی لئے رسولؐ کی زندگی میں صدا کسی دہن سے بھی نکلتے سنائی

نہیں دیتی کہ حکومت ،، ہمارا حق ہے۔ یا حاکم مقرر کرنا ہمارا کام ہے
ہاں رسولؐ جب دُنیا سے اُٹھ گئے تو اب اجماع اور شوریٰ ۔۔ اور قہر و غلبہ کا
نام سُنائی دینے لگا۔ مگر یہ مسلمان کے خود ساختہ اصول ہیں ان کا اسلام
سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

۶۰ھ تک حکومت کے یہ اصول جمہور مسلمین میں تسلیم کیے جاتے
رہے اور عام نظریہ یہی قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب ان تین طریقوں میں
سے کسی ایک سے حاکم کا تعین ہو جائے تو کسی کو مخالفت کا حق نہیں اور اگر
کوئی مخالفت کرے اور حاکم اس کے خلاف تادیبی مہم جاری کرے تو حاکم
کا فعل درست اور جو شخص اس کے خلاف ہو وہ مجرم! اور اگر اس سلسلہ
میں قتل ہو جائے تو گمراہی کے ساتھ ہلاک شدہ سمجھا جائے گا! شہید
اسے نہیں کہا جا سکتا۔

یہی اب تک عملدرآمد رہا تھا جس کے شواہد تاریخ میں بہت ہیں۔ امیر شام
معاویہؓ نے اپنے فرزند یزید کے لئے نہ صرف ان طریقوں میں سے کوئی ایک بلکہ ان تمام
طریقوں کو جمع کر دیا انھوں نے شام اور عراق کے علاوہ مکہ اور مدینہ میں خود جا کر
جلسے کئے اور یزید کی بیعت لی اس طرح جتنا بڑا اجماع یزید کی خلافت پر ہوا ایسا
اس کے پہلے کسی خلیفہ پر بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ استخلاف بھی تھا
اور قہر و غلبہ بھی اس کا نتیجہ صاف ہے کہ کسی شخص کو مخالفت کا حق نہ ہونا
چاہیئے۔ اور مخالفت کرے تو بادشاہ کو اس کے خلاف ہر کارروائی کا حق ہے
اور اگر وہ قتل ہو جائے تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں۔

مگر حسینؑ ابن علیؑ کا یہ کارنامہ تھا آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بادشاہ
کے مقابلہ کے لئے اور پھر اپنے ساتھ بے گناہی اور مظلومیت کی طاقت کو ایسا
زبردست بنا دیا کہ دُنیا حسینؑ کو مظلوم اور یزید کو ظالم ماننے پر مجبور ہو گئی۔
حسینؑ اور ان کے ساتھی سب شہید تسلیم کئے گئے اور یزید ہمیشہ کے لئے
مردود اور ملعون قرار دیا گیا اس طرح حسینؑ نے اس نظریۂ حکومت کا تختہ الٹ
دیا جو اسلامی نظریہ کے خلاف مسلمانوں میں غلط طور پر مان لیا گیا تھا۔

حکمرانوں کا نظریہ حکومت مادی اسباب یعنی عوام کے اتفاق رائے انتخاب یا حصول "تاج و تخت" کا محتاج ہے مگر اسلامی نظریہ حکومت ان اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ تمام دنیا انکار کر رہی ہو، مخالفت پر کمربستہ ہو بلکہ قتل پر تیار ہو گوشہ نشینی و کس مپرسی ہو، پیوند دار لباس اور فرش حصیر ہو لیکن وہ اسلامی قانون کا سب سے بڑا واقف کار اور سب سے بڑا عمل پیرا اور اس کے محافظ ہونے کا اہل ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر مقرر ہوا ہے تو وہ الٰہی حاکم ہے اور دنیا پر اس کی اطاعت فرض ہے اور جو حکومت الٰہیہ کے ماننے والے ہیں وہ اسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے رہیں گے یاد رکھنا چاہیے کہ حکومت الٰہیہ کا ایک پیرو کبھی کسی طاقت کا محکوم نہیں ہو سکتا یعنی اگر حالات کی نامساعدت سے وہ کسی دوسرے نظام اقتدار کے شکنجہ میں اسیر بھی ہوگا تو ہمیشہ اس پر نظر رکھے گا کہ اللہ کا حکم اس کی نسبت کیا ہے اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں حفاظت جان و مال یا کسی بلند مقصد کے تحفظ کی خاطر حکم الٰہی یہی ہے کہ ہمیں خاموشی کے ساتھ قانون سلطنت پر عمل کرنا چاہیے تو وہ عمل کرے گا جسے دنیا سمجھے کہ وہ حکومت وقت کے احکام کی اطاعت ہے مگر حقیقت میں اپنے حاکم اصلی اللہ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے نتیجہ اس کا حاکم وقت کے قانون کی پیروی کے مطابق ہو گیا ہے لیکن اگر وہ اپنے حاکم اللہ کا یہ منشا دیکھ لے گا کہ ان حالات میں پیروی جائز نہیں ہے تو وہ جان دینا گوارہ کرے گا گھر کا برباد ہونا قبول کرے گا مگر جہاد کے لئے کھڑا ہو جائے گا۔

حکومت الٰہیہ کے قیام کی دشواری یہ تو حکومت الٰہیہ کی اصل حقیقت ہے جو ہر انسان کی انفرادی زندگی میں بھی کارفرما ہے لیکن جہانتک

اس کے ظاہری اقتدار کا تعلق ہے اور وہ افراد صالحہ کے وجود پر موقوف ہے اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوئے تو وہ نائب حکومت موجود ہوگا جیسے خصوصیت کے ساتھ بذریعہ پیغمبر نامزد کیا گیا اور پھر بھی دنیا اس کی حکومت کو تسلیم نہ کرے گی اور اسے گوشہ نشین ہوجانا پڑے گا اور یہ سلسلہ ۲۶۰ برس تک جاری رہے گا جو اس کے تجربہ کے لئے کافی ہے کہ افراد صالحہ کا فقدان حکومت الٰہیہ کے ظاہری طور پر برسراقتدار آنے میں مانع ہے لہٰذا اگر اس کے بعد نائب خاص ہماری نگاہ سے اوجھل ہوجائے تو اس کا سبب افراد کی عدم صلاحیت ہی قرار پائے گی۔ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جب حکمراں غائب ہے تو حکومت کیسے قائم ہو یقیناً اگر اس وقت افراد صالحہ پیدا ہوجائیں تو حاکم حقیقی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ہمارے نائب کو ہمارے سامنے ظاہر کردے۔

حضرات امام حسین علیہ السلام نے یزید ملعون سے جو حق و باطل کی فیصلہ کن جنگ کی تھی اس کا مقصد یہی تھا کہ آپ صحیح اسلامی نظریات کو (جو حقیقت میں معقول ترین نظریات ہیں) دنیا کے سامنے اتنے واضح انداز میں پیش کردینا چاہتے تھے کہ پھر قیامت تک تمام سلامت روی سے غور و فکر کرنے والے ہمیشہ ان نظریات کو اپنا سکیں اور جب کبھی باطل کے دھندلکے ان صحیح اسلامی نظریات کو دھندلانے کی کوشش کریں تو حسینی مظلوم اور ان کے مقدس ساتھیوں کے خون کی شعاعیں ان نظریات کو روشن ترین حیثیت سے اجاگر کرکے انسانیت کو بے عقلی اور ناسمجھی کے عذاب سے بچالیں۔

یزید ملعون بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اور (طرفہ ستم یہ کہ) خلافت رسول اللہ کا دعویدار بن کر اسلامی اصول و عقائد کو اپنے گھناؤنے کردار سے جھٹلا بھی رہا تھا اور سیدھے سادے مسلمانوں کے لئے خطرناک ترین قسم کے اشتباہات بھی پیدا کررہا تھا اس نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس نے چاہا کہ امام حسین علیہ السلام سے (جو خود امام معصوم اور نائب برحق

رسولؐ تھے) اپنی سیاہ کاریوں اور بے حیائیوں کی تصدیق کرالے اور حسین بن علیؑ کو اپنی بیعت میں داخل کر کے اسلام حقیقی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کے گھاٹ اتار دے لیکن یزید نہ سمجھتا تھا وہ عقل سے کام لینا نہیں چاہتا تھا نہ اس نے اسلام کے زریں اصول و عقائد پر کبھی غور کیا تھا۔

اور نہ وہ حسین ابن علیؑ کی شخصیت کو ہی سمجھ سکا تھا۔ اس کا جاہلانہ خیال یہ تھا (معاذ اللہ) حسینؑ اس کی طاقت کے آگے سرنگوں ہو جائیں گے لیکن حسینؑ جو تمام دنیائے انسانیت کے لئے رشد و ہدایات کا ذریعہ تھے اور جو تمام عالم کے لئے علم و عقل کی شاہراہ قائم کرنے والے تھے وہ ایک ایسے موقع کے منتظر تھے کہ جادہ علم و عقل اور شاہراہ دیانت و شرافت کو ایک بار اس شان سے روشن کر دیا جائے کہ پھر کبھی جہالت و ضلالت کے اندھیرے اسے چھپا نہ سکیں۔ یزید کو اپنی جہالت پر گھمنڈ تھا لہٰذا اس نے عقل کے اندھوں کو تیر فخر انسانیت حسینؑ ابن علیؑ کے خلاف بھیج دیا لیکن حسینؑ کی نگاہ امامت نے اس وقت کی انسانی دنیا کا منظر کھینچ لیا اور ایسے لوگوں کو اپنی رفاقت کے لئے منتخب کیا جن سے بہتر انسانیت کے نمونے ممکن نہیں تھے یزید اپنی جہالت اور بے وقوفی میں یہ سمجھا کہ اس کی جیت ہو گئی لیکن خود اس کے محل کے در و دیوار سے اس پر لعنتیں برسنے لگیں اور ادھر حسینؑ کا خون اور سر مبارک یہودیوں اور نصرانیوں سے بھی اسلام کا کلمہ پڑھوا رہا تھا۔

امام حسین علیہ السلام نے نہ صرف یزید کی باطل پرستی اور اسلام دشمنی کو ثابت کر دیا بلکہ اس تمام غلط ماحول کے پردے چاک کر دیا جس نے یزید جیسے شراب خوار نابکار کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ اپنے کو امیر المومنین اور خلیفہ رسولؐ کے مقدس القاب سے ملقب کر کے دنیا کو اسلام کے نام پر دھوکہ دے رہا تھا۔ حسینؑ کی جنگ درحقیقت یزید کے خلاف نہ تھی بلکہ اس بے قاعدگی و بے عنوانی کے خلاف تھی جس کی وجہ سے اسلامی قیادت یزید جیسی گھناؤنی شکل میں نمودار ہو رہی تھی۔

اس مقصد عظیم کے لئے حسینؑ مظلوم کو بڑی بڑی قربانیاں دینی

پڑیں۔ یہ قربانیاں امام کو ان کے مقصد میں کامیاب بنا گئیں اور حقیقت کے چہرے سے قیامت تک کے لئے باطل کے پردے چاک ہو گئے۔
جناب خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے اسی امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ؎

شاہ ہست حسینؑ بادشاہ ہست حسینؑ
دیں ہست حسینؑ دیں پناہ ہست حسینؑ
سر داد، نہ داد، دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لاالہ ہست حسینؑ

(بحوالہ "تجلیات فکر"، محرم ۱۳۷۵ھ
انجمن پنجتنی آگرہ)





محاربۂ کربلا

پہلا باب

جنگ کا آغاز

"گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے ہی لگایا ہے" یہ الفاظ سپہ سالار لشکر کی زبان پر جاری ہوتے ہوئے تیر رہا کیا جائے اور پھر تمام فوج میں سکون رہے!

یقیناً ہزاروں کمانیں کڑکیں، ہزاروں چلّے کھینچے اور ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔ سچ کہتا ہوں کہ تیروں کا حملہ بہادری کی نشانی نہیں ہے موجودہ زمانہ کی جنگ جو آتشیں اسلحہ کی بنیاد پر ہے جس طرح بزدلانہ حیثیت رکھتی ہے ایسے ہی سابق زمانہ میں تیروں کی بارش، کیا شرم کی بات نہیں، ایک ایسی قلیل تعداد جو کئی سو تک بھی پہنچی ہوئی ہو، اس پر حملہ ہو، اس بڑی فوج کی طرف سے جو تیس ہزار سے کم ہرگز نہ ہو اور پھر تیروں کے بے پناہ باراں سے ابتدا کی جائے۔

میں نہیں سمجھتا کہ حسینؑ بن علیؑ کی قلیل فوج اس اچانک حملہ کے مقابلہ کے لئے کس حد تک آمادہ تھی۔!

مگر نہیں انھیں آمادگی کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کے تنے ہوئے سینے تیروں کے استقبال کے لئے موجود تھے اور ان کے دل و جگر شہادت کے اشتیاق میں ناوکوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے پر تیار!

یزیدی لشکریوں کو اندازہ تھا اور یقینی حیثیت سے اندازہ کہ اگر حسینی لشکر سے وہ کتنا ہی مختصر سہی دست بدست مقابلہ کیا جائے تو کربلا کی تاریخ صرف عاشورہ کے دن پر ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دیر ہونا اُن کے مقصد کے لئے انتہائی اندیشہ کا باعث ہے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ امام کے خطوط بصرہ بھی گئے ہوئے ہیں اور وہاں سے مدد پہنچنے کی توقع ہے۔ کوفہ کے بھی بہت سے لوگ جو مسلم کے مددگار تھے فضا کے بدل جانے اور حکومت کے ظلم و استبداد قائم ہو جانے کی وجہ سے اگرچہ گوشوں میں چھپ گئے ہیں مگر موقع کے منتظر ہیں اور نصرت حسینؑ کے لئے بے چین ہیں یہ بھی خطرہ کچھ دور نہیں تھا کہ ایران نزدیک ہے اور وہاں کے لوگوں کو حضرت امام حسینؑ کے ساتھ عقیدت کا ہونا ممکن ہے خصوصاً جب کہ آپ کے ساتھ زین العابدین بھی موجود ہیں جو ننھیالی رشتہ سے ایرانی ملک کے شاہزادہ ہیں اور اس لئے بہت امکان ہے کہ قومی تعصب بھی ایرانیوں کو ان کی حمایت پر بھی آمادہ کردے۔ یہ بھی خیال ہو سکتا تھا کہ نجد کے پہاڑ (اجاؔ و سلمیٰ) بہت زیادہ فاصلہ پر نہیں ہیں۔ جہاں کا "طے" ایک پُرطاقت قبیلہ ہے اور طرماح بن عدی امام حسینؑ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ اگر آپ وہاں پہنچ جائیں تو آپ کی مدد کے لئے ہزاروں جوان قبیلۂ طے کے ابھی زرہ پوش ہو سکتے ہیں۔"

ان ہی اسباب سے جلدی تھی اور بہت جلدی۔ معلوم ہوتا تھا کہ مقابل میں فوج ہے وہ بہت بڑی فوج۔ جنگ ہوگی اور مکمل جنگ، تیر اندازی اور ہزاروں تیروں کی بارش۔

ماضی اور پھر تیرہ سو برس گزشتہ کے ماضی میں واقعات کے سمجھنے اور ان کے ترتیب دینے میں اگر غلطی ہو تو کچھ قابل تعجب نہیں ہے۔

علامہ مجلسی ایسے وسیع النظر انسان کو اس مقام پر دھوکا ہوا ہے

اور بہت سخت دھوکہ کہ انھوں نے لکھا ہے۔

فلما رموھم ھذہ الرمیۃ قتل اصحاب الحسینؑ وقتل فی ھذہ الحملۃ خمسون رجلا۔

جب یہ تیروں کی بارش ہوئی تو اصحاب حضرت سید الشہداء کی تعداد بہت گھٹ گئی اور اس حملہ میں پچاس آدمی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں "حملۂ اولیٰ" (پہلے حملہ) کے نام سے ایک خونریز حملہ کا تذکرہ ہے جس میں اصحاب حضرت امام حسینؑ میں سے پچاس آدمی شہید ہوئے تھے۔ مجلسی یا اُن کے پہلے محمد بن ابی طالب کو جن سے مجلسی نے یہ مضمون نقل کیا ہے۔ یہ شبہ ہوا کہ "حملہ اولیٰ" سے مراد یہی تیروں کا حملہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ "حملہ اولیٰ" سے مراد وہ حملہ ہے جو ظہر سے ایک گھنٹہ پہلے ہوا تھا جس میں بہت بڑی مخالف فوج نے بہت قریب اکبر حسینیؑ لشکر کی مختصر جماعت پر حملہ کیا تھا۔ جس کا تذکرہ اس کے بعد آئے گا۔

تیروں کی اس ابتدائی بارش کا کوئی خاص اثر فوج حسینی پر سوائے اس کے نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ اُن کے لئے پیغام جنگ ثابت ہوا۔ امام حجّت پورے طور سے تمام کر چکے تھے اور اب یہی ایک حجّت باقی تھی کہ ابتدا جنگ کی دشمن کی طرف سے ہو جائے۔ چنانچہ وہ بھی ہو گئی۔ کوئی ہراس نہیں۔ کوئی اضطراب نہیں امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا قوموا رحمکم اللّٰہ الی الموت الّذی لا بدّ منہ فان ھذہ السھام رسل القوم الیکم کھڑے ہو جاؤ خدا رحمت نازل کرے تم پر۔ موت کے استقبال کو جو بہرحال ضروری ہے، یہ تیر نہیں ہیں بلکہ قاصد ہیں دشمن کے جو تمھاری طرف روانہ کئے گئے ہیں۔"

اصحاب حسینؑ بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ اور انھوں نے بھی تیروں کا جواب تیروں کے ساتھ دیا۔

پھر اتو انھوں نے تیروں کی بارش کردی۔ اس سے چند آدمی ان میں سے قتل ہوگئے اور چند زخمی ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ کربلا میں سید الشہدا اور ان کے اصحاب نے فن سپہ گری کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اتنی چھوٹی فوج اور اتنی بڑی فوج سے برسرپیکار ہو اور اس میں اتنا طویل وقت صرف ہو

حر بن یزید ریاحی نے جو فوج حسینی کی طرف منتقل ہو ہی چکے تھے خدمت امام میں آکر عرض کیا۔

یا ابن رسول اللہ کنت اول خارج علیک فاذن لی لاکون اول قتیل بین یدیک واول من یصافح جدک غدا	فرزند رسولؐ میں سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا لہذا آپ مجھے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے آپ کے سامنے قتل ہوں اور آپ کے جد بزرگوار سے جا کر سب سے پہلے دست بوسی کروں۔

بہت سے لوگوں نے ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شہدائے کربلا میں سب سے پہلے درجۂ شہادت پر فائز ہونے والے "حر" ہیں۔

سید ابن طاؤس نے لہوف میں ان الفاظ کی تاویل کی ہے کہ

انما اراد اول قتیل من الان لان جماعۃ قتلوا قبلہ کما ورد	سب سے پہلے قتل ہونے سے یہ مراد تھی کہ اب اس وقت سے وہ سب سے پہلے قتل ہونے والے ہوں کیونکہ ان کے پہلے بہت سے لوگ قتل ہو چکے تھے جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے۔

لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ حر کے مذکورۂ بالا الفاظ اس تاویل سے کوئی تعلق

نہیں رکھتے علامہ مجلسی فرماتے ہیں۔

المعنی یکون اول قتیل من المبارزین والا فان جماعة کانوا قد قتلوا فی الحملة الاولیٰ۔

معنی ان الفاظ کے یہ ہیں کہ وہ سب سے پہلے قتل ہونے والے ہوں مبارز طلبی کی صورت سے لڑنے والوں میں درحقیقت بہت سے لوگ ان کے پہلے قتل ہو چکے تھے پہلے حملہ میں۔

اس میں یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حُر کے الفاظ میں "مبارزین" کی بالکل قید نہیں ہے۔ بلکہ ان کا یہ کہنا کہ "سب سے پہلے آپ کے جد بزرگوار سے جاکر مصافحہ کروں" صاف بتلاتا ہے کہ اس کے پہلے کوئی شخص شہید نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت رسول اکرم کی خدمت میں حاضری کے لئے یہ شرط نہیں تھی کہ بطور مبارز طلبی شہید ہوا بلکہ جنگ مغلوبہ یا تیروں کے حملہ میں شہید ہونے والے بھی حضرت کی خدمت میں شرف یابی کے مستحق ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مجلسیؒ کا یہ قول اسی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ "حملۂ اولیٰ" جس میں پچاس آدمی شہید ہوئے وہ جنگ کی آغاز والی تیراندازی ہی کا نام ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

حقیقتاً حُر کے الفاظ بالکل حقیقت پر محمول ہیں۔ حُر کی اس اجازت جہاد کے پہلے ہرگز کوئی شخص شہید نہیں ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حُر ہی شہدائے کربلا میں سب سے پہلے فرد ہیں۔

حُر نے جنگ کی اجازت اسی خیال سے مانگی کہ وہ جائیں گے اور لڑیں گے اور شہید ہوں گے تو اس صورت میں اوّل شہید قرار پائیں گے۔ اور انھیں اجازت جہاد کی ملی بھی اور انھوں نے حملہ بھی کیا لیکن اس حملہ میں وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ صرف اُن کا گھوڑا زخمی ہوا اور وہ شہید اس کے بعد چند دوسرے اصحاب کی

شہادت کے بعد ہوئے ہیں جس کا تذکرہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آئے گا۔

حرؑ کو امام نے اجازت دی اور وہ میدان جنگ میں آئے۔ یہ اشعار رجز میں پڑھنے لگے۔

انی انا الحرّ ومأوی الضیف　　اضرب فی اعناقکم بالسیف

عن خیر من حل بارض الخیف　　اضربکم ولا اری من حیف

"میں "حر" ہوں اور مہمانوں کو پناہ دینے والا ہوں۔ تمہاری گردنوں پر تلوار چلاؤں گا اس امام کی جانب سے جو سرزمین مکہ کا سب سے بہتر رہنے والا ہے میں تم کو تلواریں لگاؤں گا اور اس کو ذرا بھی ظلم و تعدی نہ سمجھوں گا۔"

اس کے بعد حملہ کیا اور شمشیر زنی شروع کر دی۔ اس کے پہلے اسی وقت جب حرؑ لشکر عمر سعد سے جدا ہو کر امام سے جا کر ملے ہیں تو یزیدی فوج کے ایک سپاہی یزید بن سفیان تمیمی نے کہا تھا کہ میں حرؑ کو دیکھ لیتا اس وقت جب وہ لشکر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک نیزہ میں اس کا کام تمام کرتا۔ اب جو حرؑ نے حملہ کیا اور چاروں طرف تلواریں چلانا شروع کیں لوگ سامنے سے ہٹ رہے تھے اور دور دور سے وار کرتے تھے۔ حرؑ کی زبان پر عنترہ شاعر کا یہ شعر تھا۔

مازلت ارمیھم بثغرۃ نحرہ　　ولبانہ حتی تسربل بالدم

"میں برابر ان کے اوپر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اس کے سینہ کو یہاں تک کہ اس نے سر سے پاؤں تک خون کی چادر اوڑھ لی۔"

حرؑ کا گھوڑا زخمی ہو گیا اور اس کے سر و چہرہ پر تلواریں پڑی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا اس وقت حصین بن تمیم مشہور یزیدی افسر نے یزید بن سفیان سے کہا کہ دیکھو حرؑ یہی ہے تو جس کو قتل کرنے کی تم کو آرزو تھی۔!

یہ سن کر یزید کو جوش آ گیا۔ نکلا اور حرؑ کو آواز دی کہ کیا مجھ سے لڑنا منظور ہے؟ حرؑ نے کہا ہاں ضرور یہ کہہ کر سامنے آ گئے۔ خود حصین کا قول بیان کیا گیا ہے کہ بس یہ معلوم ہوا جیسے یزید کی جان حرؑ کے قبضہ میں ہی تھی۔ ادھر سامنے پہنچا

اور بس قتل ہو گیا۔

اس منظر کی ہیبت تھی کہ دشمن کا برا حال ہو گیا اور پھر حرؓ کے مقابلہ کو کوئی نہیں نکلا۔ حرؓ اپنے گھوڑے کو جو زخمی ہو چکا تھا موڑ کر اپنے مرکز کی جانب واپس آ گئے۔

نافع بن ہلال نے آگے بڑھ کر لڑائی کا آغاز کیا اور وہ یہ کہہ رہے تھے کہ انا الجملی انا علی دین علی۔

"میں قبیلہ بنی جمل میں سے ہوں میں علیؑ کے دین پر ہوں۔" ان کے مقابلہ میں ایک شخص آیا جس کا نام تھا مزاحم بن حریث۔ نافع نے حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔

ان پیہم نقصانات سے جو فوج مخالف کو برابر ہو رہے تھے سرداران فوج پریشان ہو گئے عمر بن الحجاج جو اس کے پہلے بھی ایک حملہ کر چکا تھا اور ناکام واپس گیا تھا۔ اس نے زور سے فوج کو للکارا اور بلند آواز سے کہا۔

یا حمقی اتدرون من تقاتلون
فرسان المصر قوما مستمیتین
لا یبرزن لھم احد منکم
فانھم قلیل وقل ما یبقون
واللہ لو لم ترموھم الا بالحجارۃ
لقتلتموھم۔

(طبری ج ۶ ص ۲۴۹)

اے بیوقوفو! کیا تم جانتے ہو کس سے جنگ کر رہے ہو۔ یہ ملک کے خاص شہسوار لوگ ہیں یہ جانوں پر کھیلنے ہوئے لوگ ہیں تم میں سے کوئی شخص انفرادی طور پر ان سے جنگ کے لئے نہ نکلے مگر انکی تعداد کم ہے یہ بہت تھوڑی دیر زندہ رہ سکتے ہیں اگر تم سب مل کر فقط پتھر ہی ان کے اوپر برساؤ تب بھی ان کو

قتل کر سکتے ہو"۔

یہ مشورہ عمر سعد کو بھی پسند آیا اور تمام فوج کو فرمان بھیجا دیا گیا کہ کوئی شخص مبارزطلبی کے لئے میدان میں نہ نکلے۔ بے شک عمر بن حجاج نے آگے بڑھ کر فوج میں جوش پیدا کرنے کے واسطے تقریر کی اور کہا۔

یا اهل الکوفة الزموا طاعتکم ولا ترتابوا فی قتل من مرق من الدین وخالف الامام

اے اہل کوفہ اطاعت اور وفاداری کے پابند رہو اور اپنی جماعت سے الگ نہ ہو اور ذرا بھی شک و شبہ نہ کرو ان لوگوں کے قتل کے بارے میں جو دین سے نکل گئے ہیں اور امام وقت (یزید) کے مخالف ہیں۔

امام حسینؑ نے یہ گمراہ کن الفاظ سنکر جوابی تقریر ضروری سمجھی اور ارشاد کیا۔

یا عمر بن الحجاج اعلی تحرض الناس انحن مرقنا وانتم بثتم علیه اما واللہ لتعلمن لو قد قبضت ارواحکم ومتم علی اعمالکم اینا مرق من الدین ومن هو اولی بصلی النار۔

اے عمر بن الحجاج تو لوگوں کو میرے خلاف آمادہ کرتا ہے۔؟ کیا ہم دین سے نکل گئے ہیں اور تم دین پر قائم ہو قسم خدا کی عنقریب معلوم ہو گا۔ اس وقت جبکہ تمھاری جانیں ان جسموں سے جدا ہوں اور تم اپنے اعمال کے اوپر دنیا سے جاؤ۔ اسو قت معلوم ہو گا کہ کون دین سے نکلا تھا اور کون آتش جہنم میں جلنے کا مستحق تھا۔

عمر بن الحجاج نے اپنی فوج کو آمادہ کر لیا تھا اور اب کی پورے جوش و خروش

سے عمر سعد کی فوج کے میمنہ کے ساتھ فرات کی جانب سے فوج امام حسینؑ پر حملہ کیا اس حملہ میں مسلم بن عوسجہ امام کی فوج میں سب سے پہلے شخص زخمی ہوکر زمین پر گرے چھوٹی فوج کے چھوٹے سے میسرہ نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ دشمن کو واپس جانا پڑا مگر غبار کا دامن چاک ہوا ابن عوسجہ خاک و خون میں آغشتہ نظر آئے ۔ امام حسینؑ مسلم کے سرہانے گئے۔ دیکھا ایک رمق حیات باقی ہے۔ حضرت نے مسلم کے لئے دعائے خیر کی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ منھم من قضیٰ نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔

"کچھ جانے والے گزر گئے اور کچھ وقت کے منتظر ہیں اور کسی نے اپنی بات میں تبدیلی نہیں کی"

"حبیب بن مظاہر جو امام کے ساتھ ساتھ تھے وہ مسلم کے قریب گئے کہا تمہارے قتل ہونے کا بڑا صدمہ ہے مگر تمہیں جنت کی مبارکباد دیتا ہوں۔ مسلم نے کمزور آواز سے کہا "تمھیں بھی ہر طرح کی خیر و برکت کی مبارکباد قبول ہو"

اس کا نام ہے استقلال، اس کا نام ہے ثبات قدم، اس کا نام ہے اُصول پر جان دینا، اور اصول کو آخر وقت تک مدنظر رکھنا۔

حبیب نے کہا "اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ میں بھی عنقریب تمھارے ہی پیچھے پیچھے آتا ہوں تو میں کہتا کہ کچھ وصیت کرو۔ اور میں اس وصیت کو پورا کروں" مسلم نے کہا "وصیت کچھ بھی نہیں، وصیت جو کچھ ہے وہ اسی ذات کے متعلق (اشارہ کیا حسینؑ کی طرف) کہ تم بھی ان ہی کے سامنے اپنی جان نثار کرنا" حبیب نے کہا۔ ضرور خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا"

کیا دنیا کی تاریخ ایسی مثالیں پیش کر سکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔!

عمر سعد کی بدحواس فوج اس مختصر سی جماعت کے مقابلہ سے بے تحاشا بھاگی تھی اُسے خبر بھی نہیں تھی کہ کون قتل ہوا لیکن مسلم بن عوسجہ کے اہل و عیال

ان کے ساتھ تھے ان کے خیمہ میں جو ان کے قتل کی خبر پہنچی تو ایک کنیز نے چیخ مار کر کہا "یا ابن عوسجتاہ یا سیداہ" ہائے ابن عوسجہ ہائے میرے مالک یہ سنتا تھا کہ عمر بن الحجاج کی فوج والوں نے خوشی کا شور بلند کیا کہ ہم نے مسلم بن عوسجہ کو قتل کر دیا۔

شبث بن ربعی نے جو خود فوج عمر سعد میں تھا اپنے گرد و پیش والوں سے کہا کہ "خدا تم لوگوں کو غارت کرے، تم اپنے ہاتھ سے اپنی مٹی خراب کر رہے ہو تم اس بات پہ خوش ہوتے ہو کہ مسلم بن عوسجہ ایسے شخص کو قتل کر دیا قسم اسی خدا کی جس کا میں اسلام رکھتا ہوں کہ میں نے کتنی ہی مرتبہ ان ہی مسلم کو اسلامی جہاد کے موقعوں پر کار نمایاں کرتے دیکھا۔ ایک آذربائیجان ہی کا جہاد تھا جس میں چھ مشرکوں کو قتل کیا۔ کیا ایسا شخص تمھارے ہاتھ سے مارا جائے اور تم خوشیاں کرو۔"

یہ سچائی کا مخصوص جوہر ہے کہ وہ دشمن کی زبان سے بھی ظاہر ہو جائے مسلم بن عوسجہ کے قتل کرنے والے دو شخص بتلائے جاتے ہیں مسلم بن عبداللہ ضبابی اور عبداللہ بن ابی خشکارہ بجلی۔

میمنہ والے حملہ کی اس کامیابی نے جو قتل مسلم کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی فوج کا دل بڑھا دیا تھا اس لئے اب کی شمر بن ذی الجوشن نے میسرۂ فوج کو لے کر حملہ کیا۔ اس طرف بھی اصحاب امام حسینؑ نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا عبداللہ بن عمیر نے جو اس کے قبل ایک حملہ کر کے اپنی شجاعت دکھلا چکے تھے اس جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔ اور دو آدمی اور قتل کئے۔ جس کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی اور بکیر بن حی تیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے اس طرح کی تصریح ہے۔ کان القتیل الثانی من اصحاب الحسینؑ "یہ اصحاب امام حسینؑ میں سے دوسرے بزرگ تھے جو شہید ہوئے۔"

ان کی زوجہ ام وہب جو پہلے ہی سے بےچین ہو کر ایک مرتبہ میدان جنگ

میں نکل چکی تھی اب اپنے شوہر کے قتل ہونے کے بعد پھر بے تحاشا میدان میں آگئی اور شوہر کے سرہانے بیٹھکر خاک و خون سے سر پاک کرنے لگی اور کہہ رہی تھی کہ "ھنیئاً لک الجنۃ" "بہشت کی مبارکباد قبول کرو"۔

شمر بن ذی الجوشن نے اپنے غلام رستم کو اشارہ کیا کہ گرز اس کے سر پر مارے اس نے گرز لگایا اور وہ باوفا عورت اسی جگہ شوہر کے سرہانے ہی تمام ہو گئی۔

یہ واقعہ کربلا کے سلسلہ کی وہ شرمناک وارداتیں ہیں جن پر تاریخ ہمیشہ ندامت سے سر جھکالیا کرے گی۔ اور انسانیت کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہوگی۔

حسینؑ بن علیؑ کی فوج والے بہادر سپاہی جن میں سوار صرف ۳۲ تھے بڑی بے جگری سے دشمن کی فوج میں ڈوب ڈوب کر لڑ رہے تھے اور جس طرف رُخ کرتے تھے اہل کوفہ کا موج مارتا ہوا فوج کا سمندر اس طرح پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ جیسے بڑھتے ہوئے دریا میں جزر کے وقت کمی پیدا ہو لیکن ان حملوں میں اصحاب سیدالشہدا میں سے بھی بعض افراد برابر کام آرہے تھے جن میں سے حسب ذیل اشخاص کے نام اب بھی محفوظ ہیں۔ (۱) منجح بن سہم مولی الحسنؑ بعض روایتوں میں ہے کہ امام حسینؑ کے غلام تھے۔ حدائق وردیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ انھیں حسان بن بکر حنظلی نے اوائل جنگ میں قتل کیا۔

(۲) عمرو بن خالد اسدی صیداوی (۳) سعد مولی عمرو بن خالد (۴) مجمع بن عبداللہ عائذی (۵) عائذ بن مجمع بن عبداللہ (۶) جنادۃ بن حارث سلمانی۔

یہ پانچوں آدمی ایک ہی ساتھ نصرت امام حسینؑ کے لئے آئے تھے اور جنگ چھڑنے کے بعد ایک ہی ساتھ فوج دشمن پر حملہ آور ہوئے اور زور شور سے حملہ کیا لشکر میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے۔ فوج کوفہ نے ان لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لشکر امام سے بالکل الگ کر دیا۔ یہ دیکھکر امام نے اپنے بھائی جناب عباسؑ کو ان کی امداد کے لئے بھیجا آپ نے جا کر تن تنہا فوج پر حملہ کیا اور تلوار چلانا شروع کی یہاں تک کہ فوج کو منتشر کر دیا۔ اور ان زخمی بہادروں کو

دشمنوں کے حلقہ سے نکال کر اپنی فوج کی طرف واپس لے چلے ابھی راستہ پورا طے نہیں ہوا تھا کہ دشمن کی فوج پیچھے تعاقب کے لئے نظر آئی اور وہ قریب پہنچ گئی حضرت عباسؑ ان لوگوں کو اپنے آگے آگے لئے خود بطور حفاظت پیچھے پیچھے چلے تاکہ ان کو کوئی گزند پہنچنے نہ پائے مگر دشمن کی فوج کے قریب آتے ہی زخمی بہادروں کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ حضرت عباسؑ کی حفاظت سے نکل کر دشمنوں پر جھپٹ پڑے اور باوجودیکہ زخموں سے بالکل بے حال تھے لیکن جان توڑ شمشیر زنی کی اور آخر ایک ہی جگہ پر گرے اور شہید ہو گئے۔ جناب عباسؑ مجبوراً امام کی خدمت میں واپس آئے اور واقعہ کی اطلاع دی۔ امام نے چند بار اُن بہادروں کے لئے دعائے رحمت کی۔

اس واقعہ میں چند خاص قابل توجہ امور ہیں۔

(الف) امام کا بحیثیت ایک سپہ سالار فوج کے اس درجہ اپنے سپاہیوں کا قدرشناس ہونا کہ جب وہ دشمنوں میں گھر گئے تو آپ نے کسی اور کو نہیں اپنے عزیز ترین بھائی اور علمدار لشکر حضرت عباسؑ کو ان کی امداد کے لئے بھیجا۔

(ب) امام کا انتہائی بھروسا اپنے بھائی جناب عباسؑ کی شجاعت وقوت پر کہ پانچ بہادروں کی امداد کے لئے جو دشمن میں گھرے ہوئے تھے ایک عباسؑ کو بھیج دیا اور کوئی اندیشہ نہیں کیا۔

(ج) حضرت عباسؑ کی مخصوص شجاعت اور فن جنگ میں مہارت جس کی بنا پر آپ نے جوش غضب میں بھرے ہوئے اور اپنے قبضہ میں آئے ہوئے شکار پر اپنی فتح مندی کے دلولے رکھنے والی کثیر التعداد فوج پر تن تنہا حملہ کیا اور حلقۂ دشمن میں گھرے ہوئے بہادروں سے دشمنوں کو ہٹا دیا اور پھر ان میں کامیابی حاصل کی اور بہادروں کو ان کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ اور پھر کسی حیثیت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ آپ کو اس حملہ میں کوئی بھی گزند پہنچا ہو اور زخم لگا ہو۔

(د) اُن بہادروں کا جوشِ جنگ اور ولولۂ شہادت جس سے بروقت امداد پہنچنے کے باوجود انھوں نے پھر نجات کے موقع کو ہاتھ سے دے دیا اور آخر لڑ بھڑ کر درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

ایسی ہی چیزیں وہ ہیں جنھوں نے کربلا کے واقعہ کو دُنیا کی تاریخ میں وہ اہم ندرت اور خصوصیت عطا کر دی ہے جو کسی اور واقعہ کو حاصل نہیں ہے۔

ان لوگوں کی شہادت کے متعلق علامہ شیخ محمد سماوی نے اپنی کتاب (ابصار العین فی انصار الحسین) میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ:۔

ذالک قبل الحملۃ الاولیٰ فی اوّل القتال " یہ پہلے حملہ کے قبل ابتدائے جنگ کا واقعہ ہے "

جندب بن حجیر کندی ان کی بھی شہادت جنگ کے ابتدائی اوقات ہی میں ہوئی ہے۔ حدائق وردیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان کے بیٹے حجیر بن جندب بھی ان ہی کے ساتھ قتل ہوئے لیکن یہ امر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا ہے۔ اُن زیارتوں میں بھی جو امام عصر عجل اللہ فرجہٗ سے وارد ہیں۔ اور اصحاب سید الشہدا کے تذکرہ پر مشتمل ہیں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔

دوسرا باب

سب سے پہلا سخت حملہ اور معرکۂ جنگ کی شدت

واقعی تاریخ کا ایک یادگار اور حیرت انگیز سانحہ ہے کہ تیس ہزار فوج کے سامنے ۷۲ بھوکے اور پیاسے ہوں اور فوج کثیر اس عدد قلیل سے

سے نقصان پر نقصان اٹھائے اور شکست برداشت کرے اور اس کے بنائے کچھ نہ بنے۔ صبح سے دوپہر کے قریب کا وقت آ جائے اور حسینی فوج کی صف مثل ایک مضبوط و محکم آہنی دیوار کے سامنے موجود ہے۔ اس کے برخلاف فوج مخالف میں اضطراب ہو۔ اُن کے نظم و نسق اور ربند وبست میں برہمی ہو اور وہ طریقہ جنگ میں کسی ایک صورت پر برقرار نہ رہ سکیں۔

طبری کا بیان ہے۔

قاتلهم اصحاب الحسين قتالا شديدا واخذت خيلهم تحمل انما هم اثنان وثلاثون فارسا واخذت لا تحمل على جانب من اهل الكوفة الا كشفته فلما راى ذالك عزرة بن قيس وهو على خيل اهل الكوفة ان خيله تنكشف من كل جانب بعث الى عمر بن سعد عبد الرحمٰن بن حصن، فقال اما ترى ما تلقى خيلي مذ اليوم من هذه العدة اليسيرة ابعث اليهم الرجال والرماة۔

اصحاب حسینؑ نے سخت جنگ کی اور انکی سوار فوج جو صرف ۳۲ سپاہیوں پر مشتمل تھی، اُس نے تابڑ توڑ حملے کئے اور وہ اہل کوفہ پر جس طرف سے حملہ کرتے تھے اس طرف کی فوج کو منتشر کر دیتے تھے جب عزرہ بن قیس نے جو اہل کوفہ کی تمام سواروں کی فوج کا افسر تھا یہ دیکھا کہ اس کی فوج ہر جانب سے منتشر ہوتی جاتی ہے تو اس نے عمر بن سعد کے پاس عبدالرحمٰن بن حصن کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ آپ دیکھتے ہیں آج صبح سے اس چھوٹی جماعت کے ہاتھ سے میری فوج کی کیا حالت ہے، اب آپ پیادوں کی فوج اور تیر اندازوں کو بھیجیے کہ وہ مقابلہ کریں:

شرم ہے اور بہت سخت شرم شکست کا اعلان اور بہت کھلا ہوا اعلان، شکست اور کیسی شرمناک شکست سواروں کا افسر ہمت ہار چکا اب پیادوں کی باری آئی۔ شبث بن ربعی پیادہ فوج کا افسر تھا۔

سپہ سالارِ اعظم عمر سعد کا پیغام پہنچا کہ تم آگے کیوں نہیں بڑھتے ۔ دل پر چھایا ہوا رعب سمجھئے یا فوجِ حسینی کی رعایت ۔ نیک دل حسن ظن رکھنے والے راویوں کا یہ بیان ہے کہ شبث بن ربعی کو حسینؑ بن علیؑ سے لڑنا اپنے ضمیر کے لحاظ سے بہت ناگوار تھا اس لئے اس نے جان بچائی مگر حقیقت حال کچھ اور کہتی ہے بہر حال اس نے صاف جواب دیا مگر اپنی شان خودداری کو محفوظ رکھنے کے پردہ میں کہا اور کتنے حقارت آمیز الفاظ میں کہا کہ افسوس ہے ایسی مہم کے سر کرنے کو اتنی فوج ناکافی سمجھی جائے اور مجھ جیسا ایک بڑا امیر دار یوں زحمت دی جائے اور پھر تیراندازوں کی بھی ضرورت ہو ؟ کیا میرے سوا کوئی اور اس مہم کے لئے نہیں ملا عمر سعد نے مجبور ہو کر حصین بن نمیر ۔ وہی حصین جو قادسیہ کی فوج کا افسر تھا وہی جس کے متعلق ہم نے متعدد بار اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ لوگ غلطی سے حصین بن نمیر کہتے ہیں ۔ اور یہ ہرگز صحیح نہیں ہے ۔ اسی افسر کو اسی فوج کے ساتھ جو قادسیہ کی سرحد میں تھی اور اس کے ساتھ پانچ سو تیراندازوں کو مامور کیا کہ وہ بڑھیں اور حسینؑ بن علیؑ کی فوج کے قریب جا کر پاس سے تیروں کا مینہ برسا دیں ۔

فنونِ جنگ کے واقف کار اس امر سے واقف ہیں کہ تیروں کی زد کے لئے خاص درجہ کی مسافت ضروری ہے ۔ دور کی تیراندازی جو مقررہ فاصلہ سے زیادہ پر ہو ہوائی فیروں کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گزند نہ پہنچنا بہت آسان ہے لیکن قریب کی مسافت سے تیروں کا ہنگامہ خیز طوفان ایک بے پناہ حملہ ہے جس سے محفوظ رہنے کے لئے نہ فنونِ جنگ کام دے سکتے ہیں نہ شجاعت و جرأت کے حوصلے میں کہہ چکا ہوں کہ بزدلانہ طریقۂ جنگ ہے اور شجاعت کے نام کے لئے ننگ !

یہ ظاہر ہے کہ اصل لشکر گاہ دونوں جماعتوں کے ایک دوسرے سے کافی

فاصلہ پر ہوتے ہیں۔ اور اُسی صورت سے کربلا میں بھی تھے۔ دونوں فوجوں کی صف آرائی ایسی جگہوں پر ہوتی ہے جن کے درمیان بہت بڑا میدان معرکۂ جنگ اور میدان کارزار کی صورت میں موجود ہوتا ہے اور وہ کچھ کم مسافت نہیں ہوتی۔

پہلی مرتبہ کے تیروں کی بارش کا عنوان یہ تھا کہ عمر سعد نے اپنے لشکر ہی سے جس کی صف آرائی مکمل ہو چکی تھی تیر چلایا اور اس کے ساتھ فوج کے دوسرے لوگوں نے بھی تیر برسائے مگر ان تیروں کا اثر فوج حسینی پر کچھ نہیں پڑا اور نہ پڑنا چاہیئے تھا۔ سوائے اس کے کہ اعلان حرب ہو جائے اور عملی طور سے آغاز جنگ۔ مگر اب جو تیر اندازی ہو رہی ہے اس کی نوعیت مختلف ہے یہ تیروں کا حملہ ہے پورے طور سے زد پر لا کر کیا جا رہا ہے۔

تیر کا بچاؤ ڈھال نہیں ہے۔ تیر کا جواب نیزہ و شمشیر کوئی بھی نہیں۔ تیر کا بچاؤ خالی دینا ہو سکتا ہے مگر یہ تو دیکھنا چاہیئے کہ یہ بچاؤ اس وقت کارگر ہو سکتا ہے جب اتنی دوری میں کہ جس میں ایک انسان کھڑا ہو سکتا ہے یا ادھر اُدھر ہو سکتا ہے کوئی بھی جگہ تیر کی زد سے خالی ہو لیکن عالم تصور میں اس منظر کو پیش نظر رکھو کہ صرف ۷۲ آدمیوں کی صف ایستادہ ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کے لئے کس قدر مسافت کی ضرورت ہے۔؟ اس کے سامنے پانچ سو یا ایک ہزار کی جماعت آتی ہے تو وہ اُس پہلی جماعت سے کتنی زیادہ دور تک کتنی زیادہ مسافت تک ایستادہ ہو گی پھر ایک بڑے لشکر کی طرف سے یک مرتبہ مجموعی طور پر یک جہت اور ہم آہنگ ہو کر ایک نشانہ پر ایک ہی مقصد پر یعنی اس پہلی جماعت کی صف کو پیش نظر رکھ کر بہت دور سے نہیں بلکہ اتنی دور سے جو اُن کی زد میں لانے کے لئے ضروری ہو بوقت واحد تیر چلیں تو کیا یہ ایک عظیم سیلاب کا بہاؤ ایک بڑے طوفان کا تھپیڑا۔ ایک بڑے آندھی کا جھکڑ۔ لوہے کی ایک بڑی چادر نہ ہو گی جو تیروں کی صورت میں جب دو راست ہر طرف سے اس مختصر جماعت

کو ڈھانپ لی گئی اور اُن کے جسم کے کسی حصے اور داہنے بائیں کے کسی گوشے میں کبھی ایک نقطہ نہیں ہو سکتا۔ جو ان تیروں کی زد سے خالی ہو اور اس مختصر جماعت کے لئے امن و پناہ کا ذریعہ ہو۔

واہ رے انصار سید الشہداؑ۔ اس عظیم الشان تیروں کے سیلاب کا جواب ان کی طرف سے صرف یہی تھا کہ انھوں نے تلواریں سوت لیں۔ تیروں کے آتے ہوئے طوفان کا اپنے سینوں سے مقابلہ کرتے اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو ریلتے ہوئے جا پڑے اور دشمن کی فوج کے اندر گھس گئے اور شمشیر زنی کرنے لگے۔

یہی وہ عظیم الشان حملہ اور گھمسان کی جنگ ہے جو تاریخوں میں "حملہ اولیٰ" کے نام سے مشہور ہے اور مذکور ہے۔ اور یہ جنگ ظہر کے ایک گھنٹہ قبل ہوئی تھی۔

کیا کہنا اس قیامت خیز بہادری کا جس نے آخر میں پھر دشمن کو شکست دی اور فوج کو پسپا کیا مگر نتیجۃً اس حملہ کا فوج حسینی کے لئے بہت درد انگیز ضرور تھا۔ جس وقت میدان صاف ہوا اور گرد و غبار دور ہوا تو معلوم ہوا کہ مختصر تعداد بہت مختصر ہو گئی ہے۔ پچاس آدمی انصار سید الشہدا میں سے درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے ہیں جن میں سے بعض تیروں کے نشانہ تھے اور بعض جنگ مغلوبہ میں لڑ بھڑ کر شہید ہوئے یہ سب وہ ہیں جن کی نسبت تاریخ میں یہ ملتا ہے "فقتلوا فی الحملۃ الاولیٰ" یہ پہلے حملہ میں شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ جتنے گھوڑے اصحاب سید الشہدا کی سواری میں تھے سب کے سب بے ہو گئے اور اصحاب جو سوار تھے وہ بھی اب پیادہ ہو گئے۔ حرؑ بن یزید ریاحی جن کا گھوڑا زخمی اس کے پہلے ہو چکا تھا وہ بھی اس موقع پر بالکل پیادہ ہو گئے جس کا تذکرہ ان کے دشمن ایوب بن مشرح حیوانی نے اس طرح کیا ہے کہ :-

افاد اللّٰہ عترت بالحر بن یزید فرسہ حشأتہ سھما فما لبث ان اس حل الفرس واضطرب رکبا فرثب عنہ الحر کانہ لیث والسیف فی یدہ وھو یقول ان تعقروا بی فانا ابن الحر۔ اشجع من ذی لبد ھزبر قال فمارایت احد افری فریہ۔

میں وہ تھا جس نے حر بن یزید کے گھوڑے کو پے کیا۔ بس ایک تیر ایسا لگا کہ فرس تھرا کر زمین پر آیا اور حر چھلانگ مار کر اس کی پشت سے زمین پر آگئے معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر ہے اور تلوار ہاتھ میں لئے تھے۔ یہ شعر پڑھ رہے تھے۔ اگر تم نے میرا گھوڑا پے کر ڈالا تو کوئی حرج نہیں میں ایک شریف انسان کا فرزند ہوں اور شیر سے زیادہ شجاعت کا مالک ہوں (راوی کا بیان ہے کہ) میں نے کوئی اس طرح کا شمشیر زنی کرنے والا نہیں دیکھا۔

واللہ واقعہ کربلا کے بعض نکات عقل انسانی کو حیران کرتے ہیں حسینؑ بن علیؑ اور ان کے اصحاب کا اصول جنگ، فن سپہ گری وہ ایک کارنامہ ہے جس کے رموز و اسرار تک عقل پہنچتی نہیں۔

کربلا میں حسینی فوج کی صف بندی کس طرح ہوئی تھی۔ نظم فوج کیونکر درست کیا گیا تھا اور ترتیب کیا تھی۔

آخر اس طرح کی خونریز لڑائیاں اس صورت کی عظیم الشان تیراندازی، ایسا ہنگامہ خیز حملہ، گھمسان کی لڑائی اور جنگ مغلوبہ، مگر حیرت، انتہائی حیرت سخت حیرت ہے کہ اصحاب وانصار نے کس طرح کا انتظام کیا تھا کہ پچاس صحابی تمام ہو گئے۔ گھوڑے سب کے سب بے ہو گئے۔ میدان خون شہداء سے لالہ زار بن گیا

اور شمع امامت کے پروانے آتش ظلم کی نذر ہو گئے۔ مگر یہ کیا، کوئی ایک تیر، ایک معمولی زخم کسی ایک ہاشمی جوان، نوجوان، کسی ایک بچہ تک کو آیا ہو۔ اور علوی، حسنی، عقیلی، جعفری کسی ایک خاندان کا کوئی ایک شخص بھی درجہ شہادت پر فائز ہوا ہو ہرگز نہیں (غیر ممکن۔ دنیا کی کوئی تاریخ اس کے بتلانے پر تیار نہیں۔ ایک راوی بھی اس کو ظاہر نہیں کرتا۔

کیا حسینؑ بن علیؑ اور ہاشمی جوان میدان جنگ میں موجود نہیں تھے؟ یہ کہنا بھی بالکل واقعات کے خلاف ہے۔ پھر کیا تھا؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ بہادر مقابلہ کر رہے تھے اپنی جان دے رہے تھے اور دوسری طرف اپنے سرداروں اور آقازادوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ اور کامیاب حفاظت اور یہی فداکارانہ اور وفادارانہ عزم و ارادہ کی طاقت کے وہ نمایاں پہلو ہیں جن کی مثال واقعہ کربلا کے سوا ملنا غیر ممکن ہے۔

یہ تصریح اکثر مورخین نے کی ہے کہ اس حملہ میں شہید ہونے والوں کی تعداد پچاس تک پہنچی ہے۔

مایوسی معلوم ہوتی تھی کہ ان تمام شہداء کے اسماء مکمل طور سے معلوم ہو سکیں اور حقیقتاً وہ یکجا صورت سے کہیں مذکور ہیں بھی نہیں مگر قدرہوئی جستجو اور سعی کے کامیاب نتیجہ کی سبب تلاش کے بعد میں نے ان تمام انصار کے اسماء یکجا مجتمع کئے اور شمار کرنے پر پچاس کی تعداد پوری ہو گئی۔

حتمی ارادہ ہے کہ میں اس سلسلہ کے چوتھے حصہ میں شہدائے کربلا کے حالات اور ان کے امتیازی خصوصیات سلسلہ کے ساتھ قلمبند کروں گا۔ اس موقع پر صرف نام درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

"پہلے حملہ میں شہید ہونیوالے اصحاب کے اسماء"

(بہ ترتیب حروف تہجی)

(۱) ادہم بن امیہ عبدی بصری
(۲) امیہ بن سعد بن زید طائی
(۳) بشر بن عمرو بن احدوث حضرمی کندی
(۴) جابر بن حجاج مولیٰ عامر بن نہشل الحیتمی
(۵) جبلہ بن علی الشیبانی
(۶) جنادہ بن کعب بن حارث انصاری خزرجی
(۷) جوین بن مالک بن قیس بن ثعلبہ التیمی ۔
(۸) حارث بن امراء القیس بن عابس کندی
(۹) حارث بن نبہان مولیٰ حمزہ بن عبدالمطلب
(۱۰) حباب بن عامر بن کعب التیمی
(۱۱) حبشی بن قیس النہمی
(۱۲) حجاج بن جدر التیمی السعدی
(۱۳) حلاس بن عمرو الازدی الراسبی
(۱۴) زاہر بن عمر الکندی
(۱۵) زہیر بن سلیم بن عمرو الازدی
(۱۶) سالم بن عمرو بن عبداللہ مولیٰ بنی المدینۃ الکلبی
(۱۷) سالم مولیٰ عامر بن مسلم العبدی ۔
(۱۸) سعد بن حارث مولیٰ علی بن ابی طالبؑ
(۱۹) سعد بن عبداللہ مولیٰ عمر بن خالد الاسدی الصیداوی ۔
(۲۰) سلمان بن مضارب بن قیس
(۲۱) سلیم مولیٰ الحسنؑ
(۲۲) سوار بن منعم بن حابس النہمی الہمدانی
(۲۳) شبیب بن عبداللہ مولیٰ حارث بن سریع الہمدانی الجابری
(۲۴) شبیب بن عبداللہ النہشلی البصری
(۲۵) عامر بن مسلم بن حسان بن شریح السعدی البصری ۔
(۲۶) عامر بن مسلم العبدی البصری
(۲۷) عباد بن مہاجر بن ابی المہاجر الجہنی ۔
(۲۸) عبدالرحمٰن بن عبداللہ الازدی
(۲۹) عبدالرحمٰن بن مسعود بن حجاج التیمی
(۳۰) عبداللہ بن بشر الخثعمی ۔
(۳۱) عبداللہ بن یزید بن ثبیط القیسی العبدی البصری ۔
(۳۲) عبیداللہ بن یزید بن ثبیط القیسی

(۳۳) عقبہ بن الصلت الجہنی
(۳۴) عمارۃ بن ابی سلامۃ الدالانی
(۳۵) عمار بن حسان بن شریح الطائی
(۳۶) عمر بن ضبیعۃ بن قیس بن ثعلبۃ التیمی
(۳۷) عمرو بن جندب الحضرمی
(۳۸) قارب بن عبداللہ بن اریقط
(۳۹) قاسط بن عبداللہ بن زہیر بن حارث التغلبی
(۴۰) قاسم بن حبیب بن ابی لبشر الازدی
(۴۱) کردوس بن عبداللہ بن زہیر التغلبی
(۴۲) مالک بن سریع
(۴۳) مجمع بن زیاد بن عمرو الجہنی
(۴۴) مسعود بن حجاج التیمی
(۴۵) مسلم بن کثیر الاعرج الازدی۔
(۴۶) مقسط بن عبداللہ بن زہیر التغلبی
(۴۷) منیع بن زیاد
(۴۸) نصر بن ابی نیرز مولیٰ علی بن ابی طالب علیہ السلام
(۴۹) نعمان بن عمرو الازدی الراسبی۔
(۵۰) نعیم بن عجلان الانصاری الزرقی الخزرجی۔

یہ وہ لوگ ہیں جن میں یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کون پہلے شہید ہوا اور کون بعد اس لئے کہ تیروں کی بارش اور گھمسان کی جنگ میں ترتیب قائم ہونا غیر ممکن ہے۔ اور معلوم نہیں ہو سکتی۔

تیسرا باب

خیمہ گاہ حسینی پر فوج کا ہجوم

اور

اصحاب سید الشہدا کی بے مثال شجاعت

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ حسینؑ اس باپ کے بیٹے تھے جن کی عمر، نوجوانی سے لے کر بڑھاپے تک میدان جنگ میں گزری اور حسینؑ نے بھی

آنکھ کھول کر بڑے بڑے معرکے نہ دیکھے، مگر بحقیقت خود امام حسینؑ نے کربلا میں جس طرح کی سپہ سالاری اور سیاست جنگ کا نمونہ پیش کیا ہے وہ ان کے پہلے خود اسلام کی تاریخ میں کبھی موجود نہیں ہے گفت گوئے صلح کے قطع ہونے کے بعد جنگ کا یقین ہو چکا تھا۔ امام کے ساتھ عورتیں تھیں اور بچے بھی تھے۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد انتہائی کم تھی۔ اور دشمن کی سپاہ حد سے زیادہ تھی۔ کوفہ میں عمومی اعلان کے بعد کہ جو قتل حسینؑ کے لئے نہ جائے گا اس کا گھر گرا دیا جائے گا۔ اور وہ خود قتل ہو گا۔ کوفہ کے ہر طرح ہی کے لوگ کربلا میں جمع ہو گئے تھے۔ شمر جو ایک پست فطرت اور باش انسان تھا اس کے ساتھ بہت کمینے بد معاش کوفہ کے آدمی معرکۂ جنگ میں آگئے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کسی قتل و غارت کے موقع پر اس قسم کی باتوں سے بھی نہیں چوکتے جنھیں شریف لوگ اور بڑے سپاہی اپنی شرافت اور سپاہیانہ آن بان کے خلاف سمجھ کر ہرگز اختیار نہیں کرتے۔

حضرتؑ نے ملاحظہ فرمایا کہ اُن کا قیام کھلے ہوئے میدان میں دشمن کو چاروں طرف سے ہجوم کرنے کی دعوت دینا ہے اور اس صورت میں سراپردۂ حرم کی حفاظت بھی آپ کی زندگی ہی میں غیر ممکن ہے۔

یہ خیال کر کے آپ نے کربلا کی سر زمین پر تمام اطراف میں گردش کی ایک خاص موقع لشکر گاہ اور حرم سرا کے لئے مناسب نظر آیا جہاں تین جانب سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کا مدور شکل سے اس طرح آکر ملتا تھا جس سے ہلال کی شکل پیدا ہو اسی کا نام "حائر" ہے یقیناً جو شخص اہل دائرہ میں آجائے وہ تین طرف سے محفوظ تو ضرور ہو جائے گا اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک قلعہ میں پناہ لے لے گا مگر یہ پناہ وہی لے سکتا ہے

لہ کتاب نہضۃ الحسین مصنفہ علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی دام ظلہٗ

جس کے پاس کافی مقدار میں آب و طعام موجود ہو اور جو شخص سامان آب و طعام کا نہ رکھتا ہو وہ اس دائرہ میں محفوظ ہونا چاہے تو وہ گویا اپنے تئیں موت کے سپرد کر رہا ہے اس لئے کہ مشرقی جانب کے کھلے ہوئے حصہ پر دشمن ہجوم کر کے اُسے بالکل محصور کر دے گا۔ اور بہت مختصر مدت میں بھوک اور پیاس سے اس کی جان کو تلف کر سکے گا۔

لیکن امام کو اس کے پہلو میں جنوب کی طرف ایک طولانی سلسلہ ٹیلوں کا ملا جو اس پہلے موقع سے زیادہ مناسب صورت رکھتا تھا اس لئے کہ جو شخص اس کے دامن میں قیام کرے وہ شمال اور مغرب کی جانب سے چھوٹی پہاڑیوں میں محصور ہو گا اور مشرق و جنوب کی جانب وسیع میدان جنگ و جدال، اور حرب و ضرب کے لئے موجود ملے گا۔

حضرتؑ نے اپنے حرم سرا اور خیمہ گاہ کے لئے اسی جگہ کو منتخب فرمایا۔ اور اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے قریب برپا کریں اور ہر خیمہ کی طنابوں کو دوسرے خیمہ کی طنابوں کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے پشت کی جانب ایک خندق کھدوا کر اس میں لکڑیاں جمع کرا دی تھیں کہ ان میں آگ دے دی جائے جس کی بنا پر اس طرف سے دشمن کے ہجوم کا اندیشہ نہ رہے۔ یہ تمام تیاریاں شب عاشورہ تک مکمل ہو گئی تھیں۔ اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کر بھی دی گئی۔ اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیرنے اور چار طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

جب تک حسینؑ کی فوج اپنی مختصر مقدار کے اعتبار سے زیادہ تعداد میں موجود تھی۔ اس وقت تک دشمنوں کو آگے بڑھنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا لیکن اب جس وقت کہ پچاس آدمی فوج حسینی کے سب کے سب درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے۔ اور جتنے انصار حسینؑ باقی رہے ان کے پاس گھوڑے

رنباقی نہ رہے، سب پیادہ ہو گئے تو اب فوج دشمن کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ خیام حسینی کے قریب آ گئے۔

حسینؑ کے اصحاب کی تعداد بہت کم تھی مگر ان کی جنگ کا یہ عالم تھا کہ طبری نے لکھا ہے۔

قاتلوھم حتیٰ انتصف النھار اشد قتال خلقہ اللہ

"انھوں نے جنگ کی یہاں تک کہ دوپہر کا وقت آ گیا۔ سخت ترین جنگ دنیا کی جو خدا نے خلق کی ہو۔"

یزیدی فوج کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح پشت سے حملہ کر سکے اور ان بہادروں کو گھیرے مگر پشت کی جانب ان کے خیمے تھے جنھیں امام کے حکم سے اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور طناب اندر طناب قائم کیا گیا تھا کہ انھوں نے ایک مضبوط دیوار اور حصار کی شکل اختیار کر لی تھی اس لئے اس طرف سے حملہ غیر ممکن تھا۔

عمر سعد نے یہ دیکھا تو حکم دیا کہ خیموں کو ان کے چپ و راست سے گرا دیا جائے تا کہ پورے طور سے محاصرہ کرنا ممکن ہو۔ اصحاب سید الشہداء نے جو یہ دیکھا تو متفرق طور پر اپنے اپنے خیموں کے اندر داخل ہو کر منتظر بیٹھ گئے۔ جب خیمہ میں کوئی داخل ہوتا کہ طنابیں کاٹ کر اس خیمہ کو گرائے فوراً وہ قتل کیا جاتا اور اس کی لاش باہر پھینک دی جاتی عمر سعد کو اس تدبیر میں بھی شکست اٹھانا پڑی تو اس نے کہا کہ اچھا ان سب خیموں میں آگ لگا دو کسی خیمہ کے اندر جا کر گرانے کی کوشش نہ کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کا خیمہ اور حرم سرائے عصمت اور مسلسل خیموں کی قطار سے علیحدہ تھا اور جداگانہ قائم تھا۔ فوج کے سپاہی جب ان خیموں میں آگ دینے لگے تو امام نے فرمایا آگ لگا دینے دو اس لئے کہ اگر انھوں نے آگ لگا دی

اور شعلے بھڑکنے لگے تو پھر کبھی یہ اس طرف سے تو تمہارے اوپر حملہ کر نہ سکیں گے۔ اور جوان کا مقصد ہے وہ پورا نہ ہوگا۔

اصحاب حسینؑ نے مدافعت چھوڑ دی اور عمر سعد کی فوج آگ لگانے میں کامیاب ہوئی مگر نتیجہ نے بتا دیا کہ عمر سعد ایسے ایک بڑی فوج کے افسر نے سیاست جنگ میں غلطی کی اور حسینؑ ایسے چھوٹی فوج کے سپہ سالار کی رائے حرف بحرف درست ہوئی۔ یعنی آگ لگانے سے دشمن کے لئے خود اس طرف کا راستہ بند ہو گیا اور مقابلہ کا موقع صرف سامنے ہی کی جانب سے باقی رہ گیا۔

اپنی تدبیر کے شکست کھانے کا بیجا غصہ تھا جس نے کمینہ طبیعت شمر کو برافروختہ کر دیا اور اس نے مخصوص امام حسینؑ کے خیمہ پر حملہ کر کے اپنا نیزہ خیمہ کے اوپر مارا اور کہا کہ لاؤ آگ! تاکہ میں اس گھر کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں۔

اس آواز کا اثر تھا کہ خیمہ میں ایک شور نالہ و فریاد کا بلند ہو گیا جس سے غیرت دار پیکر شرافت مظلوم حسینؑ بن علیؑ کو بھی تاب نہ رہی اور پکار کر فرمایا۔

"اے شمر تو آگ اس لئے منگا رہا ہے کہ میرے گھر کو میرے اہل و عیال سمیت جلا دے! خدا تجھے آگ سے جلانا نصیب کرے"۔

فوج کے دوسرے سپاہیوں نے شمر کو منع کیا اور شبث بن ربعی نے مخصوص طور سے شمر کے پاس آکر کہا۔

ما رأیت مقالا اسوأ من قولك ولا موقفا اقبح من موقفك امرعبا للنساء صرت۔

"میں نے آج تک ایسی شرمناک بات نہیں سنی جیسی تو کر رہا ہے اور نہ ایسا بدتر اقدام دیکھا جس کا تو نے ارادہ کیا ہے۔ تو عورتوں کو خوف زدہ کرتا ہے"۔

ان سب لوگوں کے کہنے سے شمر بھی کچھ شرمندہ سا ہوا اور اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اتنی دیر میں زہیر بن قین نے اپنے دس بہادر ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور

اتنا سخت حملہ کیا کہ شمر اور اس کے ساتھ والی فوج کو خیموں کے پاس سے دور ہٹا دیا اور ابو عمرو قمیابی کو جو شمر کا خاص آدمی اور اس کے قبیلہ سے تھا قتل کر دیا۔ دشمن کی فوج نے جو اپنے ایک ممتاز سپاہی کو اس حملہ میں قتل ہوتے دیکھا پورے جوش و خروش سے ان دس آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور سخت خونریز لڑائی ہوئی مگر ان بہادروں نے بھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا جس کے نتیجہ میں دشمن کو شکست ہوئی مگر اس کے بعد اصحاب حسینؑ میں سے بھی اکّادُکّا افراد قتل ہوتے رہے۔ کثرت اور قلت کا مقابلہ کیا؟ طبری کے بیان کے موافق صورت یہ تھی کہ۔

"اذا قتل منھما الرجال والرجلان ستبین فیھم واولئک کثیر لاتیبیّن فیھم ما یقتل منھم

"ان میں سے ایک یا دو بھی قتل ہوتے تو اُس سے نمایاں کمی پیدا ہوتی تھی اور وہ بہت کثیر تعداد میں تھے اس لئے جتنے بھی قتل ہوتے تھے کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا۔"

وہ اشخاص جو پہلے حملہ کے بعد سے دوپہر کے وقت تک نماز ظہر کے واقعہ سے پہلے شہید ہوئے ان میں سے بعض کے اسماء تاریخ میں حسب ذیل ہیں۔

(۱) بکر بن حی بن تیم اللّٰہ بن ثعلبۃ التیمی یہ ان لوگوں میں سے تھے کہ جو عمر سعد کی فوج میں امام حسینؑ سے جنگ کو آئے تھے مگر جب جنگ چھڑی اور موت کا بازار گرم ہوا تو توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور یہ فوج حسینی میں شامل ہو کر نصرت امام میں شہید ہوئے۔ ابصار العین میں ہے کہ قتل بین یدی الحسین بعد الحملۃ الاولیٰ۔ یہ امام حسینؑ کی نصرت میں پہلے حملہ کے بعد قتل ہوئے۔

(۲) کنانہ بن عتیق تغلبی کے متعلق لکھا ہے قتل مبارزۃ ما بین الحملۃ الاولیٰ والظھر "یہ مبارز طلبی کی جنگ میں" حملہ اولیٰ اور ظہر کے

درمیان میں شہید ہوئے۔

(۳) عمرو بن جنادۃ بن کعب خزرجی۔ کم سن نابالغ۔ یتیم جس کے باپ جنادۃ بن کعب "حملہ اولی" میں شہید ہوئے۔ بحریہ بنت مسعود، اس بچہ کی بیوہ ماں نے بچہ کو ہدایت کی کہ وہ بھی باہر نکلے۔ اور حسینؑ کی نصرت میں جنگ کرے بچہ خدمت امام میں آیا اور طالب اجازت ہوا۔ حضرت نے اجازت دینے سے انکار کیا بچہ نے پھر رخصت طلب کی۔ حضرت نے اصحاب کی طرف رُخ کر کے فرمایا۔ ابھی تو اس کا باپ معرکہ جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ اب بھلا اس کی ماں کے دل پہ کیسا گزرے گی جو یہ بھی جا کر قتل ہو؟"

بچہ نے کہا آقا میری ماں ہی نے تو بھیجا ہے اور انھوں نے ہی تو مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔

امام مجبور ہوئے اور اجازت دی۔ بچہ میدان میں آیا اور لڑ کر قتل ہوا سخت دل اور بے رحم فوج نے بچہ کا سر کاٹ کر فوج حسینی کی طرف پھینکدیا۔ بنت مسعود نے بچے کے سر کو واپس افواج دشمن کی جانب پھینکدیا اور خود بھی عمود خیمہ لے کر دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ امام نے جو یہ دیکھا اسے گوارا نہ کیا اور اس عورت کو خیمہ کی جانب واپس فرما دیا۔

واقعہ کربلا کی ایسی مثالیں وہ ہیں جو دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہیں اور ہمیشہ بے نظیر صورت پر قائم رہیں گی۔

(۴) یزید بن حصین المشرقی، ان کا تذکرہ شیخ عبداللہ مامقانی طاب ثراہ کی کتاب تنقیح المقال میں ہے اور لکھا ہے۔

کان مع من جاھد من اصحابہ وممن قتل قبل الظھر

"یہ ان اصحاب میں سے تھے جنھوں نے حضرت کی نصرت میں جنگ کی اور ظہر کے قبل شہید ہوئے"۔

چوتھا باب

ظہر کا ہنگام اور نماز ظہر کا ہنگامہ

میدان میں ایک طرف گرمی سے آگ برس رہی تھی دوسری طرف جنگ کی وجہ سے خون کی بارش تھی اس عالم میں ظہر کا وقت آیا تو ابوثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی نے امام کی خدمت میں عرض کیا۔

"مولا میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ اب آپ کے بالکل قریب آگئے ہیں۔ اور یہ یقینی ہے کہ آپ پر کوئی آنچ نہ آنے پائے گی جب تک میں انشاءاللہ آپ کے سامنے قتل نہ ہو جاؤں، میں چاہتا ہوں کہ اس نماز کو جس کا وقت آ ہی گیا ہے آپ کے ساتھ پڑھ لوں اس کے بعد خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔

امامؑ نے سر اٹھایا۔ اور فرمایا ذکرت الصلوٰۃ جعلک اللّٰہ من المصلّین الذاکرین نعم ھٰذا اوّل وقتہا "تم نے نماز کو یاد کیا خدا تم کو نماز گزاروں اور یاد رکھنے والوں میں محسوب کرے۔ ہاں یہ نماز کا اول وقت ہے"

پھر حضرت نے فرمایا ان لوگوں سے کہو اتنی دیر تک جنگ سے ہاتھ روکیں کہ ہم لوگ نماز پڑھ لیں"

اللہ اللہ! رسول کا فرزند جس کے گھر سے نماز کی بنیاد قائم ہوئی وہ نماز کی مہلت مانگے اور نہ ملے۔ بلکہ مہلت کے سوال پر حصین بن تمیم صف سے باہر نکلے اور یہ کہے کہ تمہاری نماز قبول نہیں ہے"

جس پر حبیب بن مظاہر بے چین ہو جائیں اور یہ کہیں کہ فرزند رسولؐ کی

نماز قبول نہ ہو اور تیری نماز قبول ہو۔"

حصین بن تمیم کو یہ سن کر غصہ آتا ہے اور وہ حملہ کر دیتا ہے حبیب اس کے مقابلہ کو جاتے ہیں۔ حبیب نے جاتے ہی اس کے گھوڑے کے منہ پر تلوار ماری جس سے وہ بھڑکا اور حصین زمین پر آ رہا اس کے ساتھیوں نے فوراً آکر اس کی حفاظت کی اور بچا کر لے گئے۔ حبیب نے یہ شعر پڑھنا شروع کئے۔

اقسم لو کنا لکم اعدادا او شطرکم ولیتم اکتادا

یا شر قوم حسبا و ادا

"قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اگر ہم تعداد میں تمہارے برابر ہوتے یا تمہارے آدھے بھی ہوتے تو تم ضرور شکست کھا کے واپس جاتے اے بدترین قوم حسب ونسب کے اعتبار سے" پھر جوش جہاد زیادہ بڑھا اور یہ رجز پڑھنے لگے۔

انا حبیب وابی مظاھر فارس ھیجاء وحرب تسعر

انتم اعد عدۃ واکثر ونحن اوفی منکم واصبر

ونحن اعلی حجۃ واظھر حقا واتقی منکم واعذر

میں حبیب ہوں اور میرے باپ مظاہر تھے۔ میں میدان جنگ اور اس موقع کا جب لڑائی کے شعلے بھڑک رہے ہوں شہسوار ہوں۔ تمہارے پاس جنگ کا سامان ہم سے زیادہ ہے اور تعداد میں بھی ہم سے زیادہ ہو مگر ہم وفاداری و استقلال اور صبر و برداشت رکھتے ہیں اور حقانیت کا ثبوت اور سچائی کی طاقت اور خدا کا خوف اور اپنے حق بجانب ہونے کی سند تم سے زیادہ رکھتے ہیں۔"

اس کے بعد شدت کے ساتھ جنگ کی۔ ایک شخص نے بنی تمیم میں سے جس کا نام بدیل بن صریم تھا تلوار سے ان پر حملہ کیا۔ انھوں نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ دوسری طرف سے دوسرے شخص نے نیزہ لگایا جس سے یہ گر گئے مگر پھر سنبھل کر چاہتے تھے اٹھیں کہ حصین بن تمیم نے تلوار سر پر لگائی

حسینؑ سے حبیب خاک پر گر پڑے۔ اور پہلے سپاہی نے اتر کر سر ان کا قلم کر لیا۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حبیب بن مظاہر کے قتل ہونے سے امام حسینؑ کے چہرہ پر شکستگی کے آثار نمایاں ہو گئے اور انتہائی صدمہ کا اظہار ہوا۔

اس وقت حر بن یزید ریاحی نے جو اپنے گھوڑے کے پے ہونے کے بعد پیادہ ہو چکے تھے اور اس کے پہلے کئی مرتبہ لڑ بھی چکے تھے زہیر بن قین کے ساتھ مل کر دشمن پر حملہ کیا۔ حر رجز پڑھ رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے۔

الیت لا اقتل حتی اقتلا　　　ولن اصاب الیوم الا مقبلا
اضربهم بالسیف ضربا مقصلا　　　لا ناکلا عنهم ولا مهللا

"میں نے قسم کھائی ہے کہ قتل نہ ہوں گا جب تک کہ دشمنوں کو قتل نہ کر لوں اور مارا نہ جاؤں مگر پیش قدمی کرنے ہی کی حالت میں، میں آج تلواریں لگاؤں گا، فیصلہ کن تلواریں، نہ میرے قدم پیچھے ہٹیں گے اور نہ کمزوری کا اظہار ہوگا۔"

کبھی یہ شعر پڑھتے تھے۔

اضرب فی اعراضهم بالسیف　　　عن خیر من حل منی والخیف

"میں شمشیر زنی کروں گا اس بہترین انسان کی جانب سے جس نے سرزمین حرم میں کبھی قیام کیا۔"

حر اور زہیر بن قین دونوں نے مل کر جنگ کرنا شروع کی۔ حالت یہ تھی کہ ایک حملہ کرتا تھا اور جب وہ دشمنوں میں گھر جاتا تو دوسرا حملہ کر کے اُسے دشمنوں کے حلقہ سے نجات دیتا تھا۔

تھوڑی دیر یہی صورت قائم رہی لیکن اس کے بعد پیادوں کی فوج نے

حر بن یزید کا سختی سے محاصرہ کیا اور زہیر بن قین کی کوشش ان کی مدافعت میں ناکام ہوئی ۔ حر درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

امام نے اپنے اس ناصر کی یہ قدر کی کہ جب اصحاب اُٹھا کر میدان سے خیمہ گاہ کی طرف لائے اور حضرت کے سامنے رکھا تو حضرت خاک و خون حر کے چہرہ سے صاف کرنے لگے اور فرمایا۔

انت الحر کما سمتک امک وانت الحر فی الدنیا وانت الحر فی الاخرۃ

تم بلاشبہ حر ہو۔ تمہارے والدین نے تمہارا نام حر بہت ٹھیک رکھا تم دنیا میں بھی حر ہو اور آخرت میں بھی حر!

یعنی انسان کی حریت و شرافت کا جوہر اس کے افعال ہی سے نمایاں ہوتا ہے۔ قید و بند دنیا میں گرفتار اور ہوا و ہوس میں اسیر ہو کر حق و ناحق کے امتیاز کو مٹا دینے والا انسان ہرگز حریت ضمیر اور شرافت نفس کے جوہر کا مالک نہیں ہے یقیناً حر نے تمام دنیاوی توقعات کو چھوڑ کر حق کے راستے پر قدم رکھا تو وہ حر ثابت ہوئے اور حریت کے اصلی جوہر کو اپنے عمل سے نمایاں کر دیا۔

جنگ ملتوی نہیں ہوئی تھی اور نماز کی مہلت نہیں مل سکی ایسے موقع کے لئے شرع نے مخصوص حکم نماز خوف کا دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ فوج کے دو حصے ہو جائیں، ایک حصہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کرے اور دوسرا حصہ نماز میں شریک ہو۔ وہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور باقی نماز تخفیف کے ساتھ فردی پڑھ کر تمام کرے اور جب یہ نماز ختم کر کے جائے اور دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ پہلا حصہ فوج کا میدان جنگ سے آ کر نماز میں شریک ہو۔ مگر یہ تو اس وقت ہے جب فوج کی اتنی تعداد بھی ہو کہ اس کے دو حصے ہو سکیں اور اس کا نصف حصہ دشمن کے ساتھ مقاومت کر سکے۔ مگر فوج حسینی، اس کی تو مجموعی تعداد ہی اب بہت کم تھی۔ اس میں یہ صورت کہاں ممکن ہو سکتی تھی لیکن

حسینؑ کو تو اس دن تمام اسلامی تعلیمات کو عملی صورت میں پیش کرنا تھا انھوں نے اپنی اس مختصر فوج ہی میں اس طرح تقسیم کی۔

مشہور یہ ہے کہ آپ نے صرف زہیر بن قین اور سعید بن عبداللہ حنفی کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔ میں نے اسی شہرت کی بنا پر "اسوۂ حسینی" کی تقریر دل میں یہ بحث کی ہے کہ یہ دو آدمی پوری جماعت کی کس طرح حفاظت کر سکتے ہیں اس کے سلسلے میں میں نے جہت قبلہ اور میدان کارزار کے محل وقوع پر تبصرہ کیا ہے۔ مگر علامہ مجلسی نے بحار میں جو روایت درج کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

فقال الحسینؑ لزهیر بن القین وسعید بن عبد اللہ تقدما امامی حتی اصلی الظهر فتقدما امامه فی نحو من نصف اصحابه حتی صلی بهم صلاۃ الخوف۔

امام نے زہیر بن قین اور سعید بن عبداللہ حنفی سے فرمایا کہ دونوں میرے سامنے آگے بڑھو یہاں تک کہ میں نماز ظہر پڑھ لوں۔

یہ دونوں آدمی اصحاب کی تقریباً نصف جماعت کے ساتھ آگے بڑھے اور حضرت نے نماز خوف ادا کی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نماز خوف کی جو صورت ہے اسی طرح نماز پڑھی گئی تھی۔ مگر پھر بھی اصحاب حسینؑ کی جراءت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کمی میں کمی پیدا ہوئی یعنی وہ تعداد ہی کتنی تھی۔ ان میں بھی نصف نماز میں مصروف ہوئے اور نصف تمام فوج کے ریلے کو روکے رہے۔

بہر حال یہ نماز تھی سادہ یادگار نماز!

سعید بن عبداللہ حنفی نے عجیب استقلال اور وفاداری کا مظاہرہ کیا وہ خاص امام کے سامنے جو تیر آتے تھے اس کو خود اپنے اوپر روکتے تھے یہاں تک کہ آخر زمین پر گرے اور روح نے جسم سے پرواز کی، معلوم ہوا کہ

۱۲ تیرہ تیر ان کے جسم میں پیوست تھے۔ زہیر بن قین نے بڑی پامردی سے جنگ کی وہ کہہ رہے تھے۔ ؟

انا زھیر و انا ابن القین اذودھم بالسیف عن حسین

"میں زہیر ہوں اور قین کا فرزند ہوں۔ میں اپنی تلوار سے ان کو حسین کی جانب سے دور کروں گا"

وہ پہلے حُر کے ساتھ بھی بہت لڑ چکے تھے اور اب پھر خوب شمشیر زنی کی آخر کو کثیر بن عبداللہ شعبی اور مہاجر بن اوس دو شخصوں نے اُن پر حملہ کیا جن کے ہاتھ سے وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔



پانچواں باب

اصحاب کا خاتمہ

نماز ظہر کے بعد تمام اصحاب میں شہادت کا جذبہ زیادہ تیز ہو گیا تھا شمع امامت کے پروانے جانبازی میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔

نافع بن ہلال جملی تیر اندازی میں بڑے مشتاق اور یگانۂ روزگار تھے انھوں نے اپنے تیروں کے سوفار پر اپنے نام لکھ دیئے تھے ان کا ذکر اس کے پہلے بھی ہو چکا ہے۔

"انھوں نے تیر لگانا شروع کئے جو سب زہر میں بجھے ہوئے تھے۔ زبان پر یہ جملہ تھا کہ انا الجملی انا علی دین علی"۔ میں قبیلۂ جمل کا آدمی علیؑ کے دین پر ہوں"

ان تیروں نے بہت سے آدمیوں کو زخمی کیا اور بارہ آدمی تو جان سے

مارے گئے آخر دشمن نے ان کو گھیر کر مارنا شروع کیا یہاں تک کہ دونوں بازو ان کے شکستہ ہو گئے اس وقت وہ گرفتار کر لیے گئے شمر کچھ سپاہیوں کی مدد سے ان کو پکڑ کر عمر سعد کے پاس لے گیا۔

عمر سعد نے کہا، نافع یہ تم نے اپنے نفس کے ساتھ سلوک کیا؟ نافع کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس حالت میں جواب دیا" میرے ضمیر سے تو خدا واقف ہے کہ میری نیت کیا تھی مگر خدا کی قسم مجھے خوشی ہے کہ میں نے بارہ آدمی تم میں سے جان سے مارے ہیں اور زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور میرے بازو نہ ٹوٹ جاتے تو تم مجھے اس طرح گرفتار ہرگز نہ کر سکتے۔

شمر نے کہا اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیئے عمر سعد نے کہا تم ہی گرفتار کر کے لائے ہو تمھیں اختیار ہے۔ شمر نے تلوار کھینچی نافع نے کہا:" اگر تم لوگ مسلمان ہوتے تو کبھی ہم لوگوں کے خون میں ہاتھ نہ بھرتے شکر ہے خدا کا کہ اس نے ہم لوگوں کی موت اپنے مخلوق میں سے بدترین لوگوں کے ہاتھوں سے قرار دی"

شمر نے تلوار لگائی، نافع شہادت کے عظیم درجہ پر فائز ہوئے۔

پست حوصلہ اور کمینہ فطرت شمر اس زخمی اور گرفتار شدہ مجاہد کو قتل کر کے فتح مندی کا احساس کرنے لگا اور رجز کے اشعار زبان پر جاری کر کے اصحاب امام حسین علیہ السلام پر حملہ آور ہوا۔

اصحاب امام کی اب یہ حالت تھی کہ ہر ایک چاہتا تھا ہم پہلے اپنی جان نثار کریں:" حضرت نے فرمایا۔

"آؤ! میرے قریب کھڑے ہو کر جنگ کرو"

دونوں نے حضرت کے نزدیک ہی کھڑے ہو کر جنگ کرنا شروع کیا اور شہید ہوئے۔

سیف بن حارث بن سریع و مالک بن عبد بن سریع

دونوں چچازاد بھائی اور ایک ماں کی اولاد تھے، دونوں جوان امام کی خدمت میں آئے اور بس نزدیک کھڑے ہو کر رونے لگے۔ اصحاب کے دل کی بے چینیاں ان کے طرزِ عمل سے نمایاں، اور امام کا استقلال ان کی باتوں سے ہویدا ہے ان کے مُنہ سے رنج وغم کی وجہ سے بات نہیں نکلتی، امام کے پاس کھڑے ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، امام فرماتے ہیں "کیوں میرے بھائی کے فرزندو، روتے کیوں ہو؟ تھوڑی دیر میں ابھی دیکھو خوشی ہی خوشی تمھیں نصیب ہو گی" بہادر جاں نثار عرض کرتے ہیں۔

"ہماری جان آپ پر قربان۔ ہم اپنے لئے تھوڑی روتے ہیں ہمیں تو آپ کی بے کسی پر رونا آتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور ہم سے اب آپ کی حفاظت ہوتی نہیں معلوم ہوتی۔

حضرت نے فرمایا "خدا تم دونوں کو اے میرے بھتیجو جزائے خیر دے اس ہمدردی کی وجہ سے اور ہمدردی کے لئے جو تمھیں میرے ساتھ ہے خدا تم کو بہترین جزا عطا کرے۔" ان دونوں جوانوں نے اپنی جان آقا پر فدا کی۔

بریر بن خضیر ہمدانی

پورے طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی شہادت ظہر سے قبل ہے یا ظہر کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ وہ اوائل جنگ میں شہید ہوئے ہیں مجلسیؒ نے بحار میں ان کی شہادت کو حُر بن یزید ریاحی کے بعد لکھا ہے مگر یہ شاید اسی غلطی پر مبنی ہو کہ خود حُر کی شہادت کو اوائل جہاد میں تبلایا گیا ہے۔

بہرحال صورت یہ ہے کہ یزید بن معقل نے جو فوج عمر بن سعد میں تھا صف سے باہر نکل کر بریر کو آواز دی اور کہا کیوں بریر دیکھتے ہو خدا نے تمھارے ساتھ کیا کیا؟ بریر نے کہا میرے ساتھ تو خدا نے اچھا ہی سلوک کیا۔ ہاں تیرے ساتھ

سلوک برا کیا۔ یزید نے کہا یہ تم جھوٹ کہتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تمہیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی اچھا مجھ یاد ہے ایک دن ہم اور تم بنی لوذان کے محلہ میں چہل قدمی کر رہے تھے تم اس موقع پر کہتے تھے کہ سچے امام اور حقیقی رہنما صرف علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں" بریر نے کہا بے شک میری رائے یہی ہے اور اسی قول پر اب بھی قائم ہوں۔ یزید نے کہا میں تو تمہیں گمراہ سمجھتا ہوں۔ بریر نے کہا اچھا مباہلہ کرنا چاہتے ہو؟ آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے پر لعنت کرے اور جو حق پر ہو اس کے ہاتھ سے باطل عقیدہ والے کو قتل کرا دے پھر باہر نکل کر ہم دونوں آدمی جنگ کریں۔ یزید نے اس کو منظور کر لیا۔ دونوں میدان میں آ گئے۔

یقیناً دونوں فوجوں کی آنکھیں لڑی ہوئی ہوں گی حق اور باطل کا کھلا ہوا مقابلہ اور فیصلہ کن امتحان دونوں نے دعا کی اور اس کے بعد جنگ شروع کر دی۔ صرف دو ضربتوں کے ردوبدل کی نوبت آئی۔ پہلے یزید بن معقل نے وار لگایا جو بریر پر اچھٹتا ہوا پڑا اور کوئی زخم تک بریر کے نہیں آیا۔ اس کے بعد بریر نے تلوار لگائی تو وہ خود کو کاٹتی ہوئی کاسہ سر میں در آئی اور فوراً وہ انسان زمین پر گرا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ پھٹ پڑا۔

مباہلہ کا نتیجہ فیصلہ کن صورت میں نمایاں ہو گیا۔

("قاتلان حسینؑ کا مذہب" رسالہ میں میں نے اس واقعہ سے پورا پورا نتیجہ حاصل کیا ہے۔)

بریر نے اس جنگ میں فتح نہیں حاصل کی بلکہ دلیل حقانیت تھی جو مکمل طور سے فتح یاب ہوئی اور آفتاب کی طرح نمایاں ہوئی۔

کاش دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلتیں مگر نہیں ادھر بریر اپنی تلوار دشمن کے کاسہ سر سے باہر نکال رہے تھے ادھر رضی بن منقذ عبدی نے

بریر پر حملہ کر دیا۔ بریر اس سے دست و گریباں ہو گئے۔ آخر دشمن مغلوب ہوا اور بریر اس کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ کمزور دل والے مغلوب نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے پکارا۔ کعب بن جابر بن عمرو ازدی آگے بڑھا کہ حملہ کرے، فوج والے دوسرے سپاہیوں نے منع بھی کیا کہ یہ بریر حافظ قرآن ہیں جو مسجد میں قرآن حفظ کرایا کرتے تھے مگر اس نے نہ مانا اور پشت کی جانب سے بریر پر حملہ کر کے نیزہ پشت کے پار کر دیا۔ پھر تلوار لگا کے بریر کا کام تمام کر دیا۔

حنظلہ بن اسعد شبامی

امام کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور پکار پکار کر کہنے لگے۔

یا قوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب مثل داب قوم نوح وعاد وثمود والذین من بعدھم وما اللہ یرید ظلما للعباد ویا قوم انی اخاف علیکم یوم التناد یوم تولون مدبرین ما لکم من اللہ من عاصم ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد یا قوم لا تقتلوا حسینا فیسحتکم اللہ بعذاب وقد خاب من افتری۔

اے لوگو! میں ڈرتا ہوں تم لوگوں کے لئے اسی طرح کا عذاب نہ آئے جیسا دوسری قوموں پر آیا۔ جیسے نوح اور عاد اور ثمود کی قوم کے لئے ہوا اور خدا اپنے بندوں کے اوپر ظلم نہیں چاہتا۔ مجھے اندیشہ ہے تمھارے لئے روز قیامت کا جبکہ دنیا سے منہ پھیرے ہو گے اور تمھارا کوئی حفاظت کرنے والا نہ ہو گا۔ اور جس کو خدا گمراہی میں چھوڑ دے۔ اس کا کوئی رہنما نہیں اے حسینؑ کو قتل نہ کرو۔ نہیں تو خدا تم پر عذاب نازل کرے گا۔ سچ کہتا ہوں تم سے۔ جھوٹا ہمیشہ ناکام اور مایوس ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے ایک جذبہ ہے اظہار حق کا جو بے چین کئے ہوئے ہے۔ امام نے فرمایا۔ "اے حنظلہ عذاب کے مستحق تو یہ اسی وقت ہو چکے جب

تمھاری دعوت حق کو مسترد کیا اور تمھارے مقابلہ کے لئے فوج کشی کر کے آئے پھر جائیکہ اب ۔ اب تو انھوں نے تمھارے نیکوکار اور پارسا بھائیوں کو قتل بھی کیا ۔"

حنظلہ نے کہا "مولا آپ کی معرفت مجھ سے زیادہ ہے ۔ مجھ کو یہ درجہ کہاں حاصل ؟ اچھا تو آپ اجازت دیتے ہیں ؟ ہم بھی جا کر اپنے بھائیوں سے ملحق ہوں ۔ حضرت نے فرمایا اچھا جاؤ اس عالم کی طرف جو اس دنیا سے بدرجہا بہتر ہے ۔ اور اس ملک کی جانب جو فنا ہونے والا نہیں ۔"

حنظلہ نے کہا آمین آمین ۔ یہ کہکر آگے بڑھے جنگ کی اور شہید ہو گئے ۔

عابس بن ابی شبیب شاکری

کوفہ کے ایک نام آور بزرگ مرتبہ شخص تھے اپنے غلام شوذب کے ساتھ امام کی نصرت کو آئے تھے ۔ یہ غلام اُن کو بہت عزیز تھا اور غلام بھی بہت وفا شعار تھا ۔ وہ متوجہ ہوئے اپنے غلام کی طرف اور کہا کیوں کیا ارادہ ہے ؟ غلام نے کہا "ارادہ کیا ہے ؟ یہی کہ آپ کے ساتھ فرزند رسُول کی نصرت میں جنگ کروں اور قتل ہوں ۔" عابس نے کہا "شاباش تجھے تجھ سے یہی اُمید تھی ۔ اچھا تو پھر بڑھ آگے اور امام کے اوپر جاں نثار کو تاکہ امام تیری مصیبت بھی اسی طرح دیکھ لیں ۔ جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی اور میں بھی تیرے غم کو اٹھا کر ثواب کا مستحق بن جاؤں یقیناً ۔ اس وقت اگر کوئی ایسا شخص موجود ہوتا جو تجھ سے زیادہ مجھے عزیز ہو تو میں اُسے بھی اپنے سامنے بھیجتا تاکہ اس کی مُصیبت کو برداشت کرنے کا ثواب حاصل کرتا کیونکہ آج تو ایسا دن ہے جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اتنا اجر ثواب حاصل کر لے ۔ اس لئے کہ آج عمل کا دفتر ختم ہو رہا ہے ۔ اور اس کے بعد بس حساب ہی حساب ہے ۔

کیا کہنا اس جذبۂ اطاعت اور اخلاص معرفت کا کیا کہنا اس استقلال

واطمینان کا۔ معلوم ہوتا ہے مصیبتیں خود اختیاری طور پر اٹھائی جارہی ہیں اور ان میں ترتیب و تنظیم قائم کیا گیا ہے۔ کوئی ناگہانی اور اچانک صورت نہیں ہے۔

یہی وہ پہلو تھا جس لحاظ سے جناب عباسؑ نے اپنے بھائیوں کو اپنے سامنے بھیجا۔ اس کا تذکرہ بعد کو آئے گا۔

یاور فا غلام آگے بڑھا امام حسینؑ کو سلام کیا اور میدان میں جاکر لڑا اور شہید ہوا اب عابس بن شبیب خود امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔

"بخدا روئے زمین پر نزدیک یا دور کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز اور آپ سے زیادہ محبوب ہو اگر مجھے قدرت ہوتی کہ میں اپنی جان سے زیادہ کوئی عزیز شے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اور آپ پر نثار کروں تو ایسا ہی کرتا مگر اب تو بس میری جان ہی باقی ہے تو پھر اجازت دیجئے میں خدا کو گواہ کئے دیتا ہوں کہ آپ اور آپ کے باپ کے دین پر ہی قائم ہوں۔" معلوم ہے کہ دنیا کے سپہ سالار خود سپاہیوں کو میدان جنگ میں بھیجتے اور کٹواتے ہیں مگر کربلا کا معرکہ اس سے مختلف تھا یہاں ہر انسان اپنے دل کی تحریک اور ضمیر کی ہدایت سے جاں نثار کر رہا تھا اور اس کو بھی ادائے فرض میں کم محسوس کرتا تھا۔

عابس سلام رخصت کرنے کے بعد ہاتھ میں ننگی تلوار لئے میدان کی طرف چلے پیشانی پر ایک زخم تھا جو شاید پہلے حملوں میں آگیا تھا۔ فوج کوفہ کا ایک شخص ربیع بن تمیم جو کربلا سے واپس ہوا تھا۔ بیان کرتا ہے کہ میں نے عابس کو آتے دیکھا تو پہچان لیا میں انھیں اس کے پہلے لڑائیوں میں دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ یکتائے روزگار شجاع اور جنگ آزما ہیں میں نے کہا

ایھا الناس ھذا اسد الاسود ھذا ابن شبیب لایخرجن الیہ احد منکم

اے اہل فوج یہ شیروں کا شیر ابن شبیب ہے اس کے مقابلہ کو تم میں سے کوئی باہر نہ نکلے۔

ان الفاظ سے فوج پر اتنی ہیبت چھائی کہ عابس نے ہر چند آواز یں دیں کہ "اے جل کس جن کوئی مرد میدان نہیں جو ایک مرد میدان کے مقابلہ کو آئے" مگر فوج میں سے ایک شخص بھی باہر نہ نکلا۔

عمر سعد نے کہا "اس بہادر کو پتھر مارنا شروع کردو"

واہ، کیا خوب اصل جنگ ہے اور کیا شجاعت و بہادری، چاروں طرف سے پتھر برسنے لگے۔

عابس نے جو یہ دیکھا اپنی زرہ اور خود بکتر اتار کر پھینک دیا اور تلوار لئے فوج کے اوپر ٹوٹ پڑے سینکڑوں آدمی ان کے سامنے سے بھاگتے ہوئے نظر آتے تھے۔ آخر فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ درجہ شہادت پر فائز ہو گئے۔

عمرو بن قرظہ انصاری نے پہلے تو حملہ کیا اور تلوار چلائی پھر امام کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے جو تیر آتا اسے اپنے اوپر روکتے اور جو وار ہوتا خود سپر بن جاتے تھے آخر زخموں سے چور ہو گئے۔ امام کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں فرزند رسولؐ میں نے فرض کو ادا کیا؟ حضرت نے فرمایا "ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے۔ رسولؐ خدا کو میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ میں بھی عنقریب آتا ہوں"

یہ سنکر بہادر جانباز جوش میں بھر گیا دشمنوں کی فوج میں گھس گیا اور قتل ہوا۔

جون ابوذر غفاری کے حبشی غلام تھے۔ امامؑ نے ان سے فرمایا کہ تمھیں میں خصوصیت سے اجازت دیتا ہوں کہ تم چلے جاؤ! اس لئے کہ تم ہمارے ساتھ راحت کے لئے تھے۔ اب ہماری وجہ سے کوئی ضرورت نہیں کہ تم مصیبت میں مبتلا ہو"

باوفا غلام نے کہا

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راحت کے زمانہ میں تو میں آپ کے یہاں کے پیالے چاٹوں اور سختی میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں۔ خدا کی قسم میرے جسم سے بدبو آتی ہے اور میرا حسب و نسب پست ہے اور میرا رنگ سیاہ ہے۔ آپ اپنے صدقے میں مجھے بھی جنت کا مستحق بنوا دیجئے تو میری بو خوشبو ہو جائے میرا حسب شریف ہو جائے۔ میرا رنگ سفید ہو جائے۔ بخدا میں آپ سے جدا نہ ہوں گا جب تک یہ سیاہ خون آپ کے پاکیزہ خون میں مل نہ جائے"

یہ کہہ کر بہادر غلام میدان جنگ میں آیا اور یہ رجز پڑھنا شروع کی

کیف تری الکفار ضرب الاسود بالسیف ضرباً عن بنی محمد

اذب عنھم باللسان والید ارجو بہ الجنۃ یوم المورد

ذرا کافر دیکھیں تو ایک سیاہ غلام کی شمشیر زنی کو اولاد رسولؐ کی حمایت میں زبان سے اور ہاتھ سے برابر ان کی نصرت کروں گا۔ اور اس سے روز قیامت بہشت کا امیدوار ہوں"

جنگ کی اور شہادت حاصل کی۔ امام کے دل میں غلام کے الفاظ اثر کر گئے تھے۔ آپ لاش پر تشریف لائے اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی کہ اللّٰھم بیض وجھہ وطیب ریحہ واحشرہ مع الابرار وعرف بینہ وبین محمد و آل محمد پروردگار اس کے چہرہ کو روشن کر دے اور اس کی بدبو کو خوشبو سے مبدّل کر دے اور اسے اچھے آدمیوں کے ساتھ محشور فرما۔ اور اس میں محمدؐ و آل محمدؐ کے درمیان شناسائی قرار دے"

امام زین العابدینؑ کا بیان ہے کہ جب بنی اسد شہداء کو دفن کرنے قتل گاہ میں آئے تو جون کے جسم سے مشک کی خوشبو آرہی تھی۔

غلام ترکی

یہ امام حسینؑ کا غلام تھا اور واضح نام تھا حافظ قرآن تھا میدان جنگ میں آکر یہ رجز پڑھی۔

البحر من طعنی وضربی یصطلی والجو من سھمی ونبلی یمتلی

اذا احساهی فی یمینی تنجلی — ینشق قلب الحاسد المجبلی

"سمندر میں میرے نیزہ و شمشیر کی گرمی سے آگ لگ جائے اور فضا میرے تیروں کی پرواز سے مملو ہو جائے ۔ جب میری تلوار میرے ہاتھ میں چمکتی ہے ۔ مغرور حاسد کا دل شگافتہ ہو جاتا ہے ۔"

یہ غلام جب لڑ کر زخمی ہوا اور زمین پر گرا تو امام سرہانے آئے اپنا رخسارہ اس غلام کے رخسارہ پر رکھ کے گریہ فرمانے لگے ۔ غلام نے آنکھ کھولی اور امامؑ کی اس عزت افزائی کا مشاہدہ کیا، لبوں پر مسکراہٹ آئی اور روح جسم سے مفارقت کر گئی ۔

یہ سلوک جو امامؑ نے اس غلام کے ساتھ کیا ہے بہت سے عزیزوں کے ساتھ بھی نہ کیا ہوگا ۔

سب سے آخری شخص طبری کی تصریح کے موافق جو شہید ہوئے وہ سوید بن عمرو بن ابی المطاع خثعمی تھے ۔ اہل سیر کا بیان ہے کہ سوید نے جنگ کی اور زخموں سے چور بیہوش ہو کر گرے ۔ یقین کیا گیا کہ وہ ختم ہو گئے ۔ مگر ان میں سانس باقی تھی ۔ جب امام حسینؑ شہید ہو گئے اور یہ آواز بلند ہوئی کہ قتل الحسینؑ ۔ سوید کو غش سے افاقہ ہوا ۔ ایک چھری اُن کے پاس موجود تھی انھوں نے اس چھری سے قریب کے بعض لوگوں پر حملہ کیا اور دشمنوں نے پھر ہجوم کر کے انھیں قتل کر دیا ۔

دوسرے اصحاب حضرت امام عصر عجل اللہ فرجہ کی زیارت ناحیہ میں اور اس زیارت میں جو اول رجب کے لئے وارد ہوئی ہے بہت سے دیگر اصحاب کا تذکرہ ہے اور ان کو سلام مخصوص کے ساتھ ممتاز کیا گیا ہے مگر ان کی جنگ کے خصوصی واقعات پورے طور پر محفوظ نہیں ہیں ۔

ان کے نام اور جہاں تک ان کے متعلق معلومات حاصل ہیں ۔ ہم انشاءاللہ اس حصے میں درج کریں گے جو اصحاب کے حالات سے مخصوص قرار دیا جائے گا ۔

مجموعی تعداد جہاں تک یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے شہداءے کربلا کی تعداد بحیثیت مجموعی ۷۲ سے زیادہ تھی پچاس لوگ ہی تھے جو حملۂ اولیٰ میں شہید ہوئے ۔

ممکن ہے کہ ان کے علاوہ شہداء جو جنگ کربلا کے شہید ہوئے ۔ وہ بہتر ہی ہوں ۔

مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے ۔ میں جہاں تک یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں شہداء کی تعداد سو سے زیادہ اور دو سو سے کم ہے ۔ اصحاب میں کچھ وہ تھے جو مکہ معظمہ سے ساتھ آئے تھے اور زیادہ تر وہی لوگ تھے جنھوں نے کوفہ سے حضرت کو دعوت دی تھی اور جناب مسلم کی بیعت بھی کی تھی اور پھر صورت حال کے تبدیل ہو جانے سے وہ کوفہ کے حالات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور آخر انھوں نے کربلا میں آکر اپنی جان نثار کی اور اسی لئے میں کوفہ والوں کی وفاداری کو سیدالشہداء کے معاملہ میں ہرگز مشکوک نظر سے نہیں دیکھتا ہوں ۔ کوفہ کے وہ جاں نثار اور بہادر جو درحقیقت سیدالشہدا کو بلوانے والے تھے ان میں سے جو جو پہنچ سکے وہ کربلا پہنچے اور اپنی جان کی نذر پیش کی ۔ میں نے " قاتلان حسین کا مذہب " میں بھی اس پر تبصرہ کیا ہے اور حالات اصحاب میں بھی اس پر روشنی ڈالنے کا ارادہ ہے بعض لوگ وہ بھی تھے جو کوفہ سے عمر سعد کی فوج میں شریک ہو کر آئے تھے ۔ اور جب تک گفتگوئے صلح ہوتی رہی وہ فوج عمر سعد میں رہے لیکن جب لڑائی ٹھن گئی اور صلح کی امید بالکل قطع ہو گئی تو وہ فوج عمر سعد سے نکل کر امام کی خدمت میں آگئے ۔ اس کی مشہور مثال میں صرف حر بن یزید ریاحی کو پیش کیا جا سکتا ہے

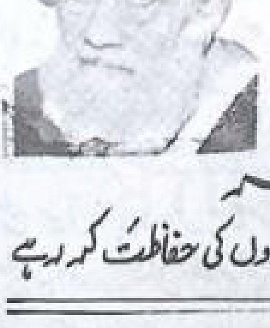
مگر ایسے متعدد آدمی تھے ان کا بھی تذکرہ میں حالات اصحاب کے سلسلے میں کروں گا۔

اصحاب حسینؑ نے جس پر جگری، جس جواں مردی، جس ثبات و استقلال کے ساتھ جان دی ہے وہ دنیا میں یادگار رہے۔ اس کی قدر امام عصرؑ نے یہ کی کہ زیارت کے سلسلہ میں نام بنام ان پر سلام کیا اور ان سب کو مخاطب کرکے یہ ارشاد فرمایا۔

"بابی انتم وامی طبتم وطابت الارض التی فیھا دفنتم وفزتم واللہ فوزاً عظیما فیالیتنی کنت معکم فافوز معکم۔

"میرے ماں باپ تم پر فدا۔ پاک و پاکیزہ ہوئے تم اور پاک ہوئی وہ زمین جہاں تم دفن ہوئے۔ تم بخدا عظیم درجہ پر فائز ہوئے، کاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا اور اسی درجہ پر فائز ہوتا۔"

ہم بھی برابر یہ آرزو کرتے ہیں اور یہی کلمہ زبان پر جاری کرتے ہیں مگر کیا ہم اپنے دل میں وہی جذبۂ معرفت و اخلاص و عقیدت وہی قوت عمل وہی فرض شناسی بھی پیدا کرنے پر تیار ہیں جو اصحاب حسینؑ میں موجود تھی۔



چھٹا باب

عزیزوں کی باری
شہید اول

شبیہ پیغمبرؐ حضرت علی اکبرؑ

اب تک اصحاب تھے جو اپنے امام اور آقا زادوں کی حفاظت کر رہے

تھے انھوں نے دکھلا دیا کہ جب تک وہ زندہ رہے ان میں سے کسی کا بال بیکا نہیں ہوا مگر اب؟ اب بس حسینؑ تھے حسینؑ کے فرزند تھے اور حسینؑ کے بھائی بھتیجے تھے میں نے اسوۂ حسینی کے سلسلہ میں اس صورت حال کی نزاکت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ کیا حسینؑ خاص اپنی اولاد کو محفوظ رکھتے اور پہلے بھائی کی اولاد چچا کی اولاد اور دوسرے عزیزوں کو کٹوا دیتے۔؟ ہرگز نہیں حسینؑ نے سب سے پہلے اپنے جوان فرزند علیؑ اکبر کو جو ہو بہو رسولؐ کی تصویر تھے میدان جنگ میں جانے کی اجازت دی۔

امام کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی تھی۔ اس کو الفاظ سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اپنے ہاتھ بارگاہ خدا میں بلند کئے اور کہا۔

اللّٰھم اشھد علیٰ ھؤلاء القوم فقد برز الیھم غلام اشبہ الناس خلقاً و خُلقاً و منطقاً برسولک کنا اذا اشتقنا الیٰ نبیک نظرنا الیٰ وجھہ۔

خداوندا گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر کہ اب جا رہا ہے ان کی طرف وہ نوجوان جو صورت و سیرت اور گفتار میں تیرے رسولؐ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ ہے جب ہم تیرے پیغمبرؐ کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔

علیؑ اکبرؑ میدان جنگ میں آئے اور یہ رجز پڑھنا شروع کیا۔

انا علی بن حسین بن علی نحن و رب البیت اولیٰ بالنبیؐ

تاللہ لا یحکم فینا ابن الدعی

میں ہوں علیؑ حسینؑ کا بیٹا اور علیؑ کا پوتا۔ ہم بخدا سب سے زیادہ حقدار ہیں رسولؐ کے ہرگز خدا کی قسم ہم پر کوئی حکومت نہیں کر سکتا۔"

یہ رجز نہیں ہے تبلیغی تقریر ہے اس میں اتنے مختصر الفاظ میں پورے طور سے اسباب و علل جنگ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس میں اپنی ولایت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے اور حکومت وقت کے تسلیم کرنے سے اپنے انکار کو ظاہر کیا گیا ہے۔

طبری نے صرف اتنا لکھا ہے کہ علی اکبرؑ نے کئی حملے کئے۔ بحار میں ہے فلم یزل یقاتل حتی ضج الناس من کثرۃ من قتل منھم علی اکبرؑ نے اتنی جنگ کی کہ دشمن کثرتِ مقتولین کی وجہ سے چیخ اُٹھے۔

اس جنگ میں جوان مجاہد کو زخم بھی آ گئے تھے۔ پیاس کا التہاب بہت بڑھ گیا، اپنے باپ کے پاس آخری رخصت کو آئے اور کہا پیاس نے مجھے مار ڈالا ہے اور لوہے کے بوجھ نے مجھے گرانبار بنا دیا ہے کیا بھلا کہیں سے تھوڑا پانی بھی ہو سکے گا جس سے مجھے جنگ کی طاقت پھر آ جاتی" امام کو اپنے فرزند کی اس تمنا کے نہ پورے ہو سکنے کی جتنی بھی تکلیف نہ ہوتی کم تھی۔

آپ نے اپنی انگوٹھی علی اکبرؑ کو دی کہ اسے دہن میں رکھو اور جا کر دوبارہ جنگ کرو مجھے اُمید ہے کہ اب کی اپنے جدّ بزرگوار کے ہاتھ سے ایسے جام سے سیراب ہو گے جس کے بعد پھر کبھی پیاس محسوس نہ ہو گی۔

علی اکبرؑ دوبارہ میدان میں آئے۔ رجز پڑھا حملہ کیا اور پھر بہت سے سپاہیوں کو قتل کیا۔ مرۃ بن منقذ بن نعمان عبدی نے کہا" اگر اب کی مرتبہ اس جوان نے حملہ کیا اور میری طرف سے گزرا تو میں ابھی اس کے باپ کو اس کے غم میں مبتلا کر دوں گا" ایسا ہی ہوا۔

علی اکبرؑ نے جب حملہ کیا مرہ پاس آیا اور نیزہ سینہ پر لگایا علی اکبرؑ گھوڑے سے زمین پر گر گئے اور دشمنوں نے گرد ہجوم کر کے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

خیمہ حسینی میں اس حادثہ نے تہلکہ ڈال دیا۔ مگر امام کا استقلال دیکھنے کے قابل تھا، انھوں نے بس اتنا کہا کہ:

قتل اللہ قوما قتلوک یا بنیّ ما اجراھم علی الرحمٰن وعلی رسولہ وعلی انتھاک حرمۃ الرسول علی الدنیا بعدک العفا۔

خدا فنا کردے اس جماعت کو جس نے تجھے قتل کیا اے میرے فرزند کتنی ہمتیں بڑھ گئیں ان لوگوں کی خدا اور اس کے رسولؐ کے مقابلے میں!

تیرے بعد دنیا کی زندگی پر خاک ہے۔

مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ امر حسینؑ کے لئے اس وقت اہل حرم کا اضطراب تھا، زینبؑ وہ زینبؑ جن کی نسبت مشہور ہے کہ علی اکبرؑ کی پرورش بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ اس وقت مضطرب ہو کر علی اکبرؑ کی لاش پر آگئی تھیں اور کہہ رہی تھیں :-

"یا حبیباہ یا ثمرۃ فواداہ یا نور عیناہ"

آتے ہی وہ لاش علی اکبرؑ سے لپٹ گئیں حسینؑ آئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر سمجھاتے ہوئے خیمہ میں لے گئے۔

واہ رے استقلال، واہ رے ثبات قدم۔ اب آپ میدان میں آئے اور نوجوانوں سے بنی ہاشم کے جو ابھی تک موجود تھے کہا "بڑھو اپنے بھائی کی لاش اٹھاؤ۔ سب نوجوان آگے بڑھے انھوں نے علی اکبرؑ کی لاش کو لاکر اس خیمے کے آگے لٹا دیا جو جنگ کے موقع پر بطور مرکز سپاہ قرار دیا گیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچے اس وقت گھبرا کر خیمہ سے باہر آگئے، بے رحم دشمن کی فوج کو موقع مل گیا۔ عمرو بن صبیح صیدائی نے عبداللہ بن مسلم بن عقیل کو تیر لگایا جو بچہ کی پیشانی کی طرف آیا۔ بچہ نے گھبرا کر اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ دیا۔ تیر نے ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ کسی دوسرے نے بڑھ کر نیزہ لگایا۔ اور قتل کردیا۔

دوسرے بعض چھوٹے بچے بھی اسی صورت سے قتل ہوئے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ وحشیانہ بے رحمی کے نمونے کربلا کے علاوہ کسی واقعے میں پیش آئے ہوں۔



ساتواں باب

قاسم بن الحسن کی یادگار شہادت۔

حسینؑ کربلا میں بڑے بڑے اہم اسلامی فرائض کے عملی نمونے پیش کر رہے تھے انھوں نے اس وقت عبادت کے لئے ایک شب کی مہلت مانگی جب کسی اور کو عبادت کا خیال نہ آسکتا تھا۔ انھوں نے اس قلیل تعداد میں نماز خوف کے اصول پر عمل کر کے دکھلایا جب کوئی اور ان اصول پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے اس طرح اتمام حجت کے منازل طے کئے جس طرح کوئی طے کر نہ سکتا تھا انھوں نے ایسے سخت مواقع پر اپنے اصحاب اعزہ اور اہل حرم کے ساتھ حقوق الناس کے حصول کو ملحوظ رکھا جب کوئی ملحوظ نہ رکھ سکتا تھا۔

اسی صورت سے ایک اہم اسلامی فرض یعنی وصیت پر عمل کرنے کی اہمیت کو آپ نے اس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا جس طرح کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔

میں اکثر لکھ چکا ہوں اور پورے طور سے واضح کر چکا ہوں کہ آئمہ معصومین اپنی روزمرہ کی زندگی اور طرز عمل میں اسباب ظاہری کے پابند تھے اور جب تک کوئی خاص سبب اظہار معجزہ و کرامات کی صورت کا

نہ ہو وہ علمِ باطن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور نہ اس پر عمل کرتے تھے۔

امام حسنؑ اور امام حسینؑ ان دونوں بھائیوں کی محبت آپس میں ویسی ہی تھی، جو دنیا کے بھائیوں کے لئے کامل نمونہ بن سکتی ہے محبت کے رشتوں میں قوت اولاد کی باہمی شادی سے ہوتی ہے اور بہرحال شادی کے لئے جس طرح کی بھی اخلاقی و روحانی خصوصیتوں کی ضرورت ہے، وہ ایک امام کے تربیت یافتہ فرزند کے واسطے ایک امام کی تربیت یافتہ دختر سے زیادہ نہیں مجتمع ہو سکتے۔

ایک لڑکے کا باپ اور لڑکی کا چچا اُسے ہر طرح سے آرزو اور تمنا بھی ہوتی ہے کہ وہ لڑکی جو بھتیجی ہونے کے لحاظ سے مثل اس کے اولاد کے تھی دوسری حیثیت سے بھی اُس کی لڑکی کے مثل بن جائے۔

یہ اسباب تھے جن کے لحاظ سے امام حسنؑ نے آخری وقت اپنے چھوٹے بھائی امام حسینؑ سے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے بڑے فرزند حسن مثنیٰ کا عقد ان کی بڑی بھتیجی کے ساتھ اور چھوٹے فرزند قاسم کا عقد ان کی چھوٹی بھتیجی کے ساتھ کیا جائے۔

امام حسینؑ نے بھی اپنے بھائی کی آخری اس وصیت کو منظور کر لیا تھا اور اس طرح یہ وصیت اُن کے لئے نافذ اور واجب العمل ہو گئی تھی۔

فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے جب تک غیر معمولی اسباب پیدا نہ ہوں شادی کا زمانہ اس وقت ہے جب پسر و دختر دونوں سنِ تمیز کو پہنچ جائیں اور بالغ ہو جائیں۔

امام حسنؑ کی وفات کے موقع پر قاسمؑ بہت کمسن تھے اس کے بعد دس برس امام حسینؑ نے مدینہ میں خاموش زندگی بسر کی اور قاسمؑ آپ کی تربیت میں مثل اولاد کے رہے۔ حسن مثنیٰؑ کی عمر اس وقت جوانی کے حدود میں تھی اس لئے ان کی شادی کر دی گئی مگر قاسمؑ کی عمر اس وقت تک تیرہ چودہ سال

سے زیادہ نہیں ہوئی تھی ان اوقات میں ظاہری اسباب کے لحاظ سے شادی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیئے اور وصیت کے نفاذ میں تعجیل کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس کا موقع آیا ہے اور نہ وقت تنگ ہوا ہے۔

اب وہ موقع آیا کہ جب امامؑ نے سفر عراق کیا۔ تمام مخصوص اعزہ آپ کے ساتھ تھے متعلقین بھی ہمراہ تھے۔ آپ کی صاحبزادیاں جو اکثر مورخین کی تحقیق کی بنا پر چار تھیں ایک بیماری کے سبب سے مدینہ میں چھوڑ دی گئی تھیں لیکن تین آپ کے ساتھ موجود تھیں۔ قاسمؑ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اولاد کے بعد اگر درجہ ہے تو بھتیجوں کا ہی ہے اور قاسمؑ کا حضرتؑ کم سن اور یتیم ہونے کی بنا پر اس درجہ خیال کرتے تھے کہ اتنا خیال اولاد کا بھی شاید نہ فرماتے ہوں۔

سلسلۂ شہدا میں میدان جنگ میں جانے والوں میں طبری وغیرہ کے بیان کے مطابق علی اکبرؑ کے بعد قاسم بن الحسنؑ ہی ہیں۔

قاسمؑ نے امام سے اجازت مانگی اور انتہائی اصرار سے ضد کے ساتھ مانگی۔ علی اکبرؑ کو میدان جنگ بھیجنے میں امام کی جانب سے ذرا بھی توقف نہ ہوا لیکن قاسمؑ کی اجازت پر امامؑ نے اس درجہ انکار فرمایا کہ ظاہری اسباب سے قاسمؑ کو مایوسی ہوگئی اور وہ محزون و مغموم ہو کر خیمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔

مگر امام حسنؑ کے ہاتھ کا ایک تعویذ جو بازو پر بطور وصیت نامہ کے بندھا تھا اُسے کھول کر پڑھنے کا خیال آیا۔ دل کو ڈھارس ہوئی۔ اس میں آج ہی کے دن کی پیشنگوئی تھی اور قاسمؑ کو اپنی جان نثار کرنے کی ہدایت تھی۔

قاسمؑ کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے اسی کو اپنے چچا کی خدمت میں بطور سفارش اجازت پیش کیا جس کے بعد امام کو یقین ہو گیا کہ اب قاسمؑ رک نہیں سکتے۔ بیشک اب ظاہری اسباب کی بنا پر

اُس وصیّت کے لفاذ کا وقت معین ہو گیا تھا۔ جو حضرت امام حسنؑ نے اپنے بھائی کو کی تھی۔

حسینؑ اسلامی شریعت کے محافظ تھے اور اسلام میں عقد نکاح کوئی رسمی تقریب نہیں ہے جس میں کسی جشن کی ضرورت ہو اور عیش و عشرت کے ہنگام کا انتظار رہے۔

شادی ایک آئینی رشتہ ہے جو شرعی قانون کے تحت قائم ہوتا ہے اور حسینؑ کے لئے وہ اس وقت ایک فرض کی حیثیت رکھتا تھا جسے ادا کرنا ضروری تھا۔

شادی بیشک عقلی حیثیت سے انہی مقاصد کے لئے ہے جن کے لئے طرفین کی زندگی کی امید بہت ضروری ہے لیکن ان عقلی مصالح کا لحاظ تو اس وقت سے تعلق رکھتا ہے جب وصیّت ہو رہی تھی اور اس وقت ہم نے بتایا کہ اسباب ظاہری کی بنا پر وہ کسی طرح عقل کے خلاف نہیں تھی۔

مگر وصیّت ہو چکنے اور اُس کے قبول ہونے کے بعد اب اس میں صرف وصیّت کے پورا کرنے میں اور اُس فرض کو ادا کرنے کا پہلو رہ جاتا ہے جس کے ساتھ کسی اور عقلی مصلحت کی ضرورت نہیں ہے۔

امام اگر ایسا نہ کرتے تو ایک بہت بڑا اسلامی فریضہ تشنۂ عمل رہ جاتا اس لئے امام نے اس تعویذ کو دیکھنے کے بعد اب قاسم کو روکنے کا محل تو نہ پایا لیکن آبدیدہ ہو کر یہ فرمایا کہ اچھا تم اپنے والد بزرگوار کی وصیّت پر عمل کرنا!

مگر مجھے تو بھائی کی ایک وصیّت ہے اس کو مجھے پورا کرنا چاہیئے۔

یہ فرما کر قاسمؑ کا ہاتھ پکڑا اور خیمہ کے اندر لائے۔ تبرکات کے صندوق میں سے بزرگوں کا لباس نکالا اور وہ قاسمؑ کو پہنا کر اس اپنی صاحبزادی کا عقد جو قاسم سے منسوب تھیں قاسمؑ کے ساتھ پڑھ دیا؟

یقیناً یہ عقد کوئی تقریب خوشی کی حیثیت تو رکھتا نہیں تھا اس نے حقیقتہً مصیبت کی عظمت اور اس کی ندرت میں اضافہ کر دیا تھا عورتیں ایسے حالات سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں اور اس سے بیوہ حضرت حسنؑ اور زوجہ حضرت سیدالشہداء پر جتنا بھی اثر نہ ہوتا کم تھا جبکہ معلوم تھا کہ جس کی ابھی شادی ہو رہی ہے وہی ابھی مرنے جاتا ہے۔

یہ عوام کی سخت غلطی اور لفظوں کی کوتاہی ہے کہ وہ قاسمؑ کو ایک شب کا داماد اور فاطمہ کبریٰ کو ایک شب کی دلہن کہیں اور اسے تکیۂ کلام بنا لیں حالانکہ حقیقتاً وہ جذبوں کا رشتہ تھا جو دنیا میں موت کے ہاتھوں قطع ہو گیا۔

قاسم کو شہادت کا شوق تھا اس لئے وہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتے تھے سب سے رخصت ہوئے اور عروس سے بھی رخصت ہوئے

جو اس وقت اگرچہ عروس تھی مگر اسے پہلے سے قاسم کے ساتھ وہ اُنس و محبت موجود تھی جو ایک گھر میں رہنے والے چچا زاد بھائی اور بہن میں کمسنی کے عالم میں ہونا چاہیئے وہ ابھی اپنے بڑے بھائی علی اکبرؑ کو رو چکی تھی اور اب قاسم کو مرنے جاتے دیکھتی تھی اور وہ خود عروسی کے معنی بالکل نہ جانتی ہو تب بھی وہ اپنی ماں اور چچی کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کسی خاص طرح قاسمؑ کی موت کو میری بربادی سمجھ رہی ہیں اور اس پر رو رہی ہیں اور اس لئے جو کچھ بھی صدمہ وہ اندوہ اس کمسن صاحبزادی کو ہوتا وہ کم تھا۔

لیکن قاسمؑ پر ان باتوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا انھیں جنگ کا خیال تھا اور اسی کا حوصلہ بنی ہاشم کے بچے تلواروں سے کھیل کر بڑے ہوتے ہیں بچپن میں انسان جس چیز کی طرف بھی متوجہ ہو اس کا خیال بہت قوی ہوتا ہے۔ قاسم احساس کر رہے تھے کہ میرے بڑے بھائی علی اکبر نے بھی اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے ہیں اور مجھے بھی اپنی شجاعت کا جوہر دکھانا چاہیئے وہ اس کا تصور ہرگز نہ کرتے ہوں گے کہ میں کمسن ہوں اس لئے بھائی کا میرا کوئی مقابلہ نہیں بلکہ وہ بڑی مستعدی اور ولولہ سے یہی سوچتے ہوں گے

کہ جو بھائی نے کیا اتنا ہی میں بھی کروں۔ اور ان سے کم نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس لشکر نے میرے بھائی کو قتل کر دیا پھر مجھے اُن کے خون کا انتقام لینا چاہیئے۔

میرے بابا نے اسی موقع کی توصیت کی تھی۔ پھر مجھے اپنے باپ کی روح کو بھی تو خوش کرنا ہے۔

بچے ایسے نادر اور غیر معمولی مواقع سے غمگین ہونے کے بجائے لذت اندوز ہوتے ہیں، قاسم سمجھ رہے تھے کہ اس وقت مجھے دوہری عزت حاصل ہو گئی امام نے مجھے اپنا داماد بنا لیا مجھے اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے ہیں مجھے اس وقت پورے طور سے حق شجاعت ادا کرنا چاہیئے تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے کم نہیں رہا۔

یہ تمام خیالات ہوں گے جن کی بناء پر قاسمؑ کے دل پر نہ تو ماں کی جدائی اور دوسرے اہل حرم کے رونے کا اثر ہوا۔ نہ عروس کے صدمہ کی طرف کوئی توجہ ہوئی وہ رخصت ہوئے اور سب سے رخصت ہو کر باہر چچا کی خدمت میں گئے کہ اب تو کوئی انتظار نہیں رہا۔ اب تو مجھے اجازت میدان کارزار کی دیجئے۔ امام نے شاید بھائی کو یاد کر کے اس وقت بہت گریہ فرمایا۔ قاسمؑ کے عمامہ کو اپنے ہاتھ سے باندھا اور اس کے دونوں گوشے سینے پر لٹکا دیئے ان کے پیراہن کو بصورت کفن چاک کر دیا۔

قاسمؑ میدان جنگ میں آئے۔ چہرہ مثل ماہ شب چہاردہ کے تھا اور یہ رجز پڑھنے لگے۔

ان تنکرونی فانا ابن الحسن   سبط النبی المصطفےٰ والموتمن

هذا الحسین کالاسیر المرتهن   بین اناس لاسقوا صوب المزن

"اگر تم مجھے نہیں جانتے۔ تو اب معلوم کر لو کہ میں حسنؑ کا فرزند ہوں اور پیغمبرؐ کی اولاد میں ہوں۔ کیا غضب کی بات ہے کہ یہ حسینؑ تمہارے درمیان مثل قیدی

کے محصور ہو گئے ہیں۔ خدا کرے ابر باراں اس جماعت کو سیراب کبھی نہ کرے"

قاسمؑ نے اپنی عمر کے لحاظ سے غیر معمولی خونریز جنگ کی۔

آخر کار دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر گرے اور اپنے چچا کو مدد کے لئے آواز دی حسینؑ کو اپنے بھتیجے کی مدد کے لئے پہنچنا تھا انھوں نے غضبناک شیر کی طرح حملہ کیا اور فرزند رسولؐ کے حملہ سے فوج میں تہلکہ پڑ گیا۔ افسوس ہے کہ اس ہنگامہ میں قاسمؑ کی لاش کو نہایت مصیبت ناک صدمہ پہنچ گیا۔ آخر فوج منتشر ہوئی اور امام لاش قاسمؑ پر پہنچے۔

انتہائی غم و اندوہ کے ساتھ قاسمؑ کی لاش کو بھی لا کر اسی جگہ لٹایا جہاں علی اکبرؑ کی لاش پہلے سے موجود تھی۔ یہ شادی وہ تھی جس سے قاسمؑ کی شہادت نے ایک مخصوص یادگار حیثیت اختیار کر لی اور جس کو سوچ کر حضرت جاوید مرحوم کو ارشاد فرمانا پڑا۔

وہ گھروں کی ان کے مر جانے سے بربادی ہوئی
حضرت قاسمؑ کی شادی بھی عجب شادی ہوئی



آٹھواں باب

شہدائے بنی ہاشم کی تفصیل

بنی ہاشم کے شہداء میں بھی کامل ترتیب قائم کرنا بہت مشکل ہے جہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے اصحاب کی شہادت کے بعد سب سے پہلے حضرت علی اکبرؑ شہید ہوئے۔ آپ کی شہادت سے ہاشمی نوجوانوں میں ایک خاص جوش پیدا ہو گیا تھا اور انھوں نے بوقت واحد حملہ کر دیا اور اولاد مسلمؑ جعفرؑ

میں سے چند بہادر اُس وقت قتل ہو گئے۔ پھر قاسمؑ بن الحسنؑ کی شہادت ہوئی اور سب سے آخر میں اولادِ علیؑ بن ابی طالبؑ یعنی برادران حضرت سید الشہداء سلام اللہ علیہ جن میں سب سے آخری شہید حضرت ابوالفضل العباسؑ ہیں اور آپ کے اوپر مجاہدین کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

پھر حضرت سید الشہداؑ نے جہاد کیا اور آپ کی شہادت ہوئی۔

اس لحاظ سے اس باب کو ہمیں حضرت قاسمؑ کی شہادت کے پہلے قائم کرنا چاہیئے تھا لیکن چونکہ بہرحال یہ باب غیر مرتب حیثیت رکھتا ہے اس لئے جہاں تک مستند طریقہ سے شہداء بنی ہاشم کے اسماء مل سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

اولادِ مسلمؑ و عقیلؑ

(۱) عبداللہ بن مسلم بن عقیل۔ سابق میں حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے بعد اس بچہؑ کی شہادت کا تذکرہ ہو چکا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کمسن تھے اور بغیر جنگ کے شہید ہوئے مگر بحار میں ان کی رجز اور جنگ موجود ہے مگر میرے خیال میں پہلی روایت درست ہے۔

(۲) محمد بن مسلم بن عقیل۔ ابصار العین فی انصار الحسینؑ میں ہے کہ

حمل بنو ابی طالب بعد قتل عبداللہ جملۃ واحدۃ فصاح بھم الحسین صبراً علی الموت یا بنی عمومتی فوقع فیھم محمد بن مسلم قتلہ ابو مرھم الازدی ولقیط بن ایاس الجھنی۔

عبداللہؑ کے قتل ہونے کے بعد ابوطالب کی اولاد نے ایک ساتھ حملہ کر دیا امام نے آواز دی ہاں میرے چچا کے فرزندو موت کے مرحلہ کو سر کر دو چنانچہ ان میں سے محمد بن مسلم شہید ہو کر گر گئے۔

ان کو ابو مرہم ازدی اور لقیط ابن ایاس جہنی نے قتل کیا۔

(۳) عبدالرحمٰن بن عقیل۔ ابن شہر آشوب کا بیان ہے۔

لقد مر فی حملۃ آل ابی طالب لعد الانصار وھو یقول۔

وہ آل ابوطالب والے حملہ میں جو انصار کے بعد تھا بڑھے اور یہ کہہ رہے تھے۔

"میرے باپ عقیل ہیں۔ تم کو جو میری قرابت ہے، ہاشم سے اس کو جاننا چاہیئے اور معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام بنی ہاشم میرے بھائی ہیں"۔
اس کے بعد جنگ کی اور سترہ آدمی قتل کئے پھر دشمنوں نے گھیر کر ان کو قتل کیا ان کے قاتل عثمٰن بن خالد بن اشیم جہنی اور بشر بن حوط ہمدانی تھے"۔

(۳) جعفر بن عقیل بن ابی طالب ۔ انھوں نے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور وہ یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

انا الغلام الابطحی الطالبی　　من معشرٍ فی ہاشمٍ من غالب
ونحن حقاً سادة الذوائب

"میں مکہ کا رہنے والا طالب کے خاندان کا ہاشم کی نسل سے اور غالب کے گھرانے سے ہوں۔ یقیناً ہم ہی تمام قبائل کے سردار ہیں"۔
پندرہ آدمی فوج کے قتل کئے اور بشر بن حوط کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

اولادِ جعفرؑ

(۱) عون ۔ و (۲) محمد فرزندان عبداللہ ابن جعفر۔ ان دونوں مجاہدوں کی نسبت مرثیہ نگاروں میں اور ان کی وجہ سے عام اشخاص میں یہ روایت شہرت پا گئی ہے کہ یہ دونوں حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے فرزند امام حسینؑ کے بھانجے تھے۔
اس کے برخلاف اہل علم کی زبان سے اکثر یہ سُنا گیا اور خواص کے طبقہ میں یہ مشہور ہو گیا کہ یہ روایت بالکل غلط ہے اور یہ دونوں حضرت عبداللہ بن جعفر کے صاحبزادے تھے مگر جناب زینبؑ کے بطن سے نہیں تھے۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں درست نہیں ہیں۔ حقیقتہً محمد تو جناب زینب کے بطن سے نہیں تھے۔ ان کی والدہ کا نام تھا خوصاء بنت حفصتہ بن ثقیف بن ربیعتہ بن عائذ بن ثعلبتہ بن حکابتہ بن صعب بن علی بن بکر بن

وائل۔ خوصاد کی ماں تھیں ہند بنت سالم بن عبدالعزیز۔ بن مخزوم بن سنان بن مولتہ بن عامر بن مالک بن تیم اللات بن ثعلبتہ ہند کی ماں تھیں۔ میمونہ بنت بشر بن عمرو بن حارث بن ذہل بن شیبان۔

مگر عون جناب زینب ہی کے بطن سے تھے۔ بیشک ان دونوں صاحبزادوں کی نسبت مرثیہ گویوں کی یہ روایت کہ وہ بہت کم سن تھے۔ درست نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ اُن کے سن کے متعلق کوئی قطعی حد بندی نہیں کی جا سکتی مگر اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوانی کے حدود میں تھے اور جناب قاسمؑ کی طرح سے کمسن نہیں تھے۔ روز عاشورہ پہلے محمد میدان جنگ میں گئے تھے۔ انھوں نے یہ رجز پڑھا۔

اشکو الی اللہ من العدوان فعال قوم فی الردی عمیان
قد بدلوا معالم القرآن ومحکم التنزیل والتبیان

"خدا سے شکوہ کرتا ہوں دشمنوں کے ظلم و جفا کا۔ اس قوم کے افعال کا جو اندھی بنی ہوئی ہلاکت میں جا رہی ہے۔ انھوں نے قرآن کے نمایاں احکام کو بدل دیا اور کھلی ہوئی قرآنی آیتوں میں تبدیلی کی

جنگ کی اور دس آدمی قتل کئے آخر عامر بن نہشل تمیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔

ان کے بعد عون بن عبداللہ میدان میں آئے اُن کا رجز یہ تھا۔

ان تنکرونی فانا ابن جعفر شھید صدق فی الجنان ازھر
یطیر فیھا بجناح اخضر کفٰی بھذا شرفا فی المحشر

اگر مجھے نہ جانتے ہو تو پہچان لو کہ میں جعفرؑ کی اولاد ہوں۔ وہ جعفر جو حق کے راستہ میں شہید ہوئے جن کو خدا نے بہشت میں بال و پر عطا فرمائے کہ وہ مثل ملائکہ کے پرواز کریں۔ اُن کے شرف کے لئے اتنا بہت کافی ہے۔

تین سوار اور اٹھارہ پیادے قتل کرنے کے بعد عبداللہ بن قطنہ طائی

کی تلوار سے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔
بعض کتب میں عون و محمد فرزندان جعفرؑ کی شہادت بھی کربلا میں مذکور ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حقیقتاً عون اور محمد عبداللہ بن جعفر ہی کے فرزند تھے جو کربلا میں شہید ہوئے۔ لیکن محمد جوان کے چچا تھے وہ کربلا سے بہت قبل جنگ صفین میں اور عون ان کے بھی پہلے قتل ہو چکے تھے۔



نواں باب
قمر بنی ہاشمؑ اور اُنکے بھائی

چار فرزند امیرالمومنینؑ کے ام البنین فاطمہ بنت حزام کے بطن سے تھے (۱) حضرت عباسؑ بن علی جوان میں سب سے بڑے تھے۔
(۲) عبداللہ بن علی بن ابی طالبؑ۔
(۳) عثمانؓ بن علی بن ابی طالبؑ
(۴) جعفرؓ بن علی بن ابی طالبؑ جو سب میں چھوٹے تھے۔
ان تینوں موخر الذکر بھائیوں کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ روز عاشور حالت یہ تھی کہ ہر شخص اپنے سے وابستہ انسان کو خود اپنے سامنے میدان میں بھیجتا تھا اور اُسے بطور تحفہ اپنے ہاتھ سے پیش کرتا تھا پھر خود آگے بڑھ کر جان دے دیتا تھا۔
عابس بن ابی شبیب کے واقعہ میں اس کی مثال دیکھ چکے اور ان کے الفاظ بھی سن چکے جو کہ انھوں نے اپنے غلام شوذب سے کہے تھے

"میں چاہتا ہوں تمہاری مصیبت کو اٹھا کر اجر و ثواب کا مستحق بن لوں پھر خود میدان جنگ میں جاؤں"۔

خود حضرت سید الشہداء نے بھی کیا کہ جب تک کوئی بھی ایسا رہا جو آپ کے سامنے شہید ہو اُس وقت تک آپ نے خود اپنی جان نہیں دی۔

اس پر مفصل طور سے ہم نے "حسین اور اسلام" میں تبصرہ کیا ہے۔

جناب عباسؑ نے بھی اسی طرح روز عاشورا اپنے بھائیوں کو یکے بعد دیگرے بلایا اور ایک ایک کو جنگ کے لئے بھیجا۔

سب سے پہلے آپ نے عبداللہؑ کو بلایا جو آپ کے بعد دوسرے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے فرمایا۔

تقدم یا اخی حتی اراک قتیلا واحتسبک فانہ لا ولد لک

"بڑھو بھائی آگے بڑھو تاکہ میں تمہیں قتل ہوتے اپنی آنکھ سے لوں اور اپنے لئے سامان آخرت سمجھوں۔ کیونکہ تمہارے تو کوئی اولاد بھی نہیں"۔

ہمارے بیان کئے ہوئے نظام اور صورت واقعہ کو دیکھتے ہوئے اس آخری ٹکڑے کے معنی یہ ہیں کہ اگر تمہارے اولاد ہوتی تو تم اُس کا انتظار کرتے کہ اپنے پہلے بیٹے کو اپنے سامنے قتل ہونے دیتے پھر خود جاتے مگر تمہارے کوئی اولاد تو ہے نہیں جس کے لئے تم انتظار کرو لہٰذا تو جاؤ خود ہی جاؤ میدان جنگ میں"۔

انتہائی کم عقلی سے کام لیا ہے بعض لوگوں نے تمہارے کوئی اولاد نہیں ہے" کے فقرہ کے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ تم پہلے قتل ہو جاؤ تاکہ میں تمہارا میراث حاصل کروں اور اس کو اپنی اولاد کے لئے بطور متروکہ چھوڑ جاؤں"۔

اس خود غرضی کی نسبت حضرت عباسؑ کی طرف وہی دے سکتا ہے جو آپ کے مرتبہ سے واقف نہ ہو اور پھر جب کہ الفاظ سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں حتی اراک قتیلا واحتسبک" میں تم کو مقتول دیکھوں

اور اُسے اپنے لئے سبب اجر سمجھوں۔ اسی کے بعد "فانہ لا ولد لک" اس لئے کہ تمہاری کوئی اولاد نہیں"۔

میراث ملنے کو گزشتہ کلام سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اگر معاذ اللہ حضرت عباسؑ کا یہ مقصد ہوتا بھی تو یہ بات کہنے کی نہیں تھی کہ تم کو میں پہلے اس لئے بھیجتا ہوں تاکہ تمہاری میراث کا مالک بنوں"۔

انسان کی سمجھ میں جب بات نہ آئے تو کہے نہیں۔ بہرحال یہ خیال بالکل غلط ہے اور حقیقی مفہوم کلام کا وہی ہے جس کا تذکرہ کیا گیا۔

عبداللہ میدان میں آئے اور جنگ کرنے کے بعد ہانی بن ثبیت حضرمی کی تلوار سے شہید ہوئے۔

اب جناب عباسؑ دوسرے بھائی عثمانؓ کی جانب متوجہ ہوئے اور انہیں میدان جنگ میں بھیجا۔ عبداللہ آگے بڑھے اور جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

پھر تیسرے سب سے چھوٹے بھائی جعفرؓ کی طرف رُخ کیا اور کہا کہ "جاؤ! جیسے تمہارے دونوں بھائیوں کا صدمہ میں نے برداشت کیا ویسے تمہارا بھی برداشت کروں کیونکہ تم میں سے کسی کے بھی اولاد نہیں ہے"۔

جعفرؓ نے بھی جہاد کیا اور درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

اب جس وقت کہ بھائیوں میں بھی کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہا جو امام کی نصرت کرے اور بنی ہاشم کے مجاہدین سب تمام ہو گئے تو اب حضرت ابوالفضل العباسؑ امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت مانگی امام نے اپنے بھائی کو بہت حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا "تم تو میرے علمدار ہو" عباسؑ نے عرض کیا "اب مجھ سے ضبط ممکن نہیں اور زندگی سے سیر ہو گیا ہوں" امام نے فرمایا "اچھا ارادہ ہی کر لیا ہے جنگ کا تو پانی کی فکر کرنا"۔

عباسؑ اس کے پہلے بھی ایک مرتبہ عاشور کے قبل فرات پر جنگ کر کے پانی لا چکے تھے اور "سقا" کے لقب کے بھی مستحق ہوئے تھے۔ اس وقت پھر انھوں نے مشک لی اور دشمن کی فوج پر حملہ کیا۔ اس طرح نہیں کہ گویا انھیں جنگ ہی منظور ہے بلکہ اس طرح جیسے وہ نہر کا راستہ صاف کرنا چاہتے ہیں اور نہر پر جانا منظور ہے۔

علیؑ کے بیشہ کا شیر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ وہ نہر پر پہنچا بھی اور مشک کو پانی سے بھرا بھی بےشک خود عباسؑ پیاسے تھے اور بہت پیاسے انھوں نے ہاتھ میں پانی کا چلو لیا کہ پئیں مگر امام کی پیاس کا خیال آگیا تو ٹھنڈا چلو ہاتھ سے پھینک دیا اور پیاسے نہر سے نکل آئے۔ بھری ہوئی مشک دوش پر لئے خیمہ کی جانب روانہ ہو گئے مگر فوج عمر سعد جسے اپنی شکست کا خطرہ بھی تھا اب پورے اجتماع کے ساتھ سدّ راہ ہوئی۔ عباسؑ کی آزادی جنگ میں باقی نہ تھی ان کے دوش پر مشک موجود تھی جس کے ساتھ وہ لڑ نہیں سکتے تھے مگر وہ بہادر کہ اس نے اسی عالم میں جنگ کی۔ وہ جوش و خروش سے حملے کر رہے تھے۔ اور ان کی زبان پر یہ شعر تھے۔ ؎

لا ارھب الموت اذ الموت رقا — حتی اواری فی المصالیت لقی
انی انا العباس اغدو بالسقا — ولا اھاب الموت یوم الملتقی

"میں کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ موت کتنے ہی نعرے لگائے جب تک کہ میں تلواروں کے سایہ میں زمین پر گر نہ جاؤں میں عباسؑ ہوں، مشک لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا اور جنگ کے ہنگام میں موت کی کوئی پرواہ نہ کروں گا۔"

آخر دشمنوں نے احساس کر لیا کہ جب تک عباسؑ کے ہاتھ موجود ہیں کامیابی مشکل ہے حکیم بن طفیل طائی سنبسی نے کمین گاہ سے آکر داہنے ہاتھ پر تلوار لگائی۔ عباسؑ کو اپنی جان سے زیادہ علم کا خیال تھا۔ انھوں نے علم کو گرنے نہیں دیا بائیں شانہ پر لیا اور یہ کہا۔

واللہ ان قطعتم یمینی انی احامی ابداً عن دینی

خدا کی قسم اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ میں اب اپنے دین کی حمایت نہ کروں گا اس فرض کو تو میں ہمیشہ انجام دیتا رہوں ۔"

زید بن ورقا جہنی نے بائیں ہاتھ پر بھی تلوار لگائی اور اسے قطع کر دیا عباسؑ نے علم کو اپنے سینہ سے لگایا اس کے ساتھ قبیلہ تمیم کے ایک شخص نے سر پر ایک گرز لگایا جس سے جناب عباسؑ زمین پر گرے اور بلند آواز سے پکار کر کہا بھائیؑ میری خبر لیجئے ۔"

امام پر اس آواز کا کیا اثر ہوا؟ اس کا اظہار غیر ممکن ہے۔

وہ مثل باز شکاری کے جھپٹے اور زخمی بھائی کی لاش پر پہنچے۔ دیکھا دونوں ہاتھ قطع ہیں۔ پیشانی شکستہ ہے۔ آنکھ پر تیر ہے۔ زخموں سے چور ہیں۔ امام جھک گئے اور سرہانے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ شیر دل بھائی کی روح نے جسم سے مفارقت کی اب کوئی اور نہیں تھا جس کا حسینؑ کو سہارا ہوتا وہ بھائی کی لاش سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے۔ تلوار ہاتھ میں تھی جوش و خروش کا عالم تھا۔ داہنے اور بائیں دشمن پر حملہ کر رہے تھے۔

اور تاریخ کے الفاظ یہ ہیں۔

یفرون بین یدیہ کما تفر المعزی اذا شد الذئب

"وہ اس طرح آپ کے سامنے سے بھاگ رہے تھے جیسے بکریاں بھاگتی ہیں اس وقت جب بھیڑیا حملہ کرے ۔"

اور امام کہہ رہے تھے۔

این تفرون وقد قتلتم اخی این تفرون وقد قتلتم عضدی

"اب بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بھائی کو تو مار ڈالا۔ بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بازو کو توڑ ڈالا ۔"

اس کے بعد آپ اپنی جگہ پر آکر تنہا کھڑے ہو گئے۔

ابصار العین میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ

کان العباس آخر من قتل من المحاربین لاعداء الحسین علیہ السلام ولم یقتل بعدہ الا الغلمان الصغار من آل ابی طالب الذین لم یحملوا السلاح

"عباسؑ سب سے آخری شخص تھے جو دشمنانِ امام سے جنگ کرکے شہید ہوئے۔ اُن کے بعد جو قتل ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے بچے آلِ ابوطالبؑ میں سے تھے جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔"



دسواں باب

شش ماہہ بچہ کی عظیم الشان شہادت

بچہؑ، بہت کمسن بچہ، شیرخوار بچہ، بے زبان بچہ، عبداللہ نام تھا اور امام نے چونکہ اپنے سب بچوں کا نام علیؑ رکھا تھا اس لئے علی اصغرؑ بھی کہا جاتا تھا شہید چھوٹا سا تھا مگر شہادت اس کی اتنی عظیم ہے کہ درحقیقت اگر کربلا میں یہ شہادت واقع نہ ہوتی تو اس کی عظمت میں ایک بہت بڑی کمی رہ جاتی۔

ماں باپ کو چھوٹے بچوں سے انتہائی محبت ہوتی ہے۔ امام جب شہادت پر عازم ہوگئے تو درِ خیمہ پر آکر اس بچہ کو دیکھنے کے لئے اہلِ حرم سے منگوایا۔

بچہ پیاسا ضرور تھا اور یقیناً بہت پیاسا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے دشمنوں سے اس کے لئے پانی مانگا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ یہ کبھی نہیں تھا بلکہ صرف آپ بچہ کو گلے سے لگائے ہوئے اُسے رخصت کر رہے تھے۔ مگر بے رحم دشمن

کو کبھی گوارا نہیں ہوا۔

زمین آسمان کانپ گئے۔ انسانیت نے فریاد کی۔ رحمتیں آٹھ آٹھ آنسو روئیں۔

جب حرملہ بن کاہل اسدی نے تیر چلّہ کمان میں جوڑا بچے کی گردن پر لگایا اور بچہ اپنے باپ کے آغوش میں تمام ہو گیا۔

یہ حسینؑ کا آخری ہدیہ تھا جو خدا کی بارگاہ میں اس طرح پیش ہوا اور اب حسینؑ کے لئے صرف اپنی جان کا مرحلہ تھا۔ جس کے طے کرنے کے لئے وہ بہت پہلے سے تیار تھے۔





محمد وصی خاں صدر مرکزی تنظیم عزا (رجسٹرڈ)
نے اپنی تصنیف کردہ کتاب سید العلماء کی
خدمت میں پیش کی جس کو سرکار دیکھ رہے ہیں۔



شہید کربلا کی خاندانی خصوصیات
اور
فداکارانہ روایات

یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ خلیل سے آپ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب آپ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے حضرت سید الشہداءؑ کے نسبی خصوصیات کو آپ کے تعارف کے لئے یہیں سے شروع کرنا مناسب ہے، اور پھر قربانی کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات کو اسلام کا مورث اعلیٰ بھی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ آپ ہی نے اس جماعت کا جو راہ حق میں ان کے پیچھے آئے سب سے پہلے "مسلم" نام رکھا۔ قرآن مجید میں ان کی تصریح موجود ہے۔ ھو سمّاکم المسلمین من قبل اور ان کی دعا بھی بارگاہ الٰہی میں مذکور ہے۔ ربّنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ۔ اسحاقؑ سلسلۂ انبیائے بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ ہیں اور اسمٰعیل ہمارے رسولؐ محمد مصطفےٰ صلعم کے دادا ہیں۔ یہیں سے ہمارے رسولؐ کا خاندان شرافت دوسرے سلسلے سے الگ ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ خاص داخلی اسباب

کے ماتحت حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند اسمٰعیل کو شیر خوارگی کے عالم میں ان کی ماں ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر بٹھا دیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں خانۂ کعبہ ہے اس خانۂ کعبہ کی تعمیر ان ہی باپ بیٹے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے کی۔

خانۂ کعبہ بن کر تیار ہوا۔ اور تمام اطراف ملک کے لوگوں کا نقطۂ اجتماع بن گیا۔ یہاں مرکزیت شروع ہوئی آل ابراہیم کی یہی خانۂ کعبہ کے بانی یہی خانہ کعبہ کے محافظ ــــ اور کعبہ کیا؟ تمام قبائل عرب کا مرکز۔

قدرت نے ان باپ بیٹوں کا امتحان لینا چاہا۔ باپ مامور ہو گیا کہ بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ یہی وہ ہے جس کی یادگار عید قرباں میں آج تک قائم کی جاتی ہے۔

گویا اس سلسلۂ شرافت کا آغاز ہی نفس کی قربانی سے ہوا۔ آگے بڑھے سلسلہ پہنچا نضر بن کنانہ تک، ان کی اولاد قریش کہلائی۔ جس طرح تمام دنیا میں آل ابراہیم کو خاص امتیازات حاصل ہوئے۔ آل ابراہیمؑ میں اولاد اسماعیلؑ خاص خصوصیات کی حامل ہوئی۔ اب اولاد اسماعیل میں قبیلۂ قریش کو امتیازی خصوصیات حاصل ہوئے۔ خانہ کعبہ کی ذمہ داری، اس کی حفاظت سقایت اور تولیت سب قریش سے مخصوص تھیں، تمام عرب ان کی عزت کرتے تھے۔

قریش میں ہاشمؑ پیدا ہوئے جو تمام خصوصیات کے حامل بنے، یہاں سے

بنی امیہ کی شاخ الگ تھی ان کے مورث اعلےٰ نے ہاشمؑ سے منازعت کی، مگر شکست کھائی نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ کعبہ کے حقوق تولیت، سقایت اور تمام انتظامات ہاشمؑ کے پاس رہے اور بنی امیہ اس سے محروم ہو گئے۔ اس طرح آل ہاشم کا امتیاز آل امیہ کے مقابلہ میں تسلیم ہو گیا۔

ہاشم کے فرزند عبدالمطلبؑ بڑی بلند شخصیت رکھتے تھے۔ سید البطحا ان کا خطاب ہوا اور یہی لقب ہے جو انکی اولاد میں رہ گیا۔ جس سے آج تک آل رسول سادات کہلاتے ہیں، ان کا اعتماد، توکل اور خدا پر بھروسہ اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا۔ جب ابرہہ نے یمن سے آکر کعبہ پر حملہ کیا، یہ اصحاب الفیل کا مشہور واقعہ ہے۔ اس وقت عبدالمطلب بارگاہ الٰہی میں دست دعا بلند کئے ہوئے تھے۔ نتیجہ معلوم ہے کہ خدائی لشکر نے اصحاب الفیل کو برباد کر دیا۔ یہ تھے عبدالمطلب جو محافظ حرم بھی تھے اور محافظ حرم ثابت بھی ہوئے۔

عبدالمطلب کے کئی بیٹے تھے، جن میں سے دو عبداللہ اور ابو طالب تھے۔ عبداللہ نے اسمٰعیلؑ کا درجہ حاصل کر کے ذبیح کا لقب لیا یعنی ان کو عبدالمطلب نے رضائے الٰہی کے لئے قربانی کے محل پر پیش کیا تھا۔ اور وہ بھی فدیہ پا کر محفوظ ہوئے۔ مگر ان کا انتقال باپ کے سامنے ہو گیا۔ اس لئے عبدالمطلب کے تمام امتیازات ابو طالب کو حاصل ہوئے، ابو طالب شیخ البطحا اور سردار قریش مشہور ہوئے۔ دیکھئے وہ خصوصیات جو بکھرے ہوئے تھے کس طرح سمٹے آتے ہیں۔ ایک نقطہ پر ابو طالب حامل ہوئے تمام مواریث انبیاء، تمام امانتوں کے جو ابراہیمؑ کی چھوڑی ہوئی تھیں جو اسمٰعیل کی متروکہ تھیں، اور سب سے بڑی امانت وہ رسول کی ذات تھی اس طرح جتنی امانتیں رسول کی ذات سے متعلق سمجھی جا سکتی ہیں ان سب کی حفاظت قدرت کی جانب سے ابو طالبؑ کے متعلق ہوئیں۔ تاریخیں بتلاتی

ہیں کہ ابوطالبؑ نے کس شان سے امانت داری کے فرض کو انجام دیا۔
اب آپ دیکھیں کہ یہ زمینِ شرف کس آسمان پر پہنچی ملے۔ آلِ ابراہیمؑ آلِ اسمٰعیلؑ، نسلِ قریش، آلِ ہاشمؑ کی جتنی عزتیں تھیں وہ ایک مرکز پر طواف کر رہی ہیں ابوطالبؑ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پرورش میں جان کو جان نہ سمجھا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو رسولؐ پر جاں نثاری کی مشق کرائی۔ اُس وقت جب یہ لوگ شعب ابی طالب میں محصور تھے تو اس خیال سے کہ کہیں دشمن شب کو اچانک حملہ کر کے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قتل نہ کر دے۔ ابوطالبؑ آپ کو ایک بستر پر رہنے نہ دیتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو باری باری آپ کے بستر پر لٹاتے تھے اور آپ کو ان کے بستر پر منتقل کر دیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محمدؐ کے بدلے جو بھی میرا فرزند قتل ہو جائے کوئی پرواہ نہیں! مگر رسول کی جان بچ جائے۔ اس ذوقِ قربانی کو بھی یاد رکھئے گا۔ یہ بھی کس کی خاطر ہے چاہے کہئے محمدؐ کی خاطر اور چاہے کہئے اسلام کی خاطر!
ابوطالبؑ کی آغوش میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کی جب تربیت ہو رہی تھی۔ ابھی آپ کی عمر نوجوانی ہی کی منزل میں تھی کہ آپ کی سچائی اور امانت داری کو تمام عربوں نے تسلیم کر لیا اور آپ کو صادق اور امین کا لقب دیا یہاں تک کہ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کیں، اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابلِ قبول سمجھا۔ خانہ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجرِ اسود کے رکھے جانے کا قصہ مشہور رہے۔
محمد مصطفیٰؐ کی عمر ۳۰ برس کی تھی اس وقت ابوطالبؑ کے یہاں وہ فرزند پیدا ہوا جس کا نام تھا علیؑ۔! محمد مصطفیٰؐ نے علیؑ کی پرورش اپنے متعلق کر لی۔ اب علیؑ محمدؐ کے آغوشِ تربیت میں تھے۔ وہ دس برس کے تھے جب حضرت محمد مصطفیٰؐ اس پیغام کے پہنچانے پر مامور ہوئے جس کا نام ہے اسلام! یہ پوچھنا صورتِ واقعہ کے لحاظ سے اصولِ فطرت

کے خلاف ہے کہ علیؑ نے اس پیغام کو کب قبول کیا؟ وہ رسولؐ کے ہر وقت ساتھ تھے اور آپ ہی کی تربیت میں تھے اس لئے ہر ہر وقت جو رسول کا راستہ تھا وہ علیؑ کا تھا۔ عمر کے لحاظ سے ابھی علی بچہ ہی تھے۔ اور تربیت سے بے نیاز نہیں تھے۔ اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ رسول کی آغوش میں دو چیزیں پرورش پا رہی تھیں ایک اسلام اور دوسرے علیؑ۔ علیؑ اور اسلام میں وہی وابستگی تھی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچوں میں آپس میں ہوتی ہے۔

رسولؐ کو اپنے پیغام کی اشاعت میں بڑی تکلیفیں دی گئیں۔ کوڑا کرکٹ سر پر پھینکا گیا، پتھروں سے جسم مجروح کیا گیا۔ ان سب کو آپ نے گوارہ کیا۔ کاہے کے لئے اسلام کی خاطر۔ آخر یہاں سب آپ کے قتل پر آمادہ ہو گئے اور ایکا ہو گیا کہ رات کے وقت آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔ رسولؐ نے طے کر لیا کہ وہ اپنے مقاصد کی حفاظت کے لئے مکہ معظمہ کی سرزمین کو چھوڑ دیں اور مخفی طور سے رات کے وقت نکلکر مدینہ چلے جائیں۔ اسی کا نام ہے ہجرت۔! اس موقعہ پر آپ نے اپنے چچازاد بھائی علی بن ابی طالب کو مقرر کیا کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں۔ علیؑ بستر رسول پر سو رہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ کھینچی ہوئی تلواریں دشمنوں کی اردگرد موجود تھیں۔ سب قتل ہی کے ارادے سے آئے تھے، یہ تو اتفاق کی بات ہے اور قدرت کا انتظام ہے کہ علیؑ کی جان بچ گئی ورنہ سامان قتل مکمل تھا اور علیؑ اپنی جان دے چکے تھے۔ یہ کس کی خاطر۔! رسول کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ۔ جنھیں آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال آپ نے اس بیٹی کا عقد علی بن ابی طالب کے ساتھ کر دیا۔ اب آپ جانتے ہیں فاطمہؑ کون ہیں؟ دختر داعیٔ اسلام، دختر پیغمبر اسلام، اور علیؑ کون ہیں؟ محافظ اسلام، مجاہد اسلام

فدیۂ اسلام! ان ہی دونوں علیؑ اور فاطمہؑ کے فرزند تھے حسینؑ! اب کیا حسینؑ بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟ حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے تو سنتے رہے کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لئے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے ہمارے پردادا عبدالمطلبؑ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربان گاہ عبودیت میں پیش کیا۔ حسینؑ نے سنا کہ پیغمبر اسلام کے سینہ سپر رہے۔ میرے دادا ابوطالب پھر اسی اسلام کے لئے پتھر کھائے، میرے نانا رسول اللہ نے! حسینؑ نے سنا کہ جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ پیش تھا تو تلواروں کے حصار میں بستر پر کون لیٹا تھا۔ میرے باپ علیؑ ابن ابی طالبؑ، پھر ہر سخت موقع پر اسلام کے لئے جہاد کس نے کیا۔؟ علیؑ بن ابی طالبؑ نے۔!

کیا ان تمام واقعات اور قدیم روایات کے ہوتے ہوئے حسینؑ یہ نہ سوچتے کہ اب اسلام پر وقت پڑا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیئے۔؟

بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں تو ان میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم بھی ایسا ہی کر کے دکھائیں۔ حسینؑ بچپن سے ولولہ رکھتے تھے، منتظر تھے اور مشتاق تھے کہ اسلام کی خدمت کا موقع آئے تو میں بھی اسے کر کے دکھاؤں۔ آیا وقت ۶۱ھ میں حسینؑ کو اس اسلام کی خاطر وہ سب کچھ نذر کر دینا پڑا جو ان کے پاس سرمایہ تھا۔ انھوں نے اتنی بڑی قربانی پیش کر دی جس کی نظیر نہ اس کے پہلے نظر آتی ہے، اور نہ اس کے بعد!

● آج جبکہ اسلام کو بڑی ضرورت قربانی کی ہے اس یادگار کا قائم کرنا مسلمانوں کے لئے حیات بخش ہے دیکھنا ہے مسلمان اپنے اس فرض کو کس طرح انجام دیتے ہیں۔

(بحوالہ اشاعت امامیہ مشن پاکستان لاہور) ص۱۱۲



امام بارگاہ اُم البنین حسن کالونی کی رسم تنصیب سنگ





حسینؑ اور اسلام

حسینؑ تاریخی دُنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کی شخصیت اور عظیم کارنامے کروڑوں افراد کے سر عقیدت کو خم کئے ہوئے ہیں۔ کسی نے ممکن ہے کہ اُن کے عظیم کارنامۂ زندگی کے مطالعہ اور اُن کے حیرت انگیز ثبات قدم اور استقلال و تدبر سے بھرے ہوئے بے مثال اقدام قربانی کے حالات پر اطلاع حاصل کرنے کا موقع نہ پایا ہو لیکن کم سے کم اس نے حسینؑ کا نام ضرور سنا ہوگا۔ اور اتنا ضرور جانتا ہوگا کہ وہ کسی بڑے تاریخی واقعہ کا مرکز ہیں۔ ممکن ہے یہ خیال کبھی اس کے دل میں کبھی آتا ہو کہ یہ حسینؑ کون تھے اور آخر اس واقعہ کے خصوصیات کیا ہیں جو اس بڑے انسان کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اچھا تو پھر آیئے اور صبر و سکون کے چند لمحے مجھ کو عاریتاً دیجئے۔

میں آپ کو حسینؑ اور اُن کے مشن سے جس کے سلسلہ میں انھوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے میں دریغ نہیں کیا مختصر لفظوں میں سنا سکوں تاکہ جس سے آپ کو حسینؑ اور اُن کے اقدامات کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔

حسینؑ کون تھے؟

حسینؑ کے ساتھ اسلام کا روحانی تعلق:-

ساتویں صدی عیسوی میں جبکہ دُنیا تاریکی کے عظیم دور سے

گزر رہی تھی اور انسانی تمدن کی کشتی تفرقہ اور فساد کے طوفان سے ڈانواڈول تھی جزیرہ نمائے عرب سے اسلام کا آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کے مرکزی مقام مکۂ معظمہ سے ظاہر ہوئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ اس کی روشنی شرق و غرب عالم پر چھا گئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔

یہ ہر دلعزیز اور عالمگیر مذہب جس کا نام ہے اسلام، اپنے ابتدائی دور میں ترقی و اشاعت کی حیثیت سے دو عظیم شخصیتوں کی جانفشانی اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ایک پیغمبر اسلام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے اُن کے چچا زاد بھائی علیؑ ابن ابی طالب۔!

اگرچہ دوسرے بہت سے صحابۂ رسولؐ نے جو خدمات انجام دی ہیں اور جاں نثاری و فداکاری کے فرض کو ادا کیا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں،

لیکن حقیقتًا ان ہی دو بزرگوں کے ثبات قدم حیرتناک استقلال اور اپنے خون کو پسینہ سمجھ لینے کا اثر تھا کہ اسلام کی بنیادیں قائم ہوئیں اور حیرتناک تیزی کے ساتھ اس کی اشاعت ہوئی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کے اتحاد کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا تھا، حضرت رسول اکرمؐ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے ساتھ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کا عقد ہوا۔ اور اس طرح علیؑ کو بھائی ہونے کے علاوہ ایک قسم کی فرزندی بھی رسولؐ سے حاصل ہو گئی۔ اور یہ دونوں سلسلے کہ جو اشاعت میں متحد تھے اور زیادہ استحکام کے ساتھ ایک نقطہ پر

جمع ہو گئے۔

ان ہی ماں باپ حضرت فاطمہؑ اور علی ابن ابی طالبؑ سے دو بچے متولد ہوئے جن کا نام تھا حسنؑ اور حسینؑ اور عین اس وقت جب اسلام ایک نو عمر بچہ کی حیثیت سے رسول اسلام کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا ان دونوں بچوں کی ولادت ہوئی جن کی پرورش بھی رسولؐ کی آغوش میں شروع ہوئی اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت ایک قرار پایا۔ ایک طرف نانا کہ جو بانیٔ اسلام تھے اور کارگزاریاں سامنے تھیں اور اس ماحول کے باعث اسلام کے ساتھ روحانی تعلق اور دلی ارتباط ان دونوں بچوں میں بچپنے ہی سے راسخ ہو گیا اور جتنی عمر بڑھتی گئی اُلفت اسلام کا جذبہ مستحکم تر ہوتا گیا۔

مذہبی عقائد سے جن کی بناء پر یہ دونوں بزرگ (حسنؑ و حسینؑ) امام خلق اور حقیقی ذمہ دار اسلام قرار پاتے ہیں۔ بالکل الگ ہو کر تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی زندگی پابندیٔ شریعت اور حفظانِ اصول مذہب کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کا مکمل آئینہ اور احکام شریعت کا مجسّم نمونہ تھی اور اس لئے بھی اسلام اور شریعت اسلام کے ساتھ جتنی گہری ہمدردی ان کو ہو سکتی تھی کسی کو نہیں۔

بنی اُمیّہ کا دورِ حکومت

یا

تاریخ کا ایک سیاہ ورق

پیغمبر اسلام کی وفات اسلام کے لئے ایک سخت ترین مصیبت

تھی جس کے بعد ہی سے اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے شروع شروع میں کچھ عرصہ تک اس کی سادگی اور حقیقت پروری ظاہری جاہ و عزت سے بے تعلقی اور مادی ساز و سامان سے کنارہ کشی ایک حد تک محفوظ تھی لیکن ادھر فتوحات نے ترقی کی قیصر و کسریٰ کے ممالک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ شاہانہ تزک و احتشام اور سلطنتی جاہ و جلال سے آنکھیں دو چار ہوئیں۔ ادھر اسلامی افراد میں بھی کشور آرائی اور جہانبانی کے جذبات نے پرورش پائی اور مذہبی پابندیوں کے بجائے سیاسی منصوبہ بازیوں اور رکھ رکھاؤ کے مقابلہ میں جابرانہ طاقتوں کے مظاہرہ کا دور دورہ ہو گیا۔

رسولؐ اور ان کے خاندان (بنی ہاشم) کے قدیمی حریف بنی اُمیّہ کو جو برابر رسولؐ سے اشاعت اسلام کے خلاف اپنی طاقت کے آخری نفس تک جنگ کرتے رہے۔ اور سب سے آخر میں اُمید کے تمام رشتے منقطع ہو جانے کے بعد بادل ناخواستہ اسلام لائے تھے، ان انقلابات میں اپنے منصوبوں کے پورا کرنے کا اچھا موقع ملا۔

خلیفۂ ثانی (حضرت عمر بن الخطاب) ہی کے دور میں شام پر ان کا تسلط ہو گیا تھا۔ جو صرف گورنری کی حیثیت سے تھا لیکن قدم جمانے کے لئے بہت کافی تھا۔

تیسرے دور میں اتفاقات روزگار سے مرکزی حکومت یعنی خلافت کا سہرا بھی بنی اُمیّہ کے سر پر بندھا اور اس گروہ کو اسلام کے ساتھ اپنے دیرینہ منصوبوں کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

خلیفۂ ثالث کے ساتھ حسن ظن رکھنے والا شاید یہ کہے گا کہ صاف و سادہ لوح خلیفۂ وقت کو اپنے خاندانی افراد کے اغراض و مقاصد اور ان کے اطوار و حالات کی اطلاع نہ تھی لیکن یہ مسلّمہ حقیقت

ہے کہ اس عہد میں صحابۂ رسولؐ اور سچے اسلامی فرزندوں کے ساتھ انتہائی شرمناک برتاؤ اختیار کئے گئے اور ایذا رسانی کی بہتات ہوئی اور ان کے بدترین مظالم کی حکایت انتہا تک پہنچ گئی جس کے بعد پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ اور مظالم کو برداشت کرتے کرتے صبر کے پیمانے لبریز ہو گئے جس کا براہ راست نتیجہ قتل خلیفہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاریخ کے مطالعہ سے اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنی امیہؓ کے سر دکھائی دیتی ہے۔

اس کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور تمام جماعت صحابہ نے بھی جو اہل حل و عقد سمجھی جاتی تھی حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور سب نے باتفاق آپ کی بیعت کی لیکن شام کے گورنر معاویہ بن ابی سفیان جو وہاں پورے طور پر قبضہ جما چکے تھے اس متفقہ فیصلہ کے سامنے سرنگوں نہ ہونا تھے نہ ہوئے اور انتقام خون عثمان کے بہانے سے علیؓ بن ابی طالبؓ سے برسرپیکار ہوئے چنانچہ جنگ صفین کے سیکڑوں معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ لیا اسی کا کرشمہ تھے۔

آخر اس جنگ کا فیصلہ ایک مکارانہ مصالحت کے ساتھ ہوا جس میں اگر دیانت و امانت کا جوہر کارفرما ہوتا تو یقیناً مسلمانوں کے درمیان سے ناگوار اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا تھا لیکن افسوس کہ حرص و آز کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اس ظاہری مصالحت کو فتنہ و فساد کا پیش خیمہ قرار دے دیا اور اختلاف و افتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئی۔

یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی امیہؓ کے قدم پوری طاقت کے ساتھ جم گئے تھے۔ اُدھر امیر المومنین علیؑ کو مسجد کوفہ میں شہید کیا گیا ادھر شام میں مخالفت اہل بیت کا طوفان پوری قوت پر بلند ہو گیا اور دمشق بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے منبروں پر کمال جرات کے ساتھ اہل بیت رسولؐ پر لعن و طعن کا بازار گرم ہو گیا۔

اُس زمانہ کے بعض اہم خصوصیات

معاویہ اگرچہ صحابۂ رسول کے ایک فرد سمجھے جاتے ہیں لیکن اُن کے دورِ حکومت کے یہ افسوسناک خصوصیات ہیں جو اسلامی تاریخ میں جلی حرفوں سے مرقوم نظر آتے ہیں اور اُن سے اِس زمانہ میں اسلام کے ضعف و کس مپرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) وضع احادیث اور خدا و رسول پر افترا و بہتان کوئی جرم نہ رہا بلکہ اس پر مخصوص مصالح کے تحت میں جائزہ و انعام دیا جاتا تھا چنانچہ ابو الحسن علی بن محمد مدائنی نے جو اسلامی مؤرخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے، کتاب الاحداث میں اُس زمانہ کے حالات درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اُس کا پورا نام مع پتہ کے میرے پاس بھیجدو اور پوری طرح جائزہ و انعام سے اُس کو مالا مال کر دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلتِ عثمان میں احادیث کثرت سے ہو گئے اور ایک مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔"

پھر گورنروں کو لکھا گیا کہ

"عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اب تمام دیگر صحابہ کے فضائل میں روایتِ احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابو تراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اُس کے مقابل دوسرے صحابہ کے لئے بھی بیان کرو۔ علیؑ اور اُن کے شیعوں کی دلیل کے باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔"

بس پھر کیا تھا، فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سیکڑوں حدیثیں صحابۂ کبار کے مناقب میں تصنیف ہو گئیں جن کی کچھ اصلیت نہ تھی۔ وہ واعظین اُن کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں، عورتوں اور غلاموں کنیزوں تک کو یاد کرانا ضروری سمجھتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط ہو کر بے اعتبار بن گئے اور علمی تحقیق و تدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب و شتم اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل آیا دمشق و شام کے منبروں پر چالیس برس تک یہ رسم ادا ہوتی رہی اور علیؑ بن ابی طالب کی نسبت اس جسارت کا سلسلہ قائم رہا۔

(۳) بلاد اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کے ساتھ استعمال کی جانے لگی اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمٰن بن سہل انصاری (صحابی رسولؐ) نے شراب کے بارے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے نیزہ کی نوک سے اُن مشکوں کو پھاڑ ڈالا۔ معاویہؓ کو معلوم ہوا تو کہا اُس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمٰن نے سُنا تو کہا "خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالت مآبؐ نے ممانعت فرمائی ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا برتنوں میں رکھی جائے" (دیکھو کتاب اسدالغابہ، ابن اثیر جزری ج ۳ صفحہ ۲۹۹ و اصابہ حافظ ابن حجر عسقلانی ج ۲ صفحہ ۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں میں بہت خوبی سے ہو گئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرتا تھا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا۔

(۴) بے گناہ مسلمانوں کا خون بہت بے دردی سے بہایا جانے لگا، سیکڑوں کلمہ گویوں کی گردنیں زیر تیغ ہو گئیں، سمرۃ بن جندب اور بسر بن ارطاۃ اور زیاد بن ابیہ کی سیاہ کاریاں اسی عہد کا نامۂ عمل ہیں۔

عبداللہ بن عباس کے دو کمسن بچے ماں کی گود میں ذبح کر دیئے گئے جس سے وہ مجنون ہو گئیں۔ (ملاحظہ ہو استیعاب ابن عبدالبر مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد اول صفحہ ۶۶)

(۵) مذہب کا وقار بالکل کم ہو رہا تھا اور بڑے سے بڑے ارکانِ مذہبی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

معاویہؓ نے بڑے فخر سے جاریہ بن قدامہ اور احنف دو شخصوں کی نسبت کہا کہ "میں نے اُن سے اُن کا مذہب مول لے لیا ہے"۔ (استیعاب ج ۱ صفحہ ۱۵۲)

مصر کے لوگوں نے دربار میں آ کر السلام علیکم یا رسول اللہ کہا اور اس کو گوارا کر لیا گیا، سزا دینا تو بڑی بات تھی معمولی سی زبانی تنبیہہ بھی نہ کی گئی (ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج صفحہ ۱۸۴)

ان دونوں واقعوں کو ہم نے اپنے رسالہ "قاتلانِ حسینؑ کا مذہب" میں تفصیل سے لکھا ہے جن سے اُس وقت کے اسلامی احساسات و جذبات کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

بہر حال معاویہؓ کا زمانہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور اُنھوں نے اپنی عمر گزار دی مگر مسلمانوں کے سر پر ظلم و ستم کے ایسے دیوتا کو سوار کر گئے جس نے اسلام کے شیرازہ کو بالکل درہم برہم کر دیا یزید کے اخلاق و عادات سے معاویہؓ بے خبر تھے؟ نہیں ہرگز نہیں یزید کے خصوصیات سے واقف تھے اور اُس کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر مکی اپنی کتاب "تطہیر اللسان والجنان" میں جو اُنھوں نے معاویہؓ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے لکھتے ہیں کہ

"ایک روز امیر معاویہؓ رونے لگے، مروان نے کہا کہ کیوں کیا ہوا؟ آپ کے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ

"دنیا میں کون راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب سن زیادہ ہو گیا، ہڈیاں گھل گئیں، جسم کمزور ہو گیا۔ لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لئے راہِ راست

کو حاصل کر لیتا۔" (حاشیہ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۵۶)

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں۔

"ان الفاظ میں معاویہؓ نے پورے طور پر اقرار کر لیا ہے کہ یزید لعنہ کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوا۔"

(حاشیہ صواعق محرقہ صفحہ ۵۸)

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر شام اپنے بیٹے یزید لعین کے افعال و عادات سے بے خبر تھے اور اس کی ولی عہدی نیک نیتی پر مبنی تھی، یزید کی بیعت مسلمانوں سے زبردستی لی گئی۔ اور زر و جواہر کے خزانے اس کے لئے وقف کر دیئے گئے یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا اور اس کے فسق و فجور نے دنیا کو یہ کہہ دیا ہر طرف معصیت خدا اور مخالف شریعت کا بازار گرم ہوا، مذہب بازیچۂ اطفال اور اسلام زینت طاق نسیاں بن گیا یزید کے افعال و عادات کے تفصیلی تذکرہ سے ان صفحات کو پر نہیں کیا جا سکتا، اسلام کی مستند تاریخیں ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ واقدی نے مختصر الفاظ میں جس طرح یزید کی بدکرداری کی تصویر کھینچی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"وہ ایسا شخص تھا کہ اپنے باپ کی منکوحہ کنیزوں اور اپنی بہنوں، بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا، شراب پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا۔" (ملاحظہ ہو صواعق محرقہ، علامہ ابن حجر مکی صفحہ ۱۳۵)

اب بتایئے کہ کیا اسلامی بادشاہ یا خلیفۃ المسلمین اور مجوسیوں میں کچھ بھی فرق ہوا؟ اکثر بڑے فاسق اشخاص بھی اپنی ماں، بہنوں بیٹیوں سے مقاربت کرنا حمیت و غیرت اور انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بادشاہ وقت کے ان عادات و اخلاق کو دیکھ کر دنیا نے رنگ پکڑ لیا تھا

اور مذہبیت بالکل فنا ہو گئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ سر تسلیم خم کئے ہوئے تھے اور کسی کے ذہن سے صدائے اعتراض بلند نہ ہوئی تھی۔ سوائے پانچ شخصوں کے تمام صحابہ و تابعین یزید کو خلیفۂ رسول تسلیم کر چکے تھے، ان پانچ میں سب سے پہلا نام حسینؑ بن علی کا ہے اور آپ کی دیکھا دیکھی عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عباس ہیں

یزیدیوں کی طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنایا جائے سب سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کے لئے اہتمام کیا گیا۔

گذشتہ تاریخ اور اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ علیؑ بن ابی طالب کا فرزند اور خاندان رسول کا سب سے بزرگ شخص اگر ان حالات کی موجودگی میں یزید کی بیعت کر لیتا تو اسلام کا نام بھی باقی نہ رہ سکتا۔

حسنؑ مجتبیٰ کی صلح مجاہدۂ کربلا کی تمہید تھی

ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید نتیجہ خیز اور موثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ نتیجۃً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو اکثر ہمیشہ کے لئے مورد الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور اُن کا طریقۂ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوجاتا ہے۔ عالم کا نظام اسی پر ہونا قرار پایا ہے اس میں تغیر و تبدل کا امکان نہیں۔!

زخم رسیدہ پکے ہوئے جزو بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو۔ پھاہے لگاؤ، مرہم بدلو۔ ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلواؤ۔ پھر اگر اچھا نہ ہو اور

اُس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اُسے کاٹ کر پھینک دو کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی یا کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالے تو ضرور مورد الزام اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ یہ طرز عمل وہی تھا جو بعد میں اختیار کئے جانے پر ممدوح و مستحسن سمجھا جا رہا تھا دشوار گزار حالات کی اصلاح کے لئے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور موثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری جب تمام وسائل و ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اُس وقت اُس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک ممدوح ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آ گئی تو اُس پر جلد بازی غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اس کو حق بجانب نہیں سمجھا جا سکتا اور اسی کے ساتھ اُس کی کامیابی اور تاثیر رخصت! حالات کی اصلاح کے لئے احتجاج و استغاثہ مصالحت و رواداری شرط و شروط اور قرارداد معاہدہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔

بے شک جب یہ سب وسائل و ذرائع اختیار کئے جانے کے بعد ناکام ثابت ہوں تو پھر "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے مطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہو سکے گا۔ اور اس کی رفتار اقدام عمل میں جبتک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا مغضوب الغضب کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع و اسباب کے ذریعے سے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لئے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری و جاں نثاری اور موثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال و اعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا اور اپنی کارگزاری میں صرف جذبات کا فرمانبردار نہیں بلکہ عقلی غور و تدبر کا پابند ہے تو اُسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔

شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بیشک مذہب خطرہ میں تھا اور حق و صداقت پامال ہو رہے تھے جس کی اصلاح کے لئے قربانی درکار تھی۔ لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لئے دوسرے پُر امن اور صلح پسند وسائل و ذرائع کے صرف کئے جانے کی ضرورت تھی۔ بے شک اگر امام حسینؑ ایکا ایکی بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدان اخوان و انصار مخالفت پر جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا، تیار ہو جاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امام نے اتحاد عمل کے ساتھ حالات کی درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا۔؟ کم سے کم امور سلطنت سے بے تعلقی اختیار کر کے مدینۂ رسول میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آکر اپنے کو معرض خطرے میں کس لئے ڈالا؟

یہ سوالات پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقیناً آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لئے نہ قابل ستائش ہوتا اور نہ مؤثر و کامیاب لیکن واقعہ یہ تھا کہ امام حسین کا اقدام عمل یا قربانی ایک مکمل نظام کے تحت واقع ہوا تھا جس کے لئے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لا رہے تھے یہاں تک کہ سنہ ۶۱ھ میں اس کا وقت آگیا۔

شروع شروع میں امام حسنؑ کا صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر دس برس

خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا روبہ اصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کا ٹھکرا دیا جانا، صلحنامہ کے دفعات کا پامال ہو جانا، زبانی احتجاج و استغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلے میں پانی کا سر سے اونچا ہو جانا اور معاملات کا حد سے گذر جانا وہ تھا جس نے امام حسینؑ کے لئے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کرا دیا تھا کہ جو انھوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

یہ اعتراض تاریخی حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہو گا کہ امام حسینؑ نے خود اپنی جان کو معرض خطرہ میں ڈالا۔ اگر وہ مدینے میں قیام کرتے اور یزید سے برسرپرخاش نہ ہوتے تو آپ کا خون کربلا کی زمین پر نہ بہتا۔

یہ خیال بالکل بے حقیقت ہے۔ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم اور خصوصاً علیؑ بن ابی طالب کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتے تھے اور انکی خاموش ہستی بھی ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی۔ حسنؑ مجتبےٰ نے باوجود صلح جوئی اور خاموشی و کنارہ کشی کے کیا پھل پایا؟ یہ کہ زہر قاتل کے اثر سے کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے اور دشمنوں کی ظلم و بیداد کا خاموش افسانہ سناتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی اپنی کتاب یزید نامہ صفحہ ۸۳ میں لکھتے ہیں:۔

"پہلا خون سیدنا حضرت امام حسنؑ کا ہے جو تاریخ کی روایت سے قطعاً امیر معاویہؓ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی قدیم و جدید محاکمہ تاریخی و قانونی ان کی بریت اس قتل سے نہیں کر سکتا۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسینؑ عراق میں نہ آتے اور مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کے لئے کوئی ایسا ہی خاموش حربہ استعمال نہ کر دیا جاتا جس طرح امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا۔

اس وقت آپ کی جان بھی جاتی اور افرادِ بشر کے سامنے حقیقت کے واضح ہونے کا بھی کوئی طریقہ نہ رہتا بلکہ جس طرح اس سے پہلے امام حسنؑ کی شہادت سے انکار کیا جاتا رہا اسی طرح حضرت کی شہادت سے بھی انکار کرنا ضروری خیال کیا جاتا اور یہ یقیناً یزید لعین کی فتح اور حسینؑ کی شکست قرار پا سکتی تھی کیونکہ اس حالت میں اول الذکر نے اپنے مقصد کو حاصل کیا۔ حسینؑ کے وجود کو دنیا سے محو کر دیا اور پھر عالم کے سامنے اپنے کو بری بھی ثابت کر دیا۔ اور حسینؑ اپنی جان سے ہاتھ دھوتے اور کوئی نتیجہ خیز اثر بھی دنیا میں نہ چھوڑتے بھلا حسینؑ سے محیر العقول تدبر و استقلال کی مالک ہستی سے کب توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس پہلو پر متوجہ نہ ہوئے حسینؑ نے اپنے معاملہ کو دو مختلف صورتوں میں منحصر پایا۔ ایک یہ کہ خاموش طریقہ پر اپنی جان سے ہاتھ دھوئیں اور دین اسلام اور شریعت نبویہ بھی یزید کے افعال و اقوال سے محو ہو کر رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی ہستی کو ظاہری صورت میں دستِ فنا کے سپرد کر کے ہمیشہ کے واسطے اپنی اور اپنے نانا کی تحریک کو زندہ کر کے اسلام کا ایک پائیدار نقش چھوڑ دیں، فرزند رسولؐ نے اپنے عظیم تدبر و عاقبت اندیشی سے کام لے کہ دوسری صورت کو ترجیح دی اور اسلام کو زندہ کرنے کے ساتھ موت کو اپنے اور اسلام دونوں کی بقا کے مقابلہ میں اختیار کیا۔ حسینؑ نے اپنی جان دے کر اپنے مخالفین کے مفاد کو ہمیشہ کے لئے پامال کر دیا اور یہی وہ عظیم فتح ہے جس کو حضرت نے ظاہری صورت میں فنا ہو کر حاصل کیا۔

حسینؑ کا اقدام عمل خالص تبلیغی شاہکار تھا

اور

تدبر و سیاست کا بہترین نمونہ تھا

امام حسینؑ درحقیقت مدینہ سے اس بات کا بیڑہ اٹھا کر نکلے تھے کہ دُنیا کے سامنے حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیں چنانچہ آپ نے اپنے مقصد کی اشاعت اور یزید کے ننگ انسانیت افعال کو طشت ازبام کرنے میں وہ تمام وسائل و ذرائع اختیار کئے جو آپ کے عظیم تدبر و سیاست کا پتہ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ حسینؑ نے مدینۂ رسولؐ چھوڑنے کے بعد مکہ معظمہ کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا۔ مکہ معظمہ کا قیام سطحی نظروں میں تو اس غرض کیلئے تھا کہ اس مقام مقدس میں خونریزی حرام ہے۔ لہٰذا آپ کی زندگی دشمنوں کے خطرہ سے محفوظ رہے گی یہ نقطۂ نظر ایسے شخص کے لئے تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کو آخر تک اپنی جان بچانا منظور ہو مگر حسینؑ کو جو مرنے پر کمر باندھ کر چلے تھے اور پورے طور سے آخر تک کے رونما ہونے والے واقعات پیش نظر رکھتے تھے جس کو برابر الفاظ میں تبلاتے بھی رہتے تھے ان کی نسبت اس خیال کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ قلب جزیرۃ العرب اور عالم اسلام کا مرکز تھا اطراف و جوانب کے قافلے برابر آتے رہتے تھے اور علاوہ فریضۂ حج

جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت اشہر حج میں چاروں طرف سے مختلف قبائل عرب کا آنا ضروری ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ عملدرآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے کبھی جس کو باطل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی عرب کے اس خطے کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا لازمی تھا۔ وہ مشہور کانفرنسیں جو شعر و سخن اور خرید و فروخت کے لئے قائم ہوتی تھیں جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے۔ ذی القعدہ سے لے کر محرم تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔

امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی، اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسینؑ کو ان کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسولؐ کا نواسا، سلطان حجاز و عراق کا فرزند، ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی و جواد جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کا بزرگ خاندان، یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا اور کسی کو ان کے انکار کی جرات نہیں ہو سکتی تھی

حضرت امام حسینؑ نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا مکے میں اپنے قیام کے لئے تجویز کیا ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ حسینؑ اپنے لئے کوئی جماعت جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ روابط بڑھا کر اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلے کا خیال رکھتے تھے، نہیں ہرگز نہیں، اگر آپ ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور وہ مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ اس میں کامیابی نہ ہوتی۔ یمن بالکل نزدیک تھا جس کا اسلام علیؑ بن ابی طالبؑ کا رہین منت تھا اور اس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو علیؑ ابن ابی طالب اور

اور اُن کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی۔
طائف بھی کچھ اولادِ رسولؐ کا مخالف نہ تھا لیکن فرزندِ رسولؐ کو عالمگیری اور جہانبانی کا شوق نہ تھا، وہ اپنے کو ایک عظیم الشان بادشاہ تسلیم کرانے کی ہوس نہ رکھتے تھے۔ آپ کا قیام مکۂ معظمہ میں صرف اس لئے تھا کہ جمہورِ عرب کے اندر صورتِ حالات کی طرف ایک توجہ پیدا ہو جائے اور یزید کے افعال و اعمال کا چرچا ہونے لگے۔
حسینؑ کے قتل کے لئے حجاج کے لباس میں شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا حضرت کے پابہ زنجیر کر لیے جانے کا سامان کیا گیا ہو بہر حال نامعلوم اسباب و علل کے ماتحت امام کا بیت الحرام سے رخصت ہونا اور زمانۂ حج کے گزرنے کا انتظار بھی نہ کرنا اس کو امام کے تبلیغی مقصد میں پورا دخل ہے۔
ایسی ایکا خلافِ توقع حسینؑ کا حج کو ترک کر دینا اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکۂ معظمہ سے نکل کھڑا ہونا ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائلِ عرب کے نمائندوں میں ایک لہر دوڑا دی اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی قلمبند کی گئی ہوتی تو اُس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔!
"حسینؑ بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ اور تمام اہل و عیال و اقربا کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟ (یزید کے خوف سے) کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟ (حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے) لا حول ولا قوۃ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ فرزندِ رسولؐ ــــ اور ــــ یزید جیسے شراب خوار اور زناکار فاسق و فاجر کی بیعت کرے۔! ــــ اچھا پھر مکۂ معظمہ میں کیوں

قیام نہ کیا؟ کس لئے حج کو بھی ترک کر دیا؟ جان کا خطرہ تھا، شاید
مکے میں حسینؑ کے قتل کرنے کے لئے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے
توبہ! توبہ!۔۔۔ اس سے بڑھ کر سفاکی و ظلم کیا ہو گا کہ فرزندِ رسولؐ کو
حرم میں بھی چین نہ لینے دیا جائے؟

یہ تذکرے نہ ہوں گے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب
میں اکثر با خبر حلقوں میں بہت اہمیت کے ساتھ جاری تھے۔

وہ زمانہ کہ جب طریق مراسلت و مخابرت مسدود تھے۔ تار، ٹیلیفون
وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ واقعات کی
اشاعت کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مکے سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے
جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ
کے نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا اس
کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ امام کے لئے کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے لیکن مطلب
صرف اتنا تھا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے کے سبب آپ
کی شہادت عام طور سے نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہ پائے جس
اہل شام کو اپنے دل سے اس کے لئے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے
اور حسینؑ کی مظلومیت و حقانیت مخفی ہو جائے۔ یقیناً اگر امام کی طرف سے
ان طریق نشر و اشاعت کو عمل میں نہ لایا جاتا تو یزید کی طرف سے امام کی
شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسینؑ کا
خون رائیگاں چلا جاتا۔ بایں معنی کہ آپ اپنی جان بھی ہاتھ سے کھوتے
اور کوئی ہمدردی بھی افرادِ بشر کے قلوب میں چھوڑ کر نہ جاتے اور
نہ وہ مقصود جو آپ کا تھا حاصل ہوتا مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ امام
شہید ہوئے اور تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آپ ناحق شہید
کئے گئے، شام کا حاکم اور اس کے دشمنِ انسانیت وزراء اور ساتھی کسی

تہمت تراشنے کا موقع بھی نہ پا سکے اسے خداوند عالم کی قوت قاہرہ کے بعد حسینؑ کے تدبر سے تعلق ہے اور وہ اسباب وعلل شہادت کے نشر و اشاعت کا نتیجہ تھا۔ حسینؑ نے اپنی نقل و حرکت کے ذریعہ کو زندگی ہی سے عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سر تسلیم کو خم کرا لیا اور اس سے بڑھ کر حقانیت کی تبلیغ کیا ہو سکتی ہے۔؟

حسینؑ کا قافلہ خاموش مبلغ تھا

حج کا زمانہ تھا۔ عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے، ادھر امام حسینؑ اپنے اہل و عیال، اقربا اور انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لئے ایک بڑے قافلے کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے، عام مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستہ میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ پھر کہاں امام حسینؑ کا شاندار قافلہ اور اصحاب و اعوان کا مختصر لشکر۔ اس پر طرہ یہ کہ حج کو دو دن باقی رہے۔ مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا تھا۔ جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لئے متوجہ ہے!

یہ موجودہ یقیناً جاذب نظر اور جالب توجہ ہے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کئے ہیں۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں۔

فرزدق سے ملاقات امام کی یوں ہی اتفاقی طور پر ہوئی تھی اور عبداللہ

بن مطیع و عمر بن عبدالرحمٰن مخزومی بھی راستے میں خلاف توقع امام سے دوچار ہو گئے اور پھر جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسینؑ بن علیؑ اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعی حق تھا جو دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور کشف حقائق پر مجبور کر دیتا تھا۔

کربلا کی سرزمین پر تبلیغ

راستے کے تمام اہم واقعات کو چھوڑتے ہوئے امام کی اس عظیم الشان تبلیغ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کربلا کی سرزمین پر حسینؑ سے ظاہر ہوئی وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام پر راستہ بند کر دیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین و مذہب بلکہ انسانیت و غیرت کو خیرباد کہہ کر فرزند رسولؐ کے قتل پر کمر باندھی تھی ان کا گمراہی سے باز آنا ناممکن تھا اور حسینؑ اس بات سے واقف تھے لیکن ایک مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کی آواز کو بلند کرے اور تبلیغ دعوت میں کوتاہی نہ کرے۔ اور اس غرض کو امام نے خوب ادا کیا۔

ایک شب کی مہلت نماز کیلئے اور مفاد اسلام کی بے نظیر تبلیغ

۹ محرم کو اس وقت کہ جب خونخوار لشکر کی یورش تھی اور حسینؑ

اور انکی مختصر جماعت کے قتل کے لئے حملہ کر دیا گیا تھا، حسینؑ نے اپنے بھائی کو بھیجکر ایک شب کی مہلت مانگی کیوں؟ کیا اس لئے کہ حسینؑ اپنے اہل حرم سے رخصت ہولیں، اپنے عزیزوں کو دل بھر کہ ایک رات اور دیکھ لیں یا ایک شب میں کوئی سامان جنگ کرلیں؟ نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ آج رات بھر خدا کی عبادت کرلیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا شب اس طرح گذاری کہ "لھم دوی کدوی النحل" اس جماعت کی آوازیں ذکر الٰہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے"

اس طرح انھوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس طرح اصول مذہب کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ کہ مذہبی جذبۂ عالم کے جذبہ سے زیادہ پُر طاقت ہے۔

عاشور کے دن نماز ظہر گذشتہ موقع سے سخت اور زیادہ کٹھن وہ موقع تھا

جب لڑائی شروع ہوچکی تھی حسینی مختصر لشکر کے بہت سے نوجوان قتل ہوچکے تھے اور کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ تیروں کی بارش تھی اور کمانوں کے کڑکنے کی گرج لیکن اس حالت میں بھی نماز ظہر بجماعت ادا کی گئی اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔

امام روبقبلہ اور مجاہدین کی صفیں پیچھے اور دو بہادر، امام کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے کہ جو تیر آئے وہ اپنے اوپر روکیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے اُن دونوں بہادروں میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفی زمین پر گر کر تڑپنے لگے ہیں اور دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔

یہ تھے حقانیت کے مظاہرات اور صداقت کے نمونے جو اگرچہ اپنے

اپنے وقت وقوع میں خاموشی کے ساتھ عمل میں آ ئے لیکن انھوں نے دُنیا کو دعوت حق کی پُر زور آواز سے مملو کر دیا اور افرادِ اسلام کے اسلامی احساسات کو جھنجوڑ کر بیدار کر دیا اور دوسری طرف یزید اور ہواخواہانِ یزید کے ظالمانہ افعال اور اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کیا۔

تبلیغِ حق کے دیگر مظاہرات

عاشورے کی صُبح سے لے کر عصر تک کے واقعات اگر ہم لکھنا چاہیں تو یہ رسالہ کافی نہیں ہو سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حُسینی فوج کا ہر جوان ایک مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بریر ہمدانی کا مباہلہ حبیب بن مظاہر کا مکالمہ، زہیر بن قین کا خطبہ اور تمام انصار و اقرباء کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک حسینی شہادت کے اسباب و علل بیان کرنے میں ایک مبلغ کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا اثر ظاہر ہو یا نہ ہو لیکن ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اُس کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اُس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ سخت اور کٹھن موقعوں پر اور دشوار گذار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کر دے اور جو دعوت و اظہار کا حق ہے اس کو پورا کر سکے۔

حُسینی فوج کے تمام جوان دادِ شجاعت دے کر رُخصت ہو چکے، ہاشمی خاندان کے بچے بھی اپنے بزرگ کی حمایت میں کام آ گئے۔ صرف مظلوم حسین باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے۔ دل پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دُنیا تاریک ہے مگر وہ مبلغ الہیٰ۔ ربانی داعی مذہب اپنے فریضہ سے ایک لمحے کے لئے غافل نہیں ہے وہ خُطبے پڑھتا ہے۔ تقریریں کرتا ہے صحابۂ رسول کو گواہ بنا کر اپنی حقیقت کا ثبوت دیتا ہے۔ کیا اس اُمید پر کہ یزیدی لشکر آپ کی حالت پر رحم کھائے گا۔ وہ درہم و دینار کی جلوہ آرائی اور اشرفیوں کی جھنکار اور حکومت و سلطنت کی طمع و حرص سے آزاد ہو کر راستے پر آ جائیگا؟

لہٰذا حضرت امام حسینؑ حقیقت سے بے خبر نہ تھے مگر بنی نوع بشر کو حالات سے واقف اور باخبر بنانا چاہتے تھے۔ آپ نے کوئی دقیقہ اظہار حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخری نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے۔

اس وقت بھی کہ جب شمر کا خنجر بوسہ گاہ مصطفےٰ کے قریب آ چکا تھا اور امامت کا چراغ گل ہو رہا تھا حسینؑ نے اپنے قاتل کے سامنے تبلیغ کی اور اپنے نانا کی صداقت و حقانیت کو ثابت کر دکھایا۔

فرمایا شمر ذرا اپنے چہرہ سے نقاب اٹھا، شمر نے نقاب ہٹائی "حضرت نے فرمایا ــــ میرے نانا رسولؐ نے سچ کہا تھا کہ اے حسینؑ تیرا قاتل ایک مبروص (کوڑھی) شخص ہوگا"

روحی لک الفدا! اے حسینؑ بن علیؑ آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق زیر خنجر بھی ثابت کر دی۔ آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر گر رہا تھا آپ کی مظلومیت کا مرثیہ خواں اور ملت اسلامیہ کا واحد مبلغ تھا۔

واقعۂ کربلا کے بعض روشن پہلو

ایثار و مواسات

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنا ایثار ہے اور سخت موقع پر دوسرے کو مبتلا پا کر خود شریک مصیبت اور ہمدرد ہو جانے کا نام مواسات ہے۔

ان دونوں صفتوں کا بہتر اور مکمل ترین نمونہ زمین کربلا کے مجاہدین نے پیش کیا ان میں سے ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے نفس و بدن پر اس طرح مقدم سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے تئیں جیتے جی معدوم سمجھ لئے تھے۔

سید الشہداء مصلے پر نماز ظہر ادا کر رہے ہیں اور دشمنوں کے تیروں کی بوچھار ہے۔ سعید بن عبداللہ و زہیر بن قین امام کے سامنے

سپر بنے ہوئے کھڑے ہیں اور ابھی نماز ختم نہیں ہوتی کہ سعید زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں۔

اور خود امام نے مفاد ملی کی حفاظت کو اپنے نفس بلکہ نفس سے عزیز تر اولاد و اقربا، اور اُن سے بھی بالاتر عزت و ناموس پر اس طرح مقدم کیا کہ خود دُنیا کی ہر چیز سے ہاتھ دھو لیا اور اپنے کو عالم بھر کے مصائب و آلام کا نشانہ بننا گوارا کیا۔ لیکن دین اسلام کو قائم کر گئے۔

اور مواسات کا یہ عالم کہ کوئی مصیبت انصار و اصحاب پر نہیں پڑی جس میں امامؑ نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار و اعزہ کی شہادت کے عنوان مختلف تھے لیکن جب امام مظلوم کی شہادت پر ایک نظر کی جاتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ بلکہ ایک بیکس کے قتل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اُس ایک ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔

حسینؑ اُس دن نہ صرف اپنی جان نہیں دے رہے تھے بلکہ دُنیا کو ایثار و مواسات کا نہ بھولنے کے قابل سبق دے رہے تھے اور بے نظیر مثال قائم کر رہے تھے۔

ثبات و استقلال

سخت اور دشوار گذار مصائب کے باوجود قدم میں لغزش نہ ہونا ثبات و استقلال ہے اور اس امتحان میں کربلا کے مجاہدین کا نمبر سب سے اوّل ہے اُن کے دشوار گذار مصائب کی نوعیت عالم سے جداگانہ تھی۔ سر و گردن کے باہمی ارتباط کا ایک مرتبہ دم شمشیر سے قطع ہو جانا ایک جانباز سپاہی کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن تین دن کی بے آبی اور زخموں کی کثرت کے سبب کلیجہ کے اندر آگ کا بھڑکنا ہر لحظہ احتضار و نزع روح کی تکلیف برداشت کرنے سے کم نہ تھا۔

کم سن بچّوں کو ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے دیکھنا اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کے عزیز ترین سرمایہ اولاد کو کھینچی ہوئی تلواروں اور برستے ہوئے تیروں میں بھیجنا نہیں بلکہ اپنے ہاتھ پر جگر کے ٹکڑے کو نشانۂ تیر بنوا دینا ہر انسان کا کام نہیں ۔ ان کے استقلال و ثباتِ قدم کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ اور انھوں نے اس کے ذریعہ جو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اس کی مثال کبھی ملنا ناممکن ہے وہ فنا نہیں ہوگئے بلکہ ہمیشہ کے لئے خود زندہ ہوئے اور ہزاروں کو زندہ کر گئے ۔ دورِ فلک میں جب تک اسلام کا دور ہے ان کی یاد سچے مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی ۔ اور سرشکِ غم کے سبحۂ صد دانہ پر اُن کا وِرد ہوتا رہے گا ۔

عزتِ نفس اور موت کا موازنہ

مُجاھد کربلا کا نعرۂ شیرانہ | الموت اولیٰ من رکوب العار

زندگی عزیز شے ہے اور فطرت انسانی میں حیات دنیا کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے ۔ انسان اس کی خاطر سخت ترین دُنیا کے مشکلات کو برداشت کرتا اور سرد و گرم عالم کا تحمل کرتا ہے اس کی طبیعت اگر افراط بخل وغیرہ کے سبب حد اعتدال سے خارج نہیں ہو گئی ہے تو وہ اپنی جان کی حفاظت میں مالی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کرتا اور تمام ممکن ذرائع جن سے اسکی ہستی کی بقا ممکن ہے صرف کرنا ضروری سمجھتا ہے ، اسلام نے کبھی اس فطری رجحان کو رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی بلکہ لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ کے حکیمانہ حکم سے حفاظت نفس اور زندگی کی نگہداشت کو فریضۂ لازمی قرار دیا لیکن فلک اعظم کے دور اور لیل و نہار کی آمد و رفت میں

ایسے نازک مواقع پیش آجایا کرتے ہیں، جب جذباتِ نفسانیہ میں تلاطم اور طبعی و عقلی رجحانات میں تصادم ہوتا ہے، زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھ بند کر لینا پسند کر لیتا ہے اور وہ اسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر شئے کو قربان کرتا تھا ہاتھ دھونے میں لذّت محسوس کرتا ہے۔ یہ صورت کبھی غیر عقلی، شہوانی، جاہلانہ، ناعاقبت اندیشی کے رجحانات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھکر روکتی اور نہ شرع شاباش کی آواز دیتی ہے۔ لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی یا زندگی سے بہتر موت میں معاملہ پڑ گیا ہو، جس وقت حیاتِ دنیا اہم ترین مقاصد کے پامال ہونے کا پیش خیمہ ہو اور جس وقت عزّتِ نفس اور فنائے ظاہری کا سوال درپیش ہو جبکہ میزانِ عقل نے صورتِ حال کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے موت کو حیات پر ترجیح دے دی ہو تو اس وقت موت کے منہ میں جا پڑنے والے دائمی حیات کے مالک ہو جاتے ہیں۔ عزت دار ہستیاں ہمیشہ عزّت کا صدقہ جان کو سمجھی ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ نے کربلا میں جو راستہ اپنے لئے مقرّر کر لیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا، انکی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں اگرچہ وسیع صحرائے کربلا میں گونج کر فنا ہو گئیں لیکن ان کا پائندہ مفہوم اب بھی غیرت دار اقوام کے صحیفۂ حیات کا سرنامہ اور اُن کے دیباچۂ زندگی کا عنوانِ اوّل ہے۔

(الموت اولیٰ من رکوب العار) "ننگ و عار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔"

اُن کی یہ مختصر لفظیں عالی ہمت کی منادی اور عزّتِ نفس کی ترجمان ہیں اور ان ہی کو حسینؑ نے عملی صورت سے دُنیا کو دکھلا دیا۔

★

اصول کی حمایت اور قربانی

حسینؑ کی قربانی دنیا سے نرالی تھی

اس قربانی کے انتظامات عجیب و غریب تھے

- کربلا کے مجاہد حسینؑ بن علیؑ کا اصول حق کی حمایت!
- شریعت اسلامیہ کی نگہداشت! ——— اور
- جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں روحانی و مذہبی خودداری کی حفاظت تھی، انھوں نے اپنے آخری نفس تک اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ اگر پہلی ہی مرتبہ اپنی جان کی قربانی پیش کر دیتے تو بہت ممکن تھا اس قسم کی قربانیاں کم سہی لیکن بے مثال نہیں۔ سقراط نے بھی زہر کے جام کو اٹھا کر پی لیا تھا اور اپنی جان کو مقصد پر سے قربان کر دیا تھا لیکن حسینؑ بن علیؑ کا مقصد بہت اہم تھا۔ وہ اپنی قربانی کی نوعیت ہی عالم سے جداگانہ قرار دینا چاہتے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عزیز شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کریں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متاع گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کر دیں انھوں نے سب سے پہلے اپنے راحت و آرام، وطن کی اطمینانی زندگی کو قربان کیا جس کے سلسلے میں ان کو ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔

روز عاشورہ کی قربانیوں کے سلسلے میں اپنے محبوب ترین اصحاب

انصار، ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا، عزیزوں کی باری آئی اور ایک ایک کر کے ان سب کو میدان قربانی میں بھیجا، اپنے دست و بازو وفادار بھائی قمرِ بنی ہاشم کو قربان کیا، اپنے پیارے کم سن بھتیجے قاسم بن الحسنؑ کو قربان کیا، اپنے دل کی قوت، آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علی اکبرؑ کو قربان کیا۔

باغ اُمید کی آخری کونپل اور غنچۂ ناشگفتہ علی اصغرؑ کو خود اپنے ہاتھوں پہ لا کر قربان کیا، ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی اب اعضائے بدن تک نوبت پہنچی۔ ان کو ایک ایک کر کے قربان کیا، گوشت و پوست، سینہ و دست، دل و جگر، چہرہ و جبین بلکہ سطح جسم کا چپہ چپہ اور اجزائے بدن کا ہر ذرّہ قربان کیا، نوبت یہ پہنچی کہ تیروں کو جگہ نہ ملتی اور دشمنوں کی تلواروں، نیزوں کو جستجو کے بعد بھی خالی مکان نظر نہ آتا تھا۔ جب جسم کا ہر حصّہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا۔ اصحاب و انصار اور اقرباء میں سے تو پہلے ہی کوئی باقی نہیں رہا تھا اعضائے جسم کی قربانی کا بھی امکان نہ رہا۔ ایک ایک نیزہ پر سینکڑوں نیزے اور ایک تلوار پر سینکڑوں تلواریں پڑ چکیں اور تیر بھی اپنا پورا حوصلہ نکال چکے، اب حسینؑ کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا، کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی صرف ایک رشتۂ حیات تھا جو روح و بدن کے اور پوری کشمکش حیات کے باوجود قائم تھا اور ایک سر و گردن کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی۔

اس باہمت مظلوم کے لئے گزشتہ تمام قربانی کے مرحلوں کو طے کرنے کے بعد یہ قربانی کا مرحلہ بالکل آسان تھا بلکہ اس میں خاص لذت محسوس ہو رہی تھی، عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں بھی کامیاب ہو گئے اور خنجر شمر سے بجود یہ راز و نیاز کے بعد ایک طرف نفس کی آمد و شد

کا سلسلہ اور نفس و بدن کا ظاہری حلقۂ اتصال قطع ہوا اور دوسری طرف سر و گردن کے ارتباط میں جدائی پیدا ہو گئی۔

آسمان لاکھوں برس گردش کرے، زمانہ کے ورق گوناگوں خصوصیتوں کے ساتھ سامنے آئیں اور الٹ جائیں لیکن اتنی شاندار مکمل منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

حسینؑ کی شہادت کے بعد

فاطمہ زہراؑ کا چاند غروب ہو چکا ہے اور دشمن اپنے مقصد میں ظاہری صورتوں سے کامیاب ہو چکے ہیں، اب کوفہ و شام کے بازار ہیں اور بنی ہاشم کے گھرانے کی معزز خواتین اور نیزوں پر کربلا میں شہید ہونے والے مظلوموں کے سر نصب ہیں سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہلبیتؑ رسولؐ کے لئے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت حسینؑ کی تبلیغ انتہائے شباب پر پہنچ گئی ہے اور دعوت حق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔ اگر چشم حقیقت بیں سے نظر کیجئے تو نیزہ پر سرِ حسینؑ جس کی پیشانی پر سجدۂ معبود کا نشان پڑا ہوا ہے۔ (سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود) چہرہ سے نور ساطع ہے۔ ہونٹ تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں۔ (ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من ایاتنا عجبا) دوسری طرف مخدراتِ عصمت جوان نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنع سے محروم ہونے کے بعد بھی غیرت و حیا کا مجسمہ، اخلاق محمدیہ کی تصویر جاہ و جلال کی چادروں میں پنہاں، طہارت و عفت کے اندر ملبوس اور ان کے وہ حقائق و وقائع سے مملو خطبے کانھا تفرغ عن لسان ابیھا۔ زینب گویا علیؑ بن ابی طالب کی زبان کے ساتھ کلام

کر رہی تھیں۔) یہ چیزیں وہ ہیں جنھوں نے صداقت کے پیکر میں روح پھونک دی۔ دُنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت و ضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینکدیا، عالم کو شرق سے لے کر غرب تک حسینؑ بن علیؑ کا مرثیہ خواں اور یزید کے افعال و اقوال سے بیزار و متنفر کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آج عالم کے گوشہ گوشہ اور دُنیا کے ہر جبہ میں حسینؑ کا نام ہے اور حجاز کا حقیقی بادشاہ کروڑوں افراد کے دلوں پر قیامت تک کے لئے حکومت کر رہا ہے اور بنی اُمیہ کے جبروت و عزت کا چراغ ہمیشہ کے لئے اس طرح گل ہوا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہے عالم نے دیکھ لیا کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم؟

ظلم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور مظلومیت کی شان کیا ہے۔؟

(بحوالہ پیام عمل لاہور اپریل سنہ ۱۹۸۰ء)



شہادت زارِ کربلا

کسی کے دل میں اتنی طاقت ہے کہ وہ آج شہادت زارِ کربلا کی سیر کرے۔ ایک دل الجھانے والی خاموشی، ایک دم گھٹنے والی اُداسی، وہ قافلہ جو دوسری محرم کو اس زمین پر اترا تھا آج اپنا اسباب باندھ کر چلا جا چکا ہے اس لئے سناٹا چھایا ہوا ہے یقیناً یہ منظر دل ہلا دینے والا ہے مگر انسان بھی عجیب چیز ہے، وہ ہر نئے حادثہ کی کیفیتیں دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے چاہے بعد میں اس کو تکلیف ہی پہنچے پھر بھی وہ واقعات ضرور معلوم کرتا ہے جب ایسا ہے تو ذرا دل مضبوط کر کے میرے ساتھ چلو اور کربلا کے مختلف مناظر کی اس وقت سیر کرو۔

وہ دیکھو ایک بے شمار خیموں اور چھولداریوں کا سلسلہ جن میں سے اکثر میں چراغ روشن ہیں اور وہ بہت سے خیموں کے جھرمٹ میں ایک بڑا خیمہ جس میں تیز روشنی ہے ضرور یہ روشنی تمہاری نگاہ کو سب سے پہلے جذب کرے گی اس لئے چلو یہاں دیکھ لیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

یہ یزیدی فوج کے سالار عمر سعد کا خیمہ ہے، جہاں اس وقت فتح کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ تمام بڑے افسر جمع ہیں۔ پیغمبر اسلام کے نواسےؑ کا تین دن کی بھوک پیاس میں خنجر ظلم سے گلا کاٹنے والے اپنے کارنامے پر ناز کر رہے ہیں اور ایک ایک شہید کی شجاعت کے تذکرہ کے ساتھ اس کے قتل کرنے والے کی تعریفیں ہو رہی ہیں اگرچہ سیکڑوں خیموں سے اس وقت زخمیوں کی کراہ کی آواز اور بیبیوں سے مقتولین کے غم میں نالہ و شیون کی آوازیں بھی بلند ہیں مگر نتیجہ کی کامیابی نے کانوں کو اس طرح کی آوازوں

سے بلند کیا ہے اور شراب ناب کے دور کے ساتھ فتح و ظفر کا نشہ سب کو بے خود بنائے ہوئے ہے۔

یقین ہے کہ تم سینہ میں ایک شریف انسانی دل رکھتے ہو۔ اس لئے اس منظر کو دیکھ کر خوشی میں شریک ہونے کے بجائے نفرت و حقارت کے جذبات محسوس کرنے لگو گے تمہارا ضمیر ملامت کرے گا اور تمہاری انسانیت چیخ اٹھے گی۔ بھلا وہ فتح بھی کوئی فتح ہے جسے کم از کم تیس ہزار کی فوج بہتر بھوکوں اور پیاسوں کے مقابلہ میں اپنے لاتعداد سپاہیوں کو کھو کر جنگ مغلوبہ سے حاصل کرے۔ وہ بہتر جن میں سب لڑنے کے قابل بھی نہ ہوں بلکہ ان میں اسی برس کا بڈھا اور چھ مہینہ کا بچہ بھی داخل ہو کیا اس فتح پر ناز کرنا انتہا درجہ کی کم ظرفی اور پست نگاہی نہیں ہے؟ کیا یہ فتح حقیقتاً فتح ہے، نہیں نہیں وہ شکست ہے جس کی مذلت اس فوج اور اس کی ظالم حکومت پر ہمیشہ کے واسطے چھائی رہے گی۔

یہ خیالات یہاں کے طرب و نشاط کے سامان خوشی و مسرت کے شادیانوں اور ناؤ نوش کی دلچسپیوں کو ایک حساس دل کے لئے بے کیف بنا دیتے ہیں۔ جی گھبرانے لگتا ہے اور بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ یہاں سے نکل کر میدان کی کھلی ہوا میں سانس لے کر غم غلط کیا جائے وہ دیکھو نہر فرات لہریں لے رہی ہے، پانی دور سے نظر آ رہا ہے کیونکہ راستہ صاف ہے۔ وہ پہرا جو تین دن سے اس پانی پر بیٹھا ہوا تھا اٹھ چکا ہے۔ وہ ہزاروں سپاہیوں کے پہرے جو رات دن جمے رہتے تھے آج ہٹائے جا چکے ہیں اس لئے کہ وہ بہتر جن کے نیم جان بنانے کے لئے پانی کی بندش ہوئی تھی لڑ بھڑ کر ساحل فنا کے اس پار پہنچ چکے ہیں۔

دریا کا کنارا پریشان دل کے سکون کے لئے بہترین جگہ ہے، مگر دریا کے ساحل پر خون کی بو آ رہی ہے۔ موت کے قدموں کے نشان ہر طرف نظر آتے ہیں۔ کسی شیر کے نعروں کی صدا اب تک گونج رہی ہے۔ گرے ہوئے خون کا سلسلہ رہنمائی کرتا ہوا آگے لے جاتا ہے قدم ٹھٹکتے

ہیں، دل دھڑکتا ہے۔ ایک نامعلوم رعب کا احساس، دور باش کی صدا دیتا ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ترائی میں ایک شیر آرام کر رہا ہے جس کے گرد و پیش بہت دور تک ساحل کی تمام بالو خون سے گندھی ہوئی ہے جسم تمام زخموں سے چُور ہے۔ سر شگافتہ ہے۔ ہاتھ دونوں جسم سے جدا ہیں مگر کٹے ہوئے ہاتھ کے شانہ میں مشک کا تسمہ اب تک پھنسا ہوا ہے وہ مشک جس میں سوراخ ہے اور اس کا پانی تمام بہہ چکا ہے جس نے بہادر کے جسم سے بہتے ہوئے خون کی روانی میں اضافہ کر کے زمین مقتل کو دور تک رنگین بنا دیا ہے۔ ڈھال تو بہت دور پڑی ہے مگر تلوار دہن کے قریب ہے۔ جھنڈا جو ہوا میں لہرا رہا تھا وہ اب زمین پر ہے مگر بہادر کا سینہ علم کا اب بھی محافظ ہے۔

یہ ہے علیؑ کا شیر۔ حسینؑ کا قوت بازو۔ اور علمدار۔ پیاسی سکینہؑ کا سقّا۔ قمر بنی ہاشم عباسؑ جو حسینی فوج کا سب سے آخری سپاہی تھا جس نے سب سے آخر میں حسینؑ سے اجازت جہاد طلب کی مگر امامؑ نے پھر بھی لڑنے کی اجازت نہیں دی فقط بچوں کی پیاس بجھانے کے لئے پانی کی سبیل پیدا کرنے کا حکم دیا۔ وفادار عباسؑ کی یہ یادگار کامیابی تھی کہ وہ فوج کا پہرہ ہٹا کر مشک میں پانی بھر لینے میں کامیاب ہوئے مگر افسوس کہ بھری ہوئی مشک کو لے کر خیمہ تک پہنچنا ممکن نہ ہوا۔ تیر نے مشک کو چھید کر تمام پانی بہایا اور عباسؑ نے سینکڑوں زخم کھا کر اپنے جسم کا تمام خون بہا دیا۔

عباسؑ مشک و علم کے ہوتے ہوئے بھی دشمن کے احساس میں بے بس نہیں تھے آخر دونوں ہاتھ جدا کر دیئے گئے مگر پھر بھی عباسؑ جب تک خود گھوڑے سے نہیں گرے علم کو زمین پر نہیں گرنے دیا۔ مگر وہ علم اس کے بعد بھی حقیقت میں گرنے نہیں پایا۔ آج ہزاروں علم اسی ایک علم کی یاد میں ہزاروں کے ہاتھوں میں بلند ہوتے ہیں اور ہر تعزیہ خانہ میں حسینؑ کے نام کی ضریح تو ایک ہوتی ہے مگر علم کثرت کے ساتھ نصب ہوتے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس کا کہ عباسؑ گو دنیا میں نہ رہے مگر

ان کا علم آج تک اونچا ہے اور ہمیشہ اونچا رہے گا کیونکہ حق کا جھنڈا کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔

یہ منظر یقینی اگر ایک طرف دل میں جوش، ولولہ، حق پر مٹنے کا حوصلہ پیدا کرتا اور رگوں میں خون کی روانی بڑھاتا ہے تو دوسری طرف ایک ایسے بہادر کی لاش کا یہ جاں فرسا عالم دل کی رگیں بھی توڑنے لگتا ہے بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں وہ آنسو جو بزدلی کے نہیں بلکہ بہادری کی قدر و قیمت کے احساس کا نتیجہ ہیں اور عزم و ہمت کی آگ کو افسردہ نہیں بلکہ اس کی شعلہ افروزی میں اور اضافہ کرتے ہیں۔

دل تو چاہتا ہے کہ حسرت کے اسی ایک منظر میں غرق ہو جائے مگر ساحل کی بلندی سے صحرا کا گلگوں تختہ صاف نظر آتا ہے اور نگاہ کو کشاں کشاں اپنی طرف لے جاتا ہے۔

یہاں کوئی ایک ہی مرقع نہیں ہے جو توجہ کا مرکز بن سکے بلکہ سچ سچ "شہادت زار" تو یہی جگہ ہے، دور تک لہو کا چھڑکاؤ ہے۔ جابجا خون کے تھالے بن گئے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے نیزے، شکستہ تلواریں، ٹکڑے ہوئے تیروں کے انبار ہیں جو ادھر ادھر لگے ہوئے ہیں، دشمنوں کے سر ہزاروں کی تعداد میں زمین پر لڑھک رہے ہیں۔ اور لاشے بھی بہت دور تک نظر آتے ہیں ان سب کے بیچ میں بہتر یا زیادہ سے زیادہ سو، سوا سو نورانی جسمے خاک و خون میں آلودہ اس عالم میں ہیں کہ کسی کا جسم تیروں سے چھلنی ہے کسی کا سر گرز سے شگافتہ ہے، کسی کا پہلو خنجر سے چاک اور کسی کا سینہ نیزہ سے فگار ہے۔

ان میں ساٹھ ستر اور اسی برس تک کے بڈھے ہیں، ۱۸ سے لیکر ۳۰ برس تک کے جوان اور گیارہ بارہ برس تک کے کمسن بچے بھی ہیں۔ ہاشمی خاندان کے جوانوں بلکہ بچوں تک کی سج دھج سب سے الگ ہے۔ ان میں ایک چاند کا ٹکڑا تلوار کا پھل کھائے اس شان سے پڑا ہے کہ عمامہ کے پیچ خون سے رنگین ہو کر لٹک آئے ہیں اور اس حسین چہرے پر سہرے کی طرح چھا گئے ہیں۔

ہاتھوں میں خون کی مہندی اور سینہ پر زخموں کی بدھی ہے یہ ہے حسنؑ کا یتیم اور حسینؑ کا عزیز بھتیجا قاسمؑ، جسے رخصت کرتے وقت امامؑ نے مرحوم بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے اپنا داماد بھی بنا لیا تھا۔ کربلائے معلیٰ میں خیمہ گاہ کے اندر ان کی یادگار میں حجلۂ عروسی بنا ہے اور ہندوستان میں ان کی یاد میں ساتویں تاریخ مہندی اٹھتی ہے۔

ان ہی کے پاس اٹھارہ برس کے کڑیل جوان کا لاشہ ہے جس کے سہرے کے پھول کھلنے کی نوبت نہ آئی۔ یہ علی اکبرؑ ہیں، جنھیں حسینؑ اس لئے بہت عزیز رکھتے ہیں کہ وہ ہوبہو رسول اللہؐ کی تصویر تھے۔ ان کے رخصت ہونے کے وقت حضرت امام حسینؑ نے اپنے خالق کو گواہ کر کے کہا تھا کہ جب ہم زیارت رسولؐ کے مشتاق ہوتے تھے تو اس کے چہرہ کو دیکھ لیتے تھے۔ آج کے خوش عقیدہ مسلمان شبیہ نعلین رسولؐ کی بھی، جو کاغذ پر بنی ہو عزت کرتے ہیں مگر افسوس وہ کیسے مسلمان تھے جنھوں نے خود رسولؐ کی جیتی جاگتی ہوئی شبیہ کا خیال نہ کیا وہ حسین اور مقدس جسم تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

علی اکبرؑ کو دیکھتے ہی دل میں علی اصغرؑ کا خیال آتا ہے۔ وہ چھ مہینہ کا بچہ جسے حسینؑ نے قربان گاہ شہادت میں سب سے آخر میں پیش کیا تھا جو پیاس سے جاں بلب تھا مگر پیاس اس کی پانی سے نہیں بلکہ پیکان تیر سے بجھائی گئی۔ ان کی لاش تلاش کرنے پر بھی شہیدوں میں نہیں ملتی۔ ہاں زمین پر ایک چھوٹی سی قبر بنی ہوئی ہے یہ اصغرؑ کی تربت ہے۔ اس بچہؑ کو خود امام حسینؑ نے شہادت کے بعد ہی دفن کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ امت رسولؐ کا یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ فرزند رسولؐ کی انسانی غیرت کو خود اس منظر کے سامنے رہنے سے شرم دامنگیر ہوتی تھی۔

سب سے آخر میں نگاہ نشیب کی طرف جاتی اور وہیں ٹھہر جاتی ہے۔ یہاں ایک تقدس کا ماہ پیکر نورانی شعاعوں کا خزانہ خونیں شفق کے اندر چمکتا ہوا سورج یعنی حسینؑ جن کا لاشہ ایسا پڑا ہوا ہے جس کا سر پہلے ہی جدا ہو چکا ہے۔ اس لئے صورت سے تو پہچانا نہیں جا سکتا مگر زخموں کی کثرت بتلاتی

ہے کہ تمام حربوں کا اصلی مقصد اور عداوتوں کا آخری مرکز یہی تھا۔ شکستہ کمر ظاہر کرتی ہے کہ یہ وہ ہے جس کے برابر کا بھائی مار ڈالا گیا۔ بازو تیر سے چھدا ہوا خبر دیتا ہے کہ وہ ہے یہ جس کے ہاتھوں پر چھ مہینے کا بچہ نشانۂ تیر ستم ہوا۔ خون سے رنگین ہاتھ بتا دیتے ہیں کہ وہ ہے یہ جس نے بے شیر کا خون چہرہ پر مل لیا تھا۔ سینے پر کشادہ گھاؤ اور پشت کے پار اس کا نشان بتلا رہا ہے کہ یہ ہے وہ جس کے سینے پر تیر پڑا تو سامنے سے نکل نہ سکا آخر پشت کی جانب سے اسے کھینچا گیا تو سینے سے خون پرنالے کی طرح جاری ہوا۔ جسم کے پارہ پارہ ٹکڑے اس کی دلیل ہیں کہ یہی ہے وہ جس کا جسم بعد شہادت گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا گیا۔

ان خصوصیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہے شرافت کی جان، انسانیت کی روح، صداقت کا مجسمہ، پیغمبرؐ اسلام کی نشانی، علیؑ کا فرزند حسینؑ جو کربلا کے مجاہدین کا سرگروہ اور اس ہمیشہ یاد رہنے والے کارنامہ کی مرکزی شخصیت، جس نے جان دے دی مگر حق و صداقت پر آنچ نہ آنے دی۔ جس نے عزت اسلام پر اپنی ہر چیز قربان کر دی اور بقول خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی از سر نو بنا قائم کر دی۔

آج ہر سال دنیا کے تمام مشرق و مغرب میں محرم میں انہی کا سوگ منایا جاتا ہے اور انہی کی یاد ہے جو مختلف اندازوں اور طریقوں سے برابر تازہ کی جاتی ہے اور تیرہ صدیوں سے ہر سال کے بعد دوسرے سال اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔





امام منتظرؑ

نام و نسب پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰؐ کی نسل مبارک جو آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ اور داماد حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام سے چلی اور ان کے چھوٹے فرزند حضرت امام حسین علیہ السّلام کی اولاد میں سے جو مسلسل نو امام ہوئے ان میں سے آٹھویں امام حضرت امام حسن عسکریؑ تھے اور امام حسن عسکریؑ کے فرزند ہمارے بارھویں امام حضرت حجت قائمؑ امام عجل اللّٰہ فرجہٗ ہیں جو اپنے جدّ بزرگوار حضرت پیغمبر خداؐ کے بالکل ہمنام اور صورت و شکل میں ہوبہو ان کی تصویر ہیں۔ والدہ گرامی آپ کی نرجس خاتون، قیصر بادشاہ کی پوتی اور شمعون وصی حضرت عیسیٰؑ کی اولاد سے تھیں۔ امام حسن عسکریؑ کی ہدایت سے حضرتؑ کی بزرگ مرتبت ہمشیرہ "حلیمہ خاتون" نے انھیں مسائل دینیہ اور احکام شرعیہ کی تعلیم دی تھی۔

القاب و خطابات غالباً آئمہ معصومینؑ میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے بعد سب سے زیادہ القاب ہمارے امام عصرؑ کے ہیں جن میں زیادہ مشہور ذیل کے خطابات ہیں۔

۱۔ المہدی۔ یہ ایسا خطاب ہے جو نام کا قائم مقام بن گیا ہے اور پیشنگوئیاں جو آپ کے وجود کے متعلق پیغمبر اکرمؐ اور دیگر آئمہ معصومینؑ کے زبان پر آئیں وہ زیادہ تر اس لفظ کے ساتھ ہیں اور اسی لئے آنے والے "مہدی" کا اقرار تقریباً ضروریات اسلام میں داخل ہو گیا ہے جس میں اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو اوصاف و حالات کی تعیین میں، لیکن "مہدی" کے ظہور کا عقیدہ مسلمانوں کے ہر شخص کو رکھنا لازم ہے۔ ان حضرات کا ذکر نہیں جو اپنے کو مسلمان صرف سوسائٹی کے اثر یا سیاسی مصلحتوں سے کہتے ہیں مگر ان کے دل میں حاضر و ناظر معدلت پسند رب الارباب کا عقیدہ ہی موجود نہیں، تو اس کے رسُول کی

کسی ایسی خبرِ غیبی کی تصدیق جو ابھی وقوع میں نہیں آئی ان کے حاشیۂ خیال میں کہاں جگہ پاسکتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو معمول کے خلاف اس رسالہ میں ہم نے مخاطب بنانا نہیں چاہا ہے۔

"مہدی" کے لفظ کے معنی ہدایت پائے ہوئے کے ہیں۔ اسی لحاظ سے کہ "اصل ہادی" (راستہ بتانے والا) ذات خالق ہے جس کے لحاظ سے خود پیغمبرؐ سے خطاب کر کے قرآن کریم میں یہ آیت آئی ہے۔ انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء۔ "تمھارے بس کی بات نہیں ہے کہ تم جس کو چاہو ہدایت کرو۔ بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے" اور اسی اعتبار سے سورۂ الحمد میں بارگاہ الٰہی میں دعا کی گئی ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم "ہم کو سیدھے راستے پر قائم رکھ" اس فقرہ کو خود پیغمبرؐ اور ائمہ معصومین بھی اپنی زبان پر جاری کرتے تھے اس لئے خداوند عالم کی ہدایت کے لحاظ سے ان رہنمایان دین کو "مہدی" کہنا صحیح تھا جو صفت کے لحاظ سے سب ہی بزرگوار تھے اور خطاب کے لحاظ سے حضرت "امام منتظرؑ" کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔

۲۔ القائم۔ یہ لقب ان احادیث سے ماخوذ ہے جس میں پیغمبرؐ خدا نے فرمایا ہے کہ "دنیا ختم نہیں ہو سکتی جب تک میری اولاد میں سے ایک شخص قائم (کھڑا) نہ ہو جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے"۔

۳۔ صاحب الزماں۔ اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ آپ ہمارے زمانہ کے رہنمائے حقیقی ہیں۔

۴۔ حجتِ خدا۔ ہر نبی اور امام اپنے دَور میں خالق کی حجت ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ہدایت کی ذمہ داری جو اللہ پر ہے وہ پوری ہوتی ہے اور بندوں کے پاس اپنی کوتاہیوں کے جواز کی کوئی سند نہیں رہتی۔ چونکہ ہمارے زمانے میں رہنمائی خلق کی ذمہ داری حضرت کے ذریعے سے پوری ہوئی

ہے اس لئے قیامت تک "حجت خدا" آپ ہیں۔

منتظر - چونکہ "امام مہدی" کے ظہور کی پیشنگوئی برابر رہنمایان دین دیتے رہے۔ یہاں تک کہ صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی چاہے نام کوئی دوسرا ہو مگر ایک آنے والے کا آخر زمانہ میں انتظار ہے ولادت کے قبل سے پیدائش کا انتظار ہے اس لئے آپ خود حضرت حکم الٰہی کے منتظر ہوتے ہوئے تمام خلق کے لئے منتظر یعنی مرکز انتظار رہیں۔

ولادت - وہ وقت جس کا معصومین کو انتظار تھا آخر کو آ ہی گیا اور ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کی رات کو سامرے میں اس مبارک و مقدس بچے کی ولادت ہوئی۔ امام حسن عسکریؑ نے اس موقع پر کافی مقدار میں روٹیاں اور گوشت راہ خدا میں صدقہ کرایا اور عقیقہ میں کئی بکریوں کی قربانی فرمائی۔

بارھویں امامؑ کو اپنے والد کی آغوش شفقت و تربیت سے بہت کم عمر میں جدا ہونا پڑا یعنی شعبان ۲۵۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ربیع الاول ۲۶۰ھ میں آپ کے والد بزرگوار حضرت امام حسن عسکریؑ کی وفات ہوگئی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی عمر اس وقت ساڑھے چار برس کی تھی اور اسی کمسنی میں آپ کے سر پر خالق کی طرف سے امامت کا تاج رکھدیا گیا۔

غیبت - حضرت امام منتظرؑ کی امامت کا زمانہ اب تک دو غیبتوں پر تقسیم رہا ہے۔ ایک زمانہ غیبت صغریٰ اور ایک "غیبت کبریٰ"۔ اس کی خبر بھی معصومینؑ کی زبان پر پہلے ہی آچکی تھی جیسے پیغمبر خداؐ کا ارشاد۔ اس کے لئے ایک غیبت ہوگی جس میں بہت سی جماعتیں گمراہ پھرتی رہیں گی اور اس غیبت کے زمانہ میں اس کے اعتقاد پر برقرار رہنے والے "گوگرد سرخ" سے زیادہ نایاب ہوں گے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے "قائم آل محمدؐ کے لئے ایک طولانی غیبت ہوگی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے وہ منظر کہ دوستانِ اہلبیتؑ اس کی غیبت کے زمانے میں سرگرداں پھر رہے ہیں جس طرح کہ جانور چراگاہ کی

تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں"۔ دوسری حدیث میں "اس کا ظہور ایک ایسی غیبت اور حیرانی کے بعد ہوگا جس میں اپنے دین پر صرف با اخلاص اصحاب یقین ہی قائم رکھ سکیں گے۔ امام حسنؑ کا قول "اللہ اس کی عمر کو اس کی غیبت کی حالت میں طولانی کرے گا۔ امام حسینؑ کا ارشاد "اس کی غیبت ہوگی جسمیں بہت سی جماعتیں گمراہ ہو جائیں گی"۔ امام محمد باقرؑ کا ارشاد اس کی غیبت اتنی طولانی ہوگی کہ بہت سے گمراہ ہو جائیں گے"۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "مہدی ساتویں امامؑ کی اولاد میں سے پانچواں ہوگا۔ اس کی ہستی تمہاری نظروں سے غائب رہے گی"۔ دوسری حدیث میں صاحب الامر کے لئے ایک غیبت ہونیوالی ہے اس وقت ہر شخص کو لازم ہے کہ تقویٰ اختیار کرے اور اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہے"۔ امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں۔ "اس کی صورت لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوگی مگر اس کی یاد اہل ایمان کے دلوں سے غائب نہ ہوگی وہ ہمارے سلسلہ کا بارھواں ہوگا"۔ امام رضاؑ "اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کا انتظار رہے گا"۔ امام محمد تقیؑ۔ مہدیؑ وہ ہے جس کی غیبت کے زمانے میں اس کا انتظار اور ظہور کے وقت اس کی اطاعت لازم ہوگی"۔ امام علی نقیؑ۔ "صاحب الامر وہ ہوگا جس کے متعلق بہت سے لوگ کہتے ہوں گے کہ وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا"۔ امام حسن عسکریؑ کا ارشاد ہے "میرے فرزند کی غیبت ایسی ہوگی کہ سوائے ان لوگوں کے جنھیں اللہ محفوظ رکھے سب شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں گے"۔ اسی کے ساتھ امام محمد باقرؑ نے یہ بھی تبلایا تھا کہ "قائم آل محمدؑ کے لئے دو غیبتیں ہیں۔ ایک بہت طولانی اور ایک اس کی بہ نسبت مختصر"۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "ایک دوسرے کی بہ نسبت بہت طولانی ہوگی"۔ انہی احادیث کے پہلے سے موجود ہونے کا نتیجہ تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے بعد ان کے اصحاب اور مومنین مخلصین کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوئے اور انھوں نے کسی حاضر الوقت مدعی امامت کو تسلیم کرنے کے بجائے اس "امام غائبؑ" کے تصور کے سامنے سر تصدیق خم کر دیا۔

غیبتِ صغریٰ:۔ پہلی غیبت کا دور ۲۶۰ھ سے ۳۲۹ھ تک انہتر سال قائم رہا۔ اس میں سفرا خاص موجود تھے یعنی ایسے حضرات جن کو مخصوص طور پر نام کے تعین کے ساتھ امامؑ کی جانب سے نائب بنایا گیا تھا کہ وہ شیعوں کے مسائل امام تک پہنچائیں۔ ان کے جوابات حاصل کریں۔ اموال زکوٰۃ و خمس کو جمع کر کے انھیں مصارف خاصہ میں صرف کریں اور جو قابل اعتماد اشخاص ہوں ان تک خود امامؑ کی تحریرات کو بھی پہنچا دیں ورنہ خود حضرت سے دریافت کر کے ان کے مسائل کا جواب دے دیں۔ یہ حضرات علم و تقویٰ اور رازداری میں اپنے زمانہ کے حسب سے زیادہ ممتاز اشخاص تھے اسی لئے ان کو امام کی جانب سے اس خدمت کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ یہ حسب ذیل چار بزرگوار تھے۔

۱۔ ابو عمرو عثمان بن سعید بن عمرو عمری الاسدی۔ یہ پہلے امام علی نقیؑ کے بھی سفیر رہے تھے۔ پھر امام حسن عسکریؑ کے زمانہ میں بھی اس خدمت پر مامور رہے اور پھر حضرت امام منتظرؑ کی جانب سے بھی سب سے پہلے اس عہدے پر یہی قائم ہوئے۔ چند سال اس خدمت کو انجام دے کر بغداد میں انتقال کیا، وہیں دفن ہوئے۔

۲۔ ان کے فرزند ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعید عمری۔ امام حسن عسکریؑ نے ان کے منصبِ سفارت پر برقرار ہونے کی خبر دی۔ پھر ان کے والد نے اپنی وفات کے وقت بحکم امامؑ ان کی نیابت کا اعلان کیا۔ جمادی الاول ۳۰۵ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

۳۔ ابوالقاسم حسین بن روح بن ابی بحر نوبختی، علم و حکمت کلام و نجوم میں خاص امتیاز رکھتے ہوئے مشہور خاندان نوبختی کی یادگار اور خود بڑے جلیل المرتبت پرہیزگار عالم تھے۔ ابو جعفر محمد بن عثمان نے اپنی وفات کے بعد امامؑ کے حکم سے ان کو اپنا قائم مقام بنایا۔ پندرہ برس عہدۂ سفارت

انجام دینے کے بعد شعبان سنہ ۳۲۶ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

۴۔ ابوالحسن علی بن محمد سمریؒ: یہ آخری نائب تھے۔ حسین بن روح کے بعد بحکم امام ان کے قائم مقام ہوئے اور صرف نو برس اس فریضہ کو انجام دینے کے بعد ۳۲۹ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔ وقتِ آخر ان سے جب پوچھا گیا کہ اب آپ کے بعد نائب کون ہوگا تو انھوں نے کہہ دیا کہ اب اللہ کی مشیت ایک دوسری صورت کا ارادہ رکھتی ہے جس کی آخری مدت اسی کو معلوم ہے اب اس کے بعد کوئی نائب خاص باقی نہ رہا۔ ابھی ۳۲۹ھ کے اندوہ ناک سال میں کافی کے مصنف ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینیؒ اور شیخ صدوقؒ کے والد بزرگوار علی بن بابویہ قمیؒ نے بھی انتقال فرمایا تھا اور ان حوادث کے ساتھ غیر معمولی طور پر یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ آسمان پر ستارے اس کثرت سے ٹوٹ رہے ہیں کہ ایک محشر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس سال کا نام "عام تناثر النجوم" یعنی ستاروں کے انتشار کا سال"۔ اس کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ سخت اندھیرا۔ اس لئے کہ کوئی ایسا شخص سامنے نہ رہا جو امامؑ کی خدمت میں پہنچنے کا وسیلہ ہو۔

غیبتِ کبریٰ: ۳۲۹ھ کے بعد جو زمانہ ہے اسے غیبتِ کبریٰ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اب کوئی خاص نائب بھی باقی نہیں رہا ہے اس دور کے لئے خود حضرت امام عصرؑ نے یہ ہدایت فرما دی تھی کہ "اس صورت میں دیکھنا جو ہمارے احادیث پر مطلع ہوں اور ہمارے حلال و حرام یعنی مسائل سے واقف ہوں ان کی طرف رجوع کرنا۔ یہ ہماری جانب سے تمھارے اوپر حجت ہیں"۔

اس حدیث کی بناء پر علمائے شیعہ اور مجتہدین کو نائب امامؑ کہا جاتا ہے مگر یہ نیابت باعتبار صفات عمومی حیثیت سے ہے خصوصی طور پر باعتبار نامزدگی نہیں ہے۔ یہی خاص فرق ہے، ان میں اور نائبین میں جو غیبتِ صغریٰ کے زمانے میں اس منصب پر فائز تھے۔ اس زمانۂ غیبت میں بھی یقیناً امام علیہ السلام ہدایت خلق اور حفاظت حق کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور

اور ہماری کسی نہ کسی صورت میں رہنمائی فرماتے ہیں۔ خواہ وہ ہمارے سامنے نہ ہوں اور ہمیں محسوس و معلوم نہ ہو۔ یہ پردہ اس وقت تک رہے گا جب تک مصلحت الٰہی متقاضی ہو اور ایک وقت ایسا جلد آئے گا (خواہ وہ جلد ہمیں کتنی ہی دیر معلوم ہوتا ہو) کہ پردہ ہٹے گا اور امام علیہ السلام ظاہر ہوں گے۔ اور دُنیا کو عدل و انصاف سے معمور فرمائیں گے۔ اسی طرح جیسے وہ اس کے پہلے ظلم و جور سے مملو ہو چکی ہوگی۔ اللھم عجل فرجہ و سھل مخرجہ

سامرا۔ دُنیا میں ہر شہر کے نام کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے جس کو اصطلاحاً "وجہ تسمیہ" کہا جاتا ہے اس موضوع پر بالخصوصیت کوئی معتدبہ ذخیرہ بھی نہیں ہے البتہ اہل لغت اکثر الفاظ کی وجہ تسمیہ لکھ دیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں معجم البلدان نے ایک حد تک کافی لکھا ہے۔ جب یہ بات مسلّم ہے کہ وجہ تسمیہ شہروں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے تو موضوع بحث "سامرا" کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ ضرور ہونی چاہیئے۔

موجودہ "سامرا" جو ملک عراق کے دارالسلطنت بغداد کے شمالی علاقہ میں تقریباً ۱۲۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر نہر دجلہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے جس کی جدید بنیاد ۲۲۱ھ مطابق ۸۳۶ء معتصم عباسی کے ہاتھوں پڑی اور معتصم کے بیٹے واثق باللہ نے جس میں کافی توسیع دیا اور جس کو متوکل عباسی نے اپنے دور حکومت میں بام ترقی پر پہونچا دیا۔ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ اس کی بھی اصولاً وجہ تسمیہ ہونی چاہیئے۔ اور ہے مگر فرق یہ ہے کہ علماء نے اس کی وجہ تسمیہ میں اپنی حسب عادت اختلاف کیا ہے۔

چنانچہ یاقوت حموی نے ابراہیم جلنیدی سے روایت کی ہے کہ اس شہر کو جناب سام بن نوح نے آباد کیا اور وہی اس کے بانی ہیں اس لئے اس کو سامرا کہتے ہیں عصری تحقیقات[۱] سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ واقعی یہ شہر ماقبل التاریخ

---

[۱] ری سامرا، ج ۱، ص ۵۲، ۵۳

سے آباد تھا اور یہ تو بہت مشہور بات ہے کہ معتصم کے سامرا سے پہلے یہاں متعدد دیہات اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں تھیں، انھیں معبد گاہوں میں سے ایک مشہور معبد کو معتصم نے خرید کر بیت المال بنوایا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دولتِ ساسانیہ کے زمانہ میں یہاں ایک بہت عظیم الشان قلعہ بنام "سومیرہ" آباد کیا گیا تھا اسی قلعہ کی مناسبت کی وجہ سے اس شہر کو سامرا کہتے ہیں۔

یاقوت حموی نے اپنی معجم میں ایک اور روایت لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب یہ شہر باقاعدہ آباد ہو گیا تو اس کا نام "سر من رای" رکھا گیا کچھ مدت کے بعد اپنی شہرت کی وجہ سے "سر من رای" کے نام سے مشہور ہوا اور جب یہ شہر بے توجہی کا شکار ہوا تو لازمی طور پر اس کو ویران ہونا چاہیئے تھا اور وہ ویران ہوا۔ ویرانی کے بعد لوگ اس کو "ساء من رای" کہنے لگے اور کثرت استعمال کی وجہ سے یہ لفظ "سامرا" باقی رہ گیا۔

یہ تین قول پیش نظر ہیں۔ ہر با فہم کو فیصلہ کرنے میں زحمت نہیں ہے معمولی توجہ کے بعد ایک فیصلہ کر سکتا ہے دوسرے اور تیسرے قول میں برہان کو چھوڑ کر ظن و تخمین سے زیادہ کام لیا گیا ہے البتہ پہلے قول کے لئے مؤیدات ملتے ہیں اس لئے اسی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ دوسروں کی محنت کی قدر کرتے تھے آج کی طرح نہیں ہے کہ ہندوستان میں جتنے اسلامی نام کے شہر تھے سب کو بدل دیا گیا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو تحقیق کر لیجئے خود ہی معلوم ہو جائے گا خصوصاً وہ لوگ جو ریل گاڑی سے زیادہ سفر کرنے کے عادی ہیں ان کو معلوم ہے کہ اسی فیصدی اسٹیشنوں کے نام بدلے جا چکے ہیں۔ یہ آج ترقی کا دور ہے لیکن اس زمانے میں اس قسم کی خیانتیں نہیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً مسلمان اس

له دلیل سامرا، یونس المرائی۔

اہتمام سے بہ نسبت ہندوؤں کے کہیں زیادہ پاک دامن ہیں۔ چنانچہ آپ اسی بغداد کو لیجئے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ یہ نوشیرواں کا "باغ داد" تھا جو کثرت استعمال سے بغداد ہوگیا ہے۔ عباسی حکومت کا کوئی معمولی شہر نہیں لیکن اسی وقت کے مسلمان نے یہ نہیں سوچا کہ اس سے نوشیرواں کی یاد تازہ ہوتی رہے گی اس لئے نام بدل دو۔ یہ کام صرف آج کا ہندو ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح یہ شہر بھی چونکہ جناب سام بن نوح کا بنوایا ہوا تھا اس لئے لفظ سام کو باقی رکھا گیا۔ اگرچہ یہ تا نہ شاہرادہ پہلے والا سامرا نہیں تھا، اس کی زمین، اس کا آسمان تک گویا بدل چکا تھا مگر پھر بھی اصل نام کو محفوظ رکھا گیا۔ مسعودی نے جو بات لکھی ہے وہ قرین قیاس ہے وہ لکھتا ہے اس کا اصلی نام "سام رہ" تھا۔ یہاں بھی کثرت استعمال کی وجہ سے "ہ" گر گیا سامرا باقی رہا۔ یہ اور بات ہے کہ بغداد میں وسط سے گرا اور سامرا میں آخر سے اس قسم کے معمولی تغیر ملحوظ ہوتے ہی نہیں ہیں کہ جن کے بارے میں فکر کی جائے۔

دوسرا مویداس خیال کا یہ بھی ہے کہ مورخین بنائے سامرا کے سلسلے میں لکھتے ہیں اور یہ کافی مشہور بھی ہے کہ معتصم کے لشکر میں ترک زیادہ تھے ترکوں نے جب بادشاہ کے یہاں اثرات و رسوخ پوری طرح پیدا کر لئے تو عربوں سے ان کی ٹھن گئی ان میں عربوں کے خلاف شدت سے جذبہ نفرت پیدا ہو گیا۔ اب عرب بھی کسی ترک کو تنہا پاتے تو قتل کر ڈالتے تھے۔ طرفین کی اس باہمی کشیدگی سے معتصم کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں عرب انقلاب نہ برپا کر دیں لہذا اس نے عاصمۃ ہی بدل دینے کی ترکیب سوچی اور کامیاب بھی ہوا جب اس مقصد کے لئے معتصم زمینوں کو دیکھتا ہوا ارض سامرا پہ پہنچا اور دو ایک واقعات سے خود اس کو یقین ہو گیا کہ یہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ ہے تو گرجا گھر کے خادم سے معلوم کیا کہ اس سرزمین کا نام کیا ہے تو اس نے سامرا بتایا۔ معتصم نے پوچھا کہ سامرا کے کیا معنی ہیں تو اس نے بتایا کہ پرانی کتابوں میں ملتا ہے

اس شہر کو جناب سام بن نوح نے آباد کیا تھا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ معتصم کے زمانے سے کہیں پہلے استعمال ہوتا تھا تو پھر "سرور من رائی" اور "سر من رای اور" سا من رای" جیسی بے خود تاویلیوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ محض رجماً للغیب ہے۔ اور حموی نے اپنی کتاب میں بعض اس قسم کی کوتاہیوں کو روا رکھا ہے۔

چونکہ سامرا قدیمی شہر ہے اس لئے آثار قدیمہ اس میں بہت ملتے ہیں جنکی مختصر فہرست اجمالاً یوں ہے۔ روضۃ العسکریین علیہما السلام۔ امام دور سجن الامام (غیبت خانہ) جامع کبیر ملویۃ۔ جامع ابی دلف، مئذنۃ ابی دلف (ملویۃ اخری)، دار الخلیفہ۔ تل العلیج۔ قصر العاشق۔ قبۃ الصلیبیۃ، قصر برکوارا، مسجد الامام المہدیؑ۔ جس میں چند چیزیں شیعوں کے مذہبی مقدس مقامات میں شمار ہیں (بحوالہ پیام عمل ۱۹۶۲ء)

معذرت

آپ یقیناً واقف ہیں کہ ابھی حال میں ایک ایسا آرڈیننس پاس ہوا ہے جسکی رو سے اہلبیت اطہارؑ، خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ، ازواج مطہراتؓ کی شان میں گستاخی کرنے والا کڑی سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ اور اشارۃً و کنایتاً بھی گستاخی ناقابل معافی جرم تصور ہوگا۔ چنانچہ پیش نظر کتاب "عظمت حسین" جو سید العلماء کے چھبیس مقالات پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ اپنی جگہ پر بے مثال ہے۔ ان مقالات کو بھی آئینی طور پر دیکھا گیا ہے بعض مقالات میں سے کچھ سطور نکالدی گئیں اور بعض لفظ تبدیل کئے گئے مگر یہ بات بہر حال پیش نظر رکھی گئی کہ تسلسل عبارت قائم رہے پھر بھی ہم جناب مصنف سید العلماء سرکار سید علی نقی مدظلہ العالی سے اپنی مذکورہ جسارت کے سلسلے میں معذرت خواہ ہیں ہمیں یقین ہے کہ علامہ موصوف ہماری "مجبوری" کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں معاف فرمائینگے۔ ہم مذکورہ بالا جسارت کے سلسلے میں سید العلماء کے عقیدتمندوں سے بھی معذرت خواہ ہیں۔

(وصی)

پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر

صدر مرکزی تنظیم عزا کراچی (رجسٹرڈ)

محمد وصی خاں خادم اہلبیتؑ

کی

مرتب کردہ

شاہکار کتابوں کا مطالعہ آپ کیلئے ضروری ہے

کیونکہ آپ پندرہویں صدی ہجری کا آغاز شہدائے کربلا کے نام سے کر رہے ہیں

---

(۱) کتاب "اولیائے کرام اور شعرائے عظام آستانۂ مولا علی پر"

یہ کتاب مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی منقبت کا ایسا بے مثال مجموعہ ہے جو اس سے پہلے آپ کی نظروں سے نہ گزرا ہوگا اس میں تمام قابل ذکر شعراء اور مشہور صاحب کرامات اولیاء اور صوفیاء حضرات کے کلام حضرت علیؑ کی شان میں موجود ہیں

(۲) وصی خاں کی مقبول عام کتاب علیؑ علی حصہ دوم کا مطالعہ آپ کے لئے بہت ضروری ہے اس کے مطالعہ سے آپکے دل میں محبت اہلبیتؑ کا سمندر ٹھاٹھیں مارے گا۔

(۳) "شیعہ حافظ قرآن" کتاب جواب ہے اس کا کہ شیعہ حافظ قرآن نہیں ہوتے

(۴) بیاض تسکین زینب حصہ اول و دوم تاریخ وار مجلسوں کے لئے سوز، سلام۔ رباعیات اور مرثیوں پر مشتمل شاندار بیاض جو آپکی پسند کے مطابق ہے۔

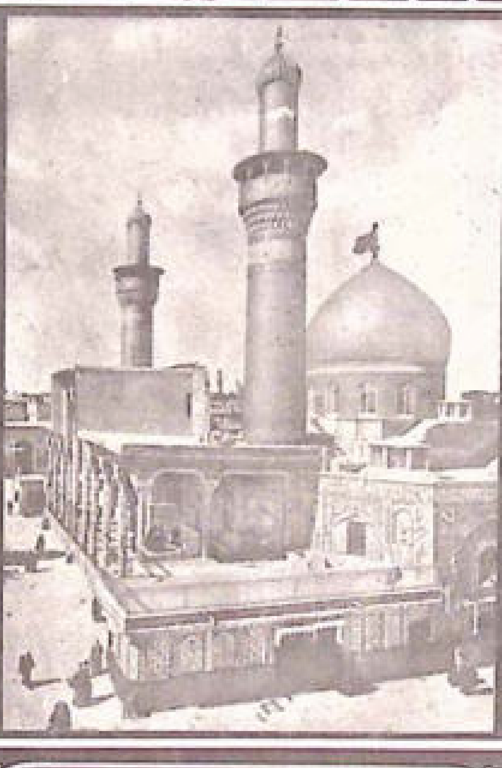
(۵) "علامہ اقبال آستانۂ پنجتنؑ پاک پر" علامہ اقبالؒ کے ان اشعار کا مجموعہ ہے جو انہوں نے پنجتنؑ پاک کی شان میں فرمائے اور در حقیقت یہی وہ اشعار ہیں جو ان کے اعتقادی جذبات کے آئینہ دار کہے جا سکتے ہیں اس کے علاوہ شیعہ مسلک کی بھی بیش خدمت ہے

حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

حسین علیہ السلام

حسین منی و انا من الحسین

سید الشہداء



مرتبہ: محمد وصی خان